قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جون 2017 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

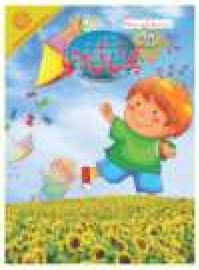

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:19،شمارہ:06،جون 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
نئی نسل ہم سے زیادہ حساس اور ذہین ہے: نور شاہ — محمد اقبال لون 7

عالمی اردو کانفرنس
مندوبین کے تاثرات 11

زبان و تعلیم
بچوں کی نفسیات اور کھیلوں کے ذریعے تعلیم — محمد قمر سلیم 15

خاکہ نگاری
فن خاکہ نگاری اور سعادت حسن کا خاکہ 'منٹو' — قیام نیر 17
عابد سہیل کی خاکہ نگاری — فیروز عالم 19
شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری — تصنیف عزیز 24

نقد و نگاہ
عصمت کا تخلیقی سفر: ایک تحقیقی جائزہ — جمیل اختر 27
آگ کا دریا — ناصرہ سلطانہ 30

مولوی عبدالسلام بیگ شفیق جھالاواڑی کی ادبی خدمات — سیدہ انجم 33

طنز و مزاح
کشمیر کا کھیمیندر:
سنسکرت طنز و مزاح کا بادشاہ — غلام نبی خیال 36
اردو میں طنز و مزاح کے ابتدائی نمونے — نسیم احمد نسیم 39

سلسلۂ صحافت
آندھرا و تلنگانہ میں اردو صحافت — رؤف خیر 43

نیا آسماں نئے ستارے
جامعہ کے جواہر — اسلم وکیل جامعی 50

باب کونسل
انتخابات نظم و نثر 52
'فکر و تحقیق' کا توضیحی اشاریہ — ارشاد قمر 55

کمپیوٹر
ہارڈ ویئر اور سوفٹ ویئر 57

فلم
ہماری فلمیں اور عالمی ماحولیات — انیس امروہوی 60

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 63

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 81

ہماری بات

جو زبانیں شناخت کی سیاست میں الجھادی جاتی ہیں ان زبانوں کے بنیادی مسائل سے توجہ خود بخود ہٹ جاتی ہے۔ اردو زبان کا المیہ بھی یہی ہے کہ اسے ایک تہذیبی تشخص سے جوڑ کر دیکھنے کی روش عام ہوگئی ہے۔ جبکہ اس زبان کی روح اس تشخص کی نفی کرتی ہے۔ اس کے اندر جذب وانجذاب اور مفاہمت کی جو قوت ہے وہ اس تصور کو ہی مسترد کردیتی ہے جو تنازعے کی بنیاد ہے۔ اردو کی ساری توانائی تشخص کے تنازعے میں ضائع ہوتی جارہی ہے۔ جبکہ اس توانائی کا استعمال اردو کے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں صرف کیا جاتا تو ہندوستان میں اردو کا منظرنامہ مختلف ہوتا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اردو کے تعلق سے جو غلط فہمیاں رائج ہیں علمی، منطقی اور معروضی طور پر ان کے ازالے کی کوشش کی جاتی۔ اردو زبان کی لفظیات اور قواعد کے حوالے سے یہ بات بتائی جاتی کہ اس کی لسانی ساخت ہندوستانی زبانوں سے ہم آہنگ ہے اور اس زبان میں ہندوستان کی دیگر زبانوں کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ جمہوری مزاج کی اس زبان نے ہر قوم کے تہذیبی علامات اور مظاہر کو اپنے ادب میں جگہ دی ہے۔ مکمل طور پر ہندوستان کی روح میں بسی ہوئی یہ زبان کسی قوم یا مذہب سے مشخص نہیں ہے بلکہ گنگا جمنی تہذیب کی علم بردار ہے۔ اس تصور کو نقش کرنا اس لیے مشکل نہیں ہے کہ اردو سے تعلق رکھنے والے تمام طبقات نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ اردو کے خمیر اور ضمیر میں اتحاد، اخوت، رواداری، عدم تعصب جیسے عناصر شامل ہیں۔ اردو کا بنیادی مسئلہ وہ نہیں ہے جس پر لوگ زیادہ توجہ صرف کررہے ہیں بلکہ اردو کے بنیادی مسائل وہی ہیں جو کسی اور زبان کے ہوسکتے ہیں۔ دوسری زبانوں نے تنازعات پر اپنی قوت صرف کرنے کے بجائے اپنی زبان کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس میں علوم وفنون کے سارے سرمایے کو منتقل کردیا۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ محدود علاقوں کی زبانیں پھل پھول رہی ہیں۔ ان علاقوں کے لوگ اپنی زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے ایثار اور قربانی کا جذبہ بھی رکھتے ہیں تو پھر اردو جیسی آفاقی زبان کے فروغ کی راہ میں ایسی کون سی رکاوٹ حائل ہے جب کہ اس کا نہ کوئی علاقہ ہے اور نہ کوئی اس کی ریاست ہے۔ ہر علاقے میں اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات بھی موجود ہیں۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے علاوہ دیگر شعبہ جات میں بھی اس زبان کے فروغ کے امکانات آسانی سے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اردو صرف ادب کی زبان نہیں ہے بلکہ سائنس/ٹیکنالوجی، صنعت وحرفت، شماریات اور تجارت کی زبان بھی بن سکتی ہے۔ اس زبان میں اتنی وسعت اور لچک ہے کہ یہ دیگر زبانوں کے ثقیل، بوجھل علمی اور تکنیکی اصطلاحات کو بھی اپنے اندر جذب کرسکتی ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے ان زاویوں پر غور کیا جاتا تو شاید اردو کے فروغ کے لیے بہتر راستے نکل سکتے تھے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ اردو کے بنیادی مسائل کو پس پشت ڈال کر ہندوستان کی اس اقلیتی لسانی آبادی کو بھی غیر ضروری مسئلوں میں الجھادیا گیا۔ اردو کے تعلق سے جب تک وہ الجھاوے دور نہیں کیے جائیں گے جو تاریخ اور تعصب نے پیدا کیے ہیں تب تک اردو کے بارے میں غلط فہمیاں عام رہیں گی۔

اردو کے فروغ کے لیے بہت سی تحریکیں بھی چلائی گئیں مگر شاید اس کے لیے اب تحریکوں کی نہیں ذہنوں میں تحرک پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ قومی اردو کونسل یہی تحرک پیدا کرنے کے لیے مختلف سطحوں پر غور وخوض کررہی ہے اور اس تعلق سے مختلف زبانوں کے ماہرین سے تبادلۂ خیال کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ قومی کونسل نے اردو کے انہی بنیادی مسائل کو لے کر قومی سطح کے سمینار بھی کیے اور مختلف حوالوں سے کثیر لسانی معاشرے میں اردو زبان کے مقام ومعنویت کے حوالے سے گفتگو بھی ہوئی۔ گذشتہ دنوں ہندوستان میں اردو کی آئینی اور قانونی حیثیت کے موضوع پر دوروزہ سمینار کا انعقاد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں اردو زبان کے تعلق سے بہت سے اہم نکات سامنے آئے۔ خاص طور پر اردو کے آئینی حقوق کے حوالے سے بہت ہی فکر انگیز باتیں سامنے آئیں۔ قومی اردو کونسل ایک 'اردو دستاویز' بھی تیار کرنے کی کوشش کررہی ہے جس میں اردو زبان کے حوالے سے تمام مباحث اور مسائل کا احاطہ ہوگا خاص طور پر قدیم اردو اخبارات ورسائل میں اردو کے حوالے سے مشاہیر کی جو تحریریں شائع ہوئی ہیں وہ بھی شامل کی جائیں گی تاکہ اردو کے تعلق سے ایک مثبت اور واضح تصویر لوگوں کے سامنے آسکے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

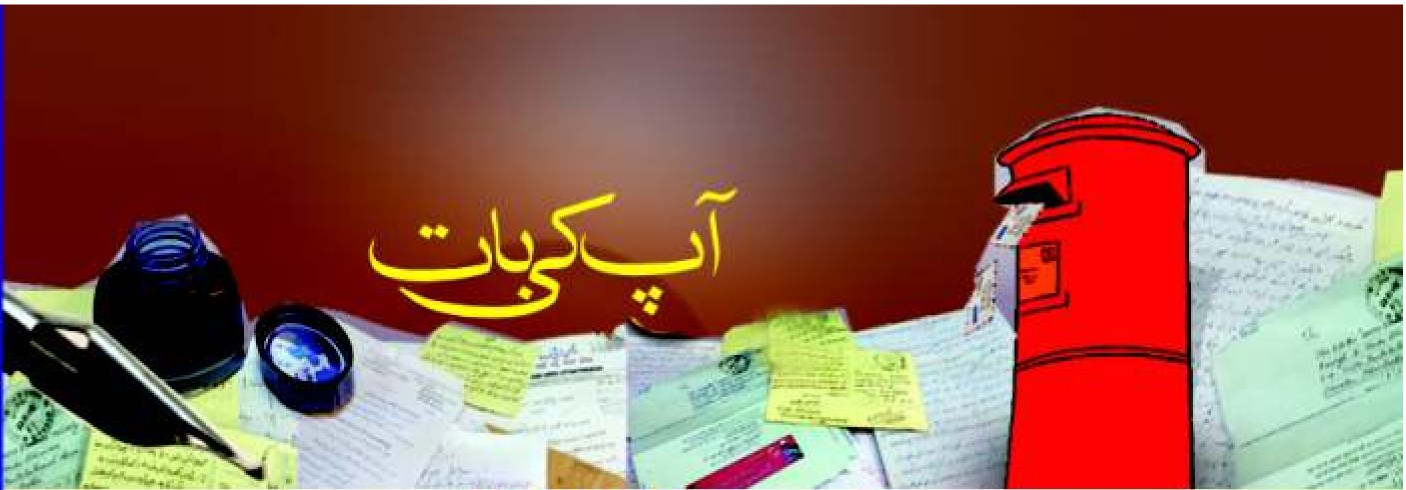

آپ کی بات

آپ واقعی اردو زبان و ادب کے محسن ہیں اور بلاشبہ رسالہ 'اردو دنیا' دورِ حاضر کے رسائل اردو کا سرتاج ہے۔ زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور اردو کی تعلیم کے لیے قومی اردو کونسل نے خود کو وقف کردیا ہے۔ نئے سال کی آمد ہم اسکالرز کے لیے نئی روشنی لے کر آئی ہے۔ جب آپ نے نئے کالم 'نیا آسماں نئے ستارے' کا تحفہ دیا۔ آپ نے نہ صرف نئے قلم کاروں کے درد کو محسوس کیا ہے بلکہ ان کی مشکلات کو دور کرنے کی سعی بھی کی ہے۔

ڈاکٹر سیدہ انجم: عیدگاہ روڈ، جھالاواڑ، راجستھان

مئی 2017 کا شمارہ ملا۔ قومی اردو کونسل برائے فروغ زبان جو اقدامات کررہی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ بیرونی ممالک میں بھی اردو پنپ رہی ہے پر اپنے ہی ملک میں اس کی حالت زبوں تر ہے۔ اردو کی پیدائش اور پرورش ہندوستان میں ہوئی۔ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے لفظوں سے سنوار کر ہندوستانی زبان کو ہی اردو کا نام دیا گیا۔ ہندی اور اردو دونوں سگی بہنیں ہیں۔ اردو زبان میں جو تہذیب و ثقافت اور ادب کا خزانہ موجود ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ ناگپور کے محمد قمر حیات 38 سال سے مفت میں اردو سکھانے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ایسی کوششیں پورے ملک میں ہونی چاہیے۔ تعلیم بالغان (Adult Education) کی طرز پر کوئی مہم چلانی ہوگی۔ اردو کا گراف تیزی سے گر رہا ہے۔ نوجوان طبقہ اس جانب سنجیدہ نہیں ہے۔ اردو زبان والے خود اپنی اولاد کو اردو پڑھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔

اردو کے مایہ ناز ادیب، شاعر، خاکہ نگار ڈاکٹر محمد تقی رضوی کے کمالات پر شہزاد انجم کا مضمون پسند آیا۔ محمد احسن صاحب کا مضمون 'ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی صورت حال' معلوماتی ہے۔

ایم راگھو راؤ: ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا، مدھیہ پردیش

'اردو دنیا' مئی کا شمارہ حسبِ معمول خوبصورت تصاویر سے مزین منظرِ عام پر جلوہ گر ہوا ہے۔ اس میں مشہور صحافی و ادیب جناب فضل حسنین کا زیرِ عنوان 'زبان زد اشعار میں تحریف' مضمون نگار کے عمیق و دقیق مطالعے کا مظہر ہے۔ یہ موضوع ہمیشہ سے متنازع ہی رہا ہے۔ اس مقالے میں اول شعر 'شام سے کچھ...' (کلیاتِ میر، ص 110) کا اول مصرع 'گلِ رعنا' موسوم مجموعے میں غلطی سے مصحفی کے نام سے درج شعر کے متن کی اس صورت میں ملتا ہے۔ ''شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے...'' لیکن جناب خلیق الزماں کی مشہور و معروف تحقیقی کتاب 'برمحل اشعار اور ان کے ماخذ' میں اس مصرعے میں غلطی سے 'سا' لفظ کی بجائے 'سے' لفظ چھپ گیا ہے۔ (ص 327، اول جلد، سنہ 2011)

اس طرح دوسرے محولہ شعر میں اول مصرعے 'سرہانے میر کے' میں 'سے' لفظ اس لیے زائد ہے، کیونکہ میر کے دیوان میں یہ لفظ موجود نہیں ہے۔ اسی طرح محولہ اسی صفحے کے تیسرے کالم میں پانچویں زبان زد شعر کو شاعر جہاں دار شاہ کا صحیح کہا گیا ہے۔ ویسے اول مصرعے کی صورت یہ بھی دستیاب ہوتی ہے: 'آخر گل اپنی ('صرف' لفظ کی بجائے) خاک در میکدہ ہوئی/ ('پہنچی' لفظ کی جگہ) پہونچی ('وہیں پہ' کی جگہ) وہاں ہی ....''۔ (''برمحل اشعار...، ص 296)،

آگے تیسرے کالم میں 'دل کے پھپھولے...' مطلع والا شعر غلطی سے محمد رفیع سودا کے نام سے ہی منسوب ہوتا رہا ہے، یہ بھی بتانا درکار تھا۔ پنڈت مہتاب رائے تاباں کا جو صحیح شعر مقالہ نگار نے دیا ہے، اس میں بھی اول مصرعے میں 'مرے' لفظ کا املا 'میرے' ملتا ہے۔

('مجموعہ شعرائے ہنود'، ص 39)

اگلے صفحے 24 پر قائم چاند پوری کے محولہ شعر کا جو متن پیش کیا گیا ہے، اس کے مصرعوں کی یہ صورت دستیاب ہوتی ہے۔ ''قسمت کو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند/ کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا...'' ('مجموعہ گلستان سخن')۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ باقی صدیقی جیسے بلند پایہ شاعر کی مشہور غزل 'داغ دل ہم کو...' مرزا داغ کے نام سے منسوب کی جاتی رہی ہے۔ باقی صدیقی کے فقط اس ایک شعر سے ہی لوگ ان کی شاعری کی بلندی و پختگی کا بہ حسن و خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں:

کبھی تو کوئی پڑھے گا لکھا ہوا میرا
کبھی تو کام یہ شوقِ فضول بھی دے گا

جناب فضل حسنین کے اس مضمون کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے اول بار زبان زد اشعار کی تحریف شدہ صورتوں کو اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے، جو کہ روایت کے برعکس ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک : گورو نانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

اردو دنیا مئی کا رسالہ نظر نواز ہوا۔ اردو زبان و ادب کا منظر نامہ کے تحت چوتھی عالمی اردو کانفرنس کی روداد پسند آئی۔ پروفیسر بیگ احساس کا انٹرویو اس لیے بھی اچھا لگا کہ زمانہ گزشتہ میں گھروں میں آنے والے اردو کے رسائل نے بچوں کو مطالعے پر ابھارنے میں کتنا اہم رول ادا کیا ہے اور پھر کچھ لکھنے اور قلم اٹھانے کے لیے ان رسالوں نے کتنا کچھ مہمیز کیا جس سے نئے لکھنے والوں کی ٹیم تیار ہوتی رہی۔ نصاب تعلیم میں انسانی اقدار کی تلاش

مضمون اس لیے پسند آیا کہ یقیناً کتابوں میں تحفظ انسانیت، اخلاقیات، سماجی مساوات اور آج کل کے ماحول میں انصاف پسندی جیسے مضامین کی شمولیت ضروری ہے۔

محترم شمس الاسلام کا صحت سے متعلق معلوماتی مضمون اچھا لگا کہ اس میں بلڈ پریشر کو قابو میں کرنے کے لیے گھریلو نسخے اور اس کے فوائد کا جدا جدا ذکر کردیا ہے جو آسان ہونے کے علاوہ مفید ہے۔ اسی کے ساتھ چہل قدمی اور جسمانی ورزش کے بارے میں بڑی اہم معلومات کا ذکر کیا گیا ہے۔

انصار احمد معروفی: مدرسہ چشمہ فیض اوری، مئو، یوپی

این سی پی یو ایل اردو دنیا اپریل 2017 کے شمارے میں قومی اردو کونسل کے ذریعے کتابوں سے متعلق گوشہ مختص کرکے آپ نے کارہائے نمایاں کی جھلک پیش کی ہے۔ بلاشبہ قومی اردو کونسل نے اپنی تاسیس سے لے کر اب تک بہت سے اہم اور مفید کام کیے ہیں۔ کتابوں کی اشاعت، روزگار سے متعلق کورسز، موبائل وین، ادبی سیمینار و مشاعروں کا انعقاد، ملک کے مختلف حصوں میں کمپیوٹر سینٹرز کا قیام، ماہانہ رسائل کی اشاعت ایسے ہی لائق ستائش کام ہیں۔ میں اور ضلع سیتاپور کی ممتاز ادبی تنظیم بزم اردو سیتاپور کے تمام اراکین اور اپنی جانب سے قومی اردو کونسل کے جملہ اراکین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

رضوان علی خان: جنرل سکریٹری بزم اردو، سیتاپور، یوپی

ماہنامہ 'اردو دنیا' اپریل 2017 کا تازہ شمارہ ایک خوبصورت تحفے کی شکل میں موصول ہوا۔ باب مطبوعات دراصل مطبوعات کا خزینہ ہے۔ اس باب کو آپ نے عنوان کے لحاظ سے سولہ ابواب میں منقسم کرکے ہر باب کی ابتدا میں عنوان کے لیے جو صفحہ مختص کیا ہے اس کی طباعت دیکھ کر خوبصورت سرورق کا گمان ہوتا ہے۔ سرورق پر ادارے کی پرشکوہ عمارت بھی ایک الگ ہی تاثر دیتی ہے۔ جو ادارے کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔

ایڈوکیٹ حبیب ریتھ پوری: ریتھ پور، ضلع امراوتی، مہاراشٹر

اپریل 2017 کا شمارہ بڑی خوبیوں کا حامل رہا۔ فاروق ارگلی نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے کہ "اردو کی خدمت کرنے والا شخص آج کے دور میں گویا عبادت کررہا ہے!" تاریخ ادبیات میں کئی دانشوروں نے ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی ہے۔ کافی مواد پڑھنے کو ملا۔ 'زبان ولسانیت' کے تعلق سے سید بدرالحسن نے زبان کی باریکیوں اور خوبیوں کو اجاگر کیا ہے 'فرہنگ ولغات' کافی کارآمد رہا۔ تحقیق وتنقید، دواوین/کلیات، مونوگراف، ابلاغیات صحافت، تاریخ ہند، سوانح وتذکرے، بچوں کا ادب، سائنس/ٹیکنالوجی، طب و معالجات، قانونیات، سماجیات/معاشیات/نفسیات، خطاطی اور تراجم جیسے اہم موضوعات پر تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

ضیاء جعفر: بنگلور، کرناٹک

اپریل 2017 کا شمارہ نظرنواز ہوا جسے دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ سرورق پر قومی کونسل کی شائع شدہ کتابوں کے دیدہ زیب ٹائیٹل پیج اردو دنیا کی خوبصورتی میں اضافہ کررہے ہیں۔ تقریباً دو سالوں سے قومی کونسل کی ویب سائٹ پر ماہ نامہ اردو دنیا کا مطالعہ تسلسل کے ساتھ کرتا رہا ہوں۔

حقانی القاسمی نے جناب فاروق ارگلی سے لیا گیا انٹرویو بہت ہی بہترین انداز میں تحریر کیا ہے، اور جناب والا نے بھی اپنی قیمتی آرا سے نوازا۔ محمد آدم نے قومی کونسل کی اشاعتی خدمات اور اغراض ومقاصد پر مختصر مگر جامع تحریر قلمبند فرمائی ہے۔ اس تبصراتی خصوصی شمارے میں قومی کونسل کی تقریباً 120 کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جو اپنی نوعیت کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ کونسل کم قیمت میں قیمتی کتابیں مشتہر کرتی ہے اب تک تقریباً 1300 کتابیں اشاعت سے ہمکنار ہوچکی ہے جو پوری دنیائے اردو ادب میں مثالی کارنامہ ہے۔ سہ ماہی فکر وتحقیق، ماہنامہ اردو دنیا، ماہنامہ بچوں کی دنیا کی تسلسل کے ساتھ اشاعت کے بعد اب قومی کونسل ماہنامہ خواتین دنیا کا آغاز کررہی ہے جس پر میں کونسل کے ڈائرکٹر اور اُن کی پوری ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

محمد تنویر رضا برکاتی: سکریٹری دارالسرور ایجوکیشن سوسائٹی برہان پور ایم پی

ماہ نامہ 'اردو دنیا' مارچ 2017 دیکھا۔ بہت خوبصورت شمارہ ہے جو لوگ اردو زبان کی ترویج وترقی سے ناامید ہوچکے ہیں ان کے لیے بھیونڈی میں کتاب میلے کا تذکرہ کرکے آپ نے حوصلہ مند بنانے کا کام کیا ہے۔ اردو کو گھر گھر پہنچانے کا پیغام دے کر ایک راستہ دکھا دیا۔ آج بھی کچھ مشکل نہیں ہے ملک ومال سو دفعہ ہار جائے کوئی بات نہیں۔ اگر ہمت ایک بار بھی ہار جائے تو سب کچھ ختم۔ اردو اگر ملک سے باہر ترقی کررہی ہے اور گھر میں سسٹ رہی ہے تو اپنا قصور ہے۔ 'ہماری بات' مختصر کرکے اور 'آپ کی بات' کو تفصیل دے کر لوگوں کے خیالات کو لوگوں تک پہنچانے کا شاندار انتظام کیا ہے۔ اس کے فوراً بعد افتخار امام صدیقی کا قاری اب بھی زندہ ہے ایک بے مثال تحریر ان لوگوں کو راہ بتا رہی ہے جو اردو کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔ آج اردو انتہائی دشواریوں کے باوجود زندہ ہے اور ترقی کے راہ پر گامزن ہے۔ جناب نند کشور وکرم کا بیان قابل توجہ اور حوصلہ افزا ہے۔ ضرورت کام کرنے کی ہے نہ کہ مایوسیوں کے شکار ہونے کی۔

غلام ربانی عدیل: بشارت پور رفیع گنج اورنگ آباد، بہار

'اردو دنیا' مارچ 2017 کا شمارہ حضرت سریر کابری مرحوم کے متعلق جناب حسن نواب حسن کا مضمون بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا لیکن اس میں کچھ باتیں محل نظر ہیں۔ مئی 1945 میں ریلوے سنیما ہال گیا منعقد مشاعرہ جناب نثار احمد آئی سی ایس جو اس وقت ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر تعینات تھے، ان کی تحریک کا ثمرہ تھا جن کی شریک حیات ریحانہ نثار بذات خود ایک اچھی شاعرہ تھیں اور جگر مرادآبادی مرحوم کی معتقد تھیں جن کی دعوت پر حضرت جگر مرحوم مذکورہ مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لیے تیار ہوگئے تھے لیکن بوجوہ وہ مشاعرہ میں شرکت نہ کرسکے جس کے نتیجے میں مشاعرہ علامہ شفق عماد پوری کی صدارت میں اختتام پذیر ہوا۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا اور مصرع طرح "شمع سے پروانہ لپٹا اور جل کر رہ گیا" تھا۔ اس مشاعرے میں داخلہ ٹکٹ کے ذریعے تھا۔ میرے منجھلے بھائی سعد الحسینی (حکیم حافظ سید سعد اللہ) اس مشاعرے میں مدعو تھے۔ لہٰذا انھوں نے میرے بھائی عبدالمتین اور میرے لیے دو پاس فراہم کردیا تھا۔ اس میں ان کی طرحی غزل کا مقطع تھا:

سعد پابندِ ادب تھا بزم سے اٹھا نہیں
درد جو دل میں اٹھا پہلو بدل کر رہ گیا

گیا کالج کے جس مشاعرے کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ کوئی ہنگامی مشاعرہ نہ تھا۔ ہر سال گیا کالج میں اردو مجلس کے تحت مشاعرہ ہوتا تھا جس میں گیا کے عوام کی حمایت بھی ہوتی تھی۔ شہر میں عام چندہ ہوتا تھا اور عوام بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ بڑا کامیاب مشاعرہ ہوتا تھا۔ جس مشاعرے کا ذکر کیا گیا ہے اس کا مصرعہ طرح اصغر گونڈوی مرحوم کا مصرعہ "ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی" یہ بات درست ہے کہ آنجہانی جگن ناتھ آزاد نے طرحی غزل نہ پڑھی تھی بلکہ اپنی مشہور نظم 'بھارت کے مسلمان تو کیوں ہے پریشان' سنائی تھی لیکن موصوف کے نظم پڑھنے کے فوراً بعد گیا کالج کے سامنے روڈ پر ایک ٹرک رکشہ کو دھکا دے کر سڑک کے کنارے مکان میں داخل ہوگیا تھا۔ لہٰذا اس حادثے سے ہنگامہ برپا ہوگیا اور مشاعرہ بغیر اعلان کے اختتام پذیر ہوگیا۔ لہٰذا حضرت سریر کا آنجہانی جگن آزاد کو مخاطب کرنا ناقابل قبول ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ قطعہ بعد میں مقامی اخبار یا رسالے میں شائع ہوا ہو۔

جمیل ظہیر: نیو کالونی، نیو کریم گنج، گیا، بہار

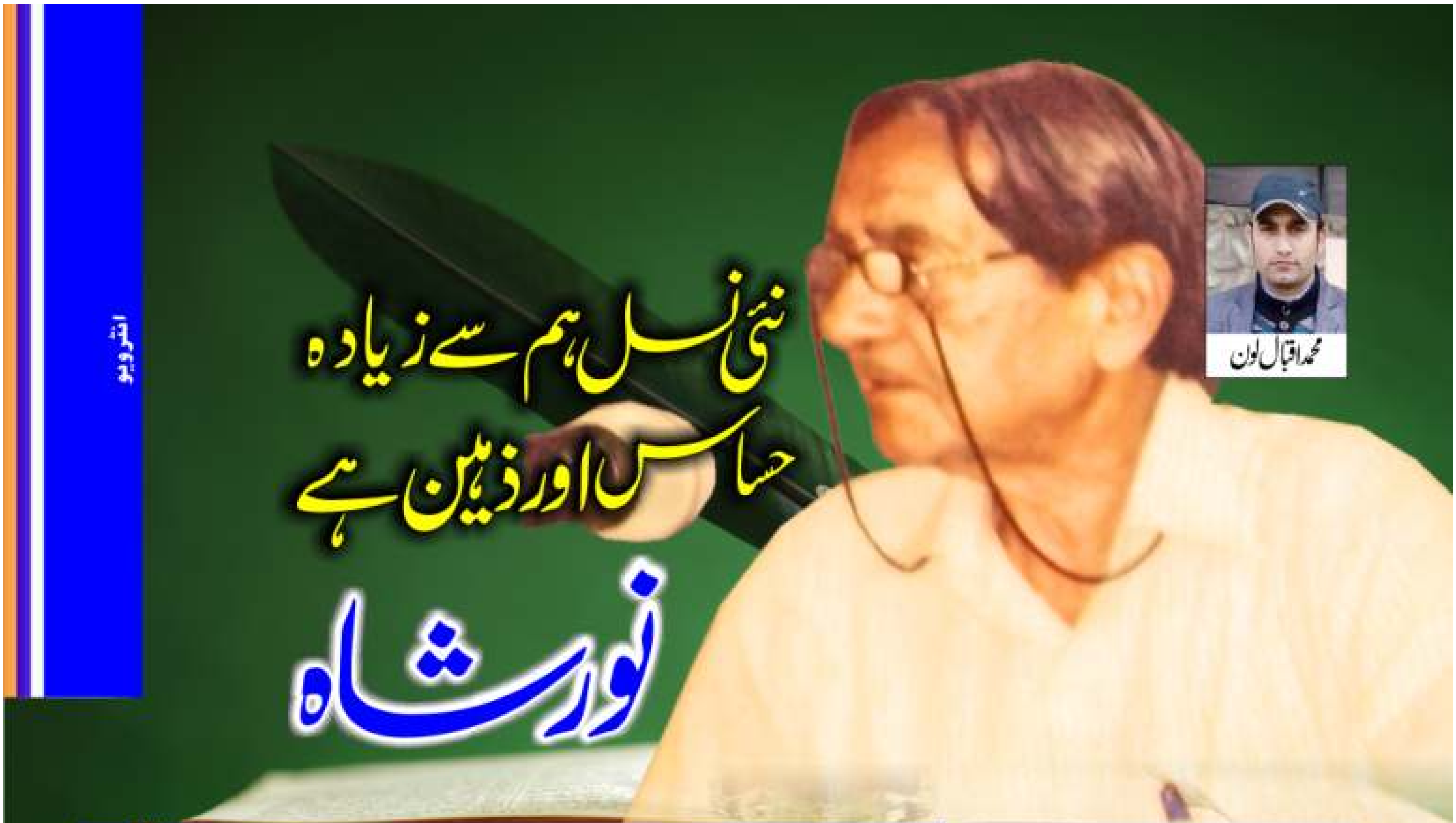

محمد اقبال لون

نئی نسل ہم سے زیادہ حساس اور ذہین ہے

نور شاہ

نور شاہ کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے ان کہنہ مشق افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ریاست میں اُردو افسانہ کے حوالے سے بنیاد گزاروں کا کام انجام دیا ہے اور یہاں افسانوی ادب کے لیے مناسب و موزوں ماحول پیدا کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اس قبیل کے افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، موہن یاور، تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نور شاہ ناول نگار، ڈراما نویس، کالم نویس اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ ان کے افسانوں میں وادی کشمیر کے لوگوں کا حسن و جمال، کشمیری تہذیب و تمدن، فن اور ثقافت اور یہاں کے حسین مناظر کا جمال و کمال نمایاں طور پر جھلک رہا ہے۔ ذیل میں ان سے لیا گیا تفصیلی انٹرویو پیش خدمت ہے:

محمد اقبال لون : نور شاہ صاحب...... بات چیت کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے ذرا بتا دیجیے کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

نور شاہ : میں 9 جولائی 1936 کو شہر سرینگر کی سب سے خوبصورت بستی ڈلگیٹ درگہ جن میں ایک متوسط مگر پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہوا۔ ڈل جھیل کے کنارے آباد یہ بستی نہ صرف اپنی تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی اہمیت کی حامل ہے بلکہ اپنی خوبصورتی، سندرتا اور دلکش مناظر کے لیے بھی سیاحتی نقشے پر ایک منفرد مقام کا درجہ رکھتی ہے، یہاں کی بے پناہ خوبصورتی اور آب و تاب حساس لوگوں کو شاعر، فنکار اور موسیقار بنا دیتی ہے۔ شکاروں سے خوبصورت ہاؤس بوٹوں تک، سرسبز وشاداب اور رنگ رنگ کے پھولوں کے باغات سے برف پوش پُرشکوہ پہاڑوں تک...... یہاں حیرت اور تجسس کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہر موسم میں قائم و دائم رہتا ہے۔ اس بستی نے اَن گنت موسیقاروں، شاعروں، قلم کاروں، ادیبوں، صحافیوں، ڈاکٹروں، ماہرین تعلیم، انجینئروں اور صنعت کاروں کو جنم دیا ہے۔ یہ شخصیات اپنی صلاحیتوں کے پس منظر میں ہماری تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔

م ا ل: کیا آپ کو بچپن سے ہی مطالعے کا شوق تھا؟

نور شاہ : جی ہاں بہت شوق تھا، جب میں اسلامیہ مڈل سکول درگہ جن کا ایک طالب علم ہی تھا پڑھنے کی جانب راغب تھا۔

م ا ل: آپ کو لکھنے کا شوق کیسے ہوا اور اس کے پیچھے کیا اسباب تھے۔ تفصیل سے بتائیں؟

نور شاہ : ہمارا گھر شاید آس پاس کے گھرانوں میں واحد گھر تھا جہاں ہر صبح اردو اخبار آتا تھا، میرے لیے میری والدہ صاحبہ کا یہ حکم تھا کہ میں ہر روز اسکول جانے سے پہلے اخبار پڑھوں، اُس کی سرخیاں کاپی پر اُتاروں اور اسکول جا کر سب کو سنانے کی کوشش کروں۔ اس کے علاوہ لاہور سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ 'پھول' باقاعدگی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ پھر آگے چل کر ابن صفی کو پڑھنا شروع کیا، ہم دو چار دوست پیسہ اکٹھا کر کے ابن صفی کے ناول خریدتے اور باری باری پڑھتے تھے۔ وقت گزرنے کے باوجود بھی میرے لکھنے پڑھنے کے شوق و ذوق میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا، ایک عادت سی بن گئی، لکھنا پڑھنا میرے شب و روز کی ایک ضرورت بن گئی، البتہ ترجیحات بدلتی رہیں۔ ترجیحات کے ساتھ کتابیں بدلتی رہیں، پڑھنے لکھنے کے انداز بدلتے رہے۔

م ا ل: آپ کی پہلی تخلیق کیا تھی؟ وہ کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟

نور شاہ : میری پہلی تخلیق کا عنوان تھا 'گلاب کا پھول' اور یہ ماہنامہ بیسویں صدی (دہلی) میں (دسمبر 1959) میں شائع ہوئی جو افسانہ تھا۔ آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میرا یہ افسانہ ترتیب میں تیسرے نمبر پر تھا۔ میرے نام سے پہلے کوثر چاند پوری اور پروفیسر شکیل الرحمن کے افسانے ترتیب میں پہلے اور دوسرے نمبر پر تھے۔ اس شمارے میں عادل رشید، رئیس نجمی امروہی، جگدیش بمل

اور رضاء الجبار کے افسانے بھی شامل تھے۔ رضا صاحب مرحوم کا بھی یہ پہلا افسانہ تھا۔

م ا ل: آپ نے اپنا ادبی سفر شاہدہ شیرین کے نام سے شروع کیا تھا اور اس تعلق سے کئی رنگین قصے مشہور ہوئے تھے۔ آپ نے یہ حربہ کیوں استعمال کیا؟ اس کی اصل وجوہات کیا تھیں؟

نو ر شاہ : ہاں میں نے اپنی، ادبی زندگی کا آغاز ایک زنانہ نام (شاہدہ شیرین) سے کیا تھا۔ یہ ایک طویل کہانی ہے لیکن میں مختصراً ذکر کروں گا۔ تھوڑے سے مطالعے اور اچھے خاصے مشاہدے کی بنا پر جب میں نے محسوس کیا کہ میں کہانیاں خود بھی لکھ سکتا ہوں تو ایک کہانی اردو دنیا کے ایک نامور مدیر کے نام ارسال کی، بہت دنوں تک جواب نہیں آیا اور پھر جو جواب آیا وہ وہی جواب تھا جو نئے لکھنے والوں کو عام طور سے ملتا ہے یعنی آپ کی کہانی ہمارے رسالے کے معیار پر پوری نہیں اُترتی اور ہم اسے شائع کرنے سے معذور ہیں۔ اپنی کہانی کا یہ انجام دیکھ کر دل ٹوٹ گیا لیکن افسانوی ذہن ایک اور چال چلا۔ میں نے کہانی کا عنوان اور اپنا نام بدلنے کی ٹھان لی۔ کہانی کے شروع کے جملے بدل دیے۔ بہر حال نئے عنوان اور نئے نام کے ساتھ کہانی مدیر محترم کو بھجوائی اب کے جو خط ملا وہ دلچسپ تھا میری یہ کہانی نسوانی نام سے شائع ہوئی اور اس طرح شاہدہ شیرین کا جنم ہوا۔ بہت سارے خطوط ملے (مجھے یاد ہے کہ اس کہانی کی تعریف میں مجھے جو پہلا خط ملا وہ آنجہانی ٹھاکر پونچھی کا تھا) اُس کے بعد چند ایک کہانیاں اسی نام سے شائع ہوئیں، بہت سارے خطوط ملنے لگے پیار و محبت سے بھرپور خطوط، عشق و محبت کی داستانوں کی صورت میں 'تحائف بھی ملنے لگے خاص طور سے کتابوں کی صورت میں، ان سارے خطوط کو میں نے کتابی صورت میں، پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن میرے دوست علی محمد لون (مرحوم) نے ایسا کرنے سے منع کیا کہ ایسے کرنے سے ادبی دنیا کے چند 'بڑوں' کی رسوائی ہوگی۔ پھر ایسا ہوا، ویدراہی اُن دنوں ماہنامہ یوجنا (ہندی) کے مدیر تھے میری ایک کہانی کا ترجمہ یوجنا میں شائع کیا اور میری تصویر کے نیچے لکھ دیا۔ شاہدہ شیرین کا اصلی روپ نور شاہ اور اس طرح ایک بار پھر شاہدہ شیرین نور شاہ بن گیا۔

م ا ل: ملکی افسانہ نگاروں اور تنقید نگاروں میں آپ کن کن اصحاب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں؟

نو ر شاہ : دیکھیے افسانہ میری پسندیدہ صنف ہے۔ اس لیے ملکی افسانہ نگاروں میں میں منٹو، بیدی، انتظار حسین، کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر سے کافی متاثر ہوں اور تنقید میں حامدی کاشمیری، شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی، گوپی چند نارنگ اور خاکہ نگاروں میں ابراہیم جلیس، فکر تونسوی سے حد درجہ متاثر ہوں۔ اس کے علاوہ ابن صفی کے ناولوں کی طرف شروع سے ہی زیادہ مائل رہا۔

م ا ل: آپ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت سے کس حد تک متاثر تھے؟ یا ان تحریکات کو آپ نے کس قدر اپنایا؟

نو ر شاہ : میں نے جب اردو ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو ترقی پسند ادیبوں اور ادب کا اثر بہت حد تک باقی تھا ادھر اُن دنوں اردو ادب کے دروازے پر جدیدیت کی جادوگرنی بھی دستک دے رہی تھی، ترقی پسند ادب سے میں نے کوئی شے شعوری یا غیر شعوری طور پر اگر اپنائی تو وہ ہے ناانصافی اور استحصال کے خلاف بات کرنے کا حوصلہ، جدید ادب کے تکنیکی اور ہیئتی تجربوں سے بھی کچھ نہ کچھ اثر میں نے قبول کیا ہے۔ مجھے شور سے پہلے بھی وحشت ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دھیمی آواز میں لہجے کو زیادہ یقین کے ساتھ برتا جاتا ہے یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی سرگوشیوں میں بھی بات کرنا اچھا لگتا ہے، ویسے بلند آواز میں بات کرنا نہ تو جرم ہے اور نہ ہی غیر قدرتی لیکن ایسا تب ہی ہوگا جب آپ کا مخاطب آپ سے بہت دور ہو چونکہ میری کہانیوں کے کردار میرے بہت قریب رہتے ہیں اور میں ان کرداروں سے گھل مل جاتا ہوں۔ اسی لیے دھیمی آواز میں بات کرنے کا قائل ہوں۔

م ا ل: ترقی پسند افسانہ، جدید افسانہ یا مابعد جدیدیت افسانہ۔ آپ اس تقسیم کے حق میں ہیں؟

نو ر شاہ : میرا ماننا ہے کہ افسانہ ہر دور میں جدید ہوتا ہے۔

م ا ل: ہمارے یہاں علامتی افسانے کن مرحلوں سے گزرے اور گزر رہے ہیں، اردو میں اس کی ترقی کے کیا امکانات ہیں۔

نو ر شاہ : چونکہ علامت ایک Device ہے اپنے تجربات، مشاہدات اور خیالات کو پیش کرنے کا۔ اردو میں اس کی کافی اچھی مثالیں ملتی ہیں، جن میں سریندر پرکاش، انتظار حسین، بلراج مین را، جوگندر پال، انور سجاد وغیرہ شامل ہیں۔ ریاست میں وحشی سعید کے یہاں علامتی افسانوں کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ اُردو میں اس کی ترقی کے مثبت امکانات موجود ہیں۔

م ا ل: آپ کے بہت سارے افسانوں میں اسلوب کی یک رنگی دیکھنے کو ملتی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

نو ر شاہ : ہاں میں مانتا ہوں اور اس کا اعتراف بھی کر چکا ہوں کہ شروع شروع میں میری تحریر کردہ بہت ساری کہانیوں کے کردار رومانی ہیں۔ شاید اس لیے کہ زندگی کے اکثر دھارے رومان سے پھوٹتے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میرا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا

کوائف

تصانیف :

افسانوی مجموعے (1) بے گھاٹ کی ناؤ 1960، (2) ویرانے کے پھول (3) ایک رات کی ملکہ 1964، (4) من کا آنگن اُداس اُداس 1965، (5) گیلے پتھروں کی مہک 1982، (6) بے ثمر سچ 2005، (7) آسمان پھول اور لہو 2009

ناول / ناولٹ :(1) نیلی جھیل کالے سائے 1961، (2) پائل کے زخم 1963، (3) لمحے اور زنجیریں 1965، (4) آؤ سو جائیں 1971، ناولٹ نمبر شاعر)، (5) آدمی رات کا سورج 2008

دیگر تصانیف :

(1) انتخاب اردو ادب ریاست جموں و کشمیر (1947 تا 1971) ریاستی کلچرل اکادمی اشاعت 74-1973، (2) بند کمرے کی کھڑکی (ڈائری کے اوراق پر مشتمل یادیں) 2007، (3) نور شاہ کے تین ناولٹ (مرتب روف راحت) 2009، (4) کہاں گئے یہ لوگ (ادبی خاکے) 2009، (5) ریاست جموں و کشمیر کے اُردو افسانہ نگار (فن، شخصیت اور مکالمہ) 2011، (6) کشمیر نامہ (مرحوم عمر مجید کے اخباری تخلیقات کا انتخاب۔ مرتب نور شاہ۔ جاوید ماٹجی 2012، (7) کشمیر کہانی (کشمیر کے پُر آشوب دور کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں اور ڈراموں کا انتخاب 2014، (8) کیسا ہے یہ جنون (افسانے، افسانچے، ڈرامے، فیچر، سیلاب کہانیاں اور ترجمے) 2015

ریڈیو ڈرامے :

ستر سے زائد۔ ان میں سے اکثر ڈرامے ریڈیو کشمیری اور ریڈیو جموں سے نشر ہوئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ بچوں کے لیے لکھے گئے ڈرامے ان سے الگ ہیں جو کشمیر ہوئے اور اکثر مختلف جرائد میں شائع میں

کچھ حصہ ڈل جھیل کے کنارے بیتا ہے۔ دور حد نظر تک برفیلی چوٹیاں، نیلا سبز پانی، رنگ رنگ کے پھول اور دوسرے حسین مناظر میرے ذہن میں بسیرا کیے ہوئے تھے (اور شاید آج بھی)۔ چونکہ میری کچھ کہانیوں میں ایسا ہی ماحول ملتا ہے اسی لیے شاید آپ کو یہ یک رنگی اسلوب نظر آتا ہے۔ آپ کو یہ بھی بتادوں کہ رومان کے پس منظر میں لکھے گئے میرے یہ افسانے آج بھی بہت سارے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں آج بھی ریاست میں جب کبھی افسانوں کے تعلق سے ادبی محفلیں آراستہ ہوتی ہیں تو بیرون ریاست سے آئے ہوئے معروف قلم کار اُن کہانیوں کا ضرور ذکر کرتے ہیں اور اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں میرے پڑھنے والے کہتے تھے کہ انھوں نے کشمیر کو نور شاہ کی کہانیوں میں دیکھا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترجیحات، موضوعات بدل گئے ماحول بدل دیا کہانیوں کا رنگ روپ بدل گیا۔

م ا ل: فن اور مواد میں آپ کس کو ترجیح دیتے ہیں؟

نور شاہ: میں دونوں کو لازم ملزوم سمجھتا ہوں۔

م ا ل: کیا افسانے کے لیے قاری اہم ہے؟

نور شاہ: قاری نہ ہو تو افسانہ نگار کس کے لیے لکھے گا افسانہ، ہر کہانی کار فطری طور پر اپنی شناخت چاہتا ہے اور اگر پڑھنے والا ہی نہ ہو تو افسانہ کس کام کا۔ ایک اور بات بتادوں، آج لوگوں کے پاس پڑھنے کا وقت مشکل سے نکلتا ہے۔ اس لیے طویل افسانے پڑھنے میں قاری کی دلچسپی ختم ہوتی جاری ہے۔

م ا ل: کیا آپ نے جنسی موضوعات پر بھی افسانے لکھے ہیں؟

نور شاہ: جی ہاں، کسی زمانے میں یہ میرا پسندیدہ موضوع تھا، میرا خیال ہے کہ جنسی موضوعات پر لکھنا کوئی جرم نہیں ہے۔

م ا ل: کیا آپ نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھی ہیں؟

نور شاہ: جی ہاں، افسانے اور ڈرامے بھی۔ بچوں کے لیے میرے تحریر کردہ چند ڈرامے ریڈیو کشمیر سے بچوں کے پروگرام میں نشر ہوئے ہیں۔ کچھ کہانیاں اور ڈرامے اردو دنیا، امنگ اور سبق اردو میں شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔

م ا ل: آپ ڈرامے بھی لکھتے ہیں؟ ٹیلی ویژن کے لیے سیریل بھی لکھتے ہیں؟

نور شاہ: جی ہاں، میں نے اب تک ریڈیو کے لیے

> ”قاری نہ ہو تو افسانہ نگار کس کے لیے لکھے گا افسانہ، ہر کہانی کار فطری طور پر اپنی شناخت چاہتا ہے اور اگر پڑھنے والا ہی نہ ہو تو افسانہ کس کام کا۔ ایک اور بات بتادوں، آج لوگوں کے پاس پڑھنے کا وقت مشکل سے نکلتا ہے۔ اس لیے طویل افسانے پڑھنے میں قاری کی دلچسپی ختم ہوتی جاری ہے۔“

ستر کے قریب ڈرامے لکھے ہیں جو نشر بھی ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ میں ٹیلی ویژن کے لیے سیریل بھی لکھتا ہوں۔ 2011 میں دوردرشن سے میرے تحریر کردہ دو سیریل ’درد کا رشتہ‘ اور ’گل اور بلبل‘ ٹیلی کاسٹ ہوئے۔ کشمیر میں اردو کے عنوان سے میری تحریر کردہ ڈاکومنٹری بھی حیدرآباد سے ٹیلی کاسٹ ہوئی۔

م ا ل: آپ کی متعدد کہانیاں مختلف جرائد میں چھپ چکی ہیں اور چھپ بھی رہی ہیں، ان سب کہانیوں کے پلاٹ اتنی پھرتی اور آسانی سے تھوڑے وقفے میں آپ کیسے تشکیل دیتے ہیں؟

نور شاہ: اللہ کا کرم ہے۔ ذہن سوچتا رہتا ہے قدم قدم پر نئے کردار ملتے رہتے ہیں، نئے حالات و واقعات سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ جب سوچ، کردار اور حالات و واقعات ایک روپ اپنا لیتے ہیں تو قلم کو حرکت میں آنے کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے۔ چونکہ میرا ادبی یا افسانوی سفر ایک لمبے عرصے سے جاری ہے اس لیے ان کہانیوں کی تعداد دیکھ کر آپ کو لگتا ہے کہ میں بڑی آسانی اور پھرتی سے کہانیوں کی تخلیق کرتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مہینے میں دو سے زیادہ کہانیاں نہیں لکھ سکتا اور کبھی کبھار تین تین ماہ تک بار بار سوچنے کے باوجود کہانی نہیں لکھی جاتی۔ دراصل کہانی کار اپنی مرضی سے کہانی نہیں لکھتا بلکہ کہانی ہی کہانی کار کو کہانی لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

م ا ل: کیا آپ ایک ہی سٹنگ میں افسانہ لکھ لیتے ہیں؟

نور شاہ: اکثر نہیں۔ میں افسانے تکنیک بدل بدل کر لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

م ا ل: لکھنے کے لیے آپ کو کس قسم کا ماحول پسند ہے؟

نور شاہ: کیفیت جب بھی غالب ہوتی ہے تو ماحول کا احساس نہیں ہوتا لیکن شور و غل سے مجھے ذہنی کوفت ہوتی ہے، بنیادی طور پر میں خاموشی کا قائل ہوں۔

م ا ل: کیا آپ سے ایسی کوئی کہانی تخلیق ہوئی ہے جس میں آپ کی نجی زندگی کے حالات و واقعات اور حقائق ہو بہو قلم بند ہوں؟

نور شاہ: میری بہت ساری ایسی کہانیاں ہیں جن میں میں نے دوسروں کا رنگ و روپ اپنا کر اپنی کہانی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

م ا ل: کیا آپ کو کبھی شعر و شاعری کرنے کا خیال آیا۔ حالانکہ آپ کے بہت سارے افسانے صنف نازک کے جمالیاتی موضوعات کے پہلوؤں کے ارد گرد گھومتے نظر آتے ہیں؟

نور شاہ: شعر کہنا میرے بس کی بات نہیں، ایک شاعر کے لیے صرف صنف نازک کے جمالیاتی موضوعات کافی نہیں ہیں۔ شاعری کی تاثیر میں وزن، آہنگ کے ساتھ ساتھ الفاظ کے سُر اور موسیقی کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ البتہ چند برس قبل میں نے کچھ نثری نظمیں لکھی تھیں جن میں سے چند ایک شائع بھی ہوئیں۔ اچھا شعر سُن کر خوشی محسوس کرتا ہوں، اصل میں کوئی بھی صنف آسان نہیں، وہ شاعری ہو، افسانہ ہو، تنقید یا تحقیق ہو یہ تو سب آپ کے تخلیقی سفر پر منحصر ہے کہ آپ کون سی صنف اپنانے کے قابل ہیں۔

م ا ل: آپ کی تحقیق کے مطابق ریاست کے اردو فکشن نگاروں میں پہلا افسانہ نگار کون ہے؟

نور شاہ: افسانہ جس نے بھی پہلے لکھا ہو لیکن ہر صورت میں پریم ناتھ پردیسی ریاست کے پہلے اردو افسانہ نگار ہیں۔ اس لیے کہ اُن کے افسانوں میں فنی اور ہیئتی عناصر کا بھرپور شعور ملتا ہے۔

م ا ل: برصغیر میں اس وقت نئی کہانیوں، افسانچوں کے علاوہ تین پانچ سات سطروں کی افسانہ نگاری فروغ پا رہی ہے، اس تعلق سے آپ کا نظریہ کیا ہے؟

نور شاہ: اب تو ایک سطری افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چھوٹی کہانیاں اتنی چھوٹی نہیں جتنی نظر آتی ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ منی کہانیوں میں نہ کوئی فنکاری ہوتی ہے اور نہ ہی دل پذیری۔ بہرحال میں آپ کے سوال میں کہنا چاہوں گا اگر کوئی افسانہ نگار واقعی چند جملوں میں اپنے موضوع سے انصاف کرسکتا ہے تو اس کی تعریف کی جانی چاہیے۔

م ا ل: دور حاضر میں ریاست کے اُبھرتے نوجوان قلمکاروں میں چند ایک ناموں سے آگاہ کریں جو آپ کی دانست میں خوب لکھتے ہیں اور کیا ان قلم کاروں میں آگے

بڑھنے کی صلاحیت موجود ہے۔

نو ر شاہ : ہماری ریاست میں میری عمر کے افسانہ نگار بھی اپنے آپ کو نوجواں قلم کاروں میں شامل کرتے ہیں، میں اُن کا نام نہ لوں تو ناراض ہوجائیں گے۔ ہاں اگر آپ چالیس برس کی عمر سے کم قلم کاروں کی بات کرتے ہیں تو بہت سارے نام میرے ذہن میں ہیں لیکن یہ بات کہنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا کہ ان میں سے بہت سارے نوجوان اور اُبھرتے کہانی کاروں کو روزنامہ 'کشمیر عظمیٰ' کے ادب نامہ نے متعارف کرایا۔ دراصل نئی نسل ہم سے زیادہ حساس ہے، ذہین ہے، زیادہ صلاحیتوں کی مالک ہے۔ ذہنی طور پر بالغ ہے، ہماری نئی نسل کے قلمکار، افسانہ نگار، شاعر، ادیب اور صحافی ہپوکریٹ نہیں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ریاستی ادیبوں کے تئیں جو بے اعتنائی برتی گئی یا برتی جارہی ہے، اس کا احساس باہر اتنی شدت سے نہیں جتنا کہ یہاں موجود ہے اور نتیجے کے طور پر یہاں کا قلم کار اپنے آپ کو نظرانداز کیا ہوا محسوس کررہا ہے۔ اس کے باوجود تخلیقی عمل جاری ہے اور اس کارواں میں نئے نئے ساتھی شامل ہورہے ہیں۔ اس لیے میں بغیر نام لیے کہنا چاہوں گا کہ ہماری نئی نسل کا ہر افسانہ نگار بھرپور صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔

م ا ل: ریاست جموں وکشمیر میں تنقید وتحقیق کی کیا صورت حال ہے؟

نو ر شاہ : تحقیق وتنقید کے تعلق سے ریاست جموں وکشمیر میں حامدی صاحب کے علاوہ کچھ اور بھی شخصیات ہیں، کچھ قلم کار ہیں جن کے ذہین تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔

م ا ل: کچھ نام لیجیے؟

نو ر شاہ : پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر ظہورالدین، پروفیسر قدوس جاوید، ڈاکٹر مشتاق احمد حیدر، ڈاکٹر اشرف آثاری، ڈاکٹر محی الدین زور وغیرہ شامل ہیں۔ پروفیسر اکبر حیدری، پروفیسر مجید مضمر اور ڈاکٹر فرید پربتی اب حیات نہیں ہیں لیکن وہ تحقیق وتنقید کے میدان میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

م ا ل: کیا آپ کے خیال میں اُردو ادب میں جمود طاری ہے اگر ہے تو اس کے کیا اسباب ہوسکتے ہیں اس جمود کو توڑنے کے لیے کیا کیا جائے؟

نو ر شاہ : کسی حد تک جمود ہے لیکن جمود کے ذمے دار ہم ہی ہیں کیونکہ تخلیق میں تعطل پیدا ہونا اس چیز کی عکاسی کرتا ہے کہ تخلیق کار کو کچھ ذہنی اور نفسیاتی مسائل و مصائب درپیش ہیں۔ اس لیے جمود توڑنا اور تخلیقی عمل کے

"نئی نسل سے وابستہ قلم کاروں کو اس بات کی تلقین کرتا ہوں کہ خوب مطالعہ کریں (بقول چیخوف تخلیق کار کے لیے مطالعہ ومشاہدہ آب حیات کی مانند ہے) خوب مشق کریں اور اپنے تخلیقی کام کو نکھارنے کے لیے اپنے مشاہیر کے ساتھ مشورے کیا کریں اور ساتھ ہی اردو زبان کو اپنی طبیعت کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔ ان ہی چیزوں سے علمی، ادبی اور ذہنی راہیں روشن ہوتی ہیں اور تخلیق کار کے لیے ان عوامل کا ہونا ناگزیر ہے۔"

لیے سازگار ماحول پیدا کرنا ہماری ذمے داری ہے حالانکہ اس وقت بھی تخلیقی ادب میں اضافہ کرنے کے لیے بہت لوگ مصروف کار ہیں۔

م ا ل: شاہ صاحب۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ اُردو میں موجودہ تخلیقی ادب کی رفتار اطمینان بخش ہے؟

نو ر شاہ : اطمینان بخش نہیں ہے انفرادی اور اجتماعی سطح پر کچھ کوششیں ہورہی ہیں لیکن بہ صورت حال مایوس کن ہے۔ نئی نسل اُردو کے تئیں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

م ا ل: اپنی زندگی کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ بتائیں؟

نو ر شاہ : نورشاہ سے شاہدہ شیرین اور پھر شاہدہ شیرین سے نورشاہ ہونا میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ ہے۔

م ا ل: شاہ صاحب اُردو ادب میں گروہ بندیاں زیادہ ہیں۔ انھیں کے مطابق اعزازات اور ایوارڈس دیے جاتے ہیں۔ آپ کو اس ضمن میں کوئی شکایت ہے؟

نو ر شاہ : انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اُردو میں گروہ بندیوں کا کچھ زیادہ ہی چلن ہے۔ میں خود اس کا شکار ہوا ہوں، دہرانے کی گنجائش نہیں ہے۔

م ا ل: آپ کو اپنے کریئر کے دوران کس چیز کی کسک محسوس ہوتی رہی یا جو کچھ آپ کرسکے ہیں، نہیں کیا، اس کا پچھتاوا ہے؟

نو ر شاہ : جو کچھ کرسکا اس پر مطمئن ہوں۔ حال اور مستقبل میں بھی اپنے ادھورے سپنوں میں رنگ بھرنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔

م ا ل: آپ برصغیر کے موقر رسائل میں گزشتہ پانچ دہائیوں سے مسلسل چھپتے رہتے ہیں، اس کے برعکس ریاست کے جوان تر افسانہ نگار یا ادیب شاذونادر ہی چھپتے ہیں اس کی کیا وجوہات ہیں؟

نو ر شاہ : دیکھیے اس کے لیے Consistency کی ضرورت ہے مسلسل کوشش کا نام عمل ہے۔ اس حوالے سے میں نئے قلم کاروں کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ معیار اور Content پر توجہ دیں۔ آپ کی تخلیقات ریاست کے رسائل میں ہی نہیں بلکہ برصغیر کے رسائل میں جگہ پاسکتی ہیں۔ گزشتہ چند برسوں سے بیرون ریاست کے رسائل میں ریاست کے قلم کاروں کی تخلیقات دیکھنے کو ملتی ہیں جو کہ ایک خوش آئند بات ہے۔

م ا ل: ریاست میں تخلیق ہونے والے ادب سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

نو ر شاہ : ریاست میں ادبی ماحول کافی حد تک سازگار ہے اور ہمارے لکھنے والوں کی ایک اچھی جماعت سنجیدگی سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہے اور میرے خیال میں معیاری فن پارے تخلیق ہورہے ہیں۔

م ا ل: ریاست جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے مستقبل کے حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

نو ر شاہ : مجھے لگتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو زبان کا مستقبل روشن اور تابناک ہے بشرطیکہ سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر اُردو زبان کے فروغ اور ترویج کے حوالے سے ٹھوس اور عملی اقدامات اُٹھائے جائیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں اُردو زبان وادب کی تدریس کی طرف خاطر خواہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

م ا ل: شاہ صاحب آپ نئی نسل کے تخلیق کاروں کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

نو ر شاہ : میں نئی نسل سے وابستہ قلم کاروں کو اس بات کی تلقین کرتا ہوں کہ خوب مطالعہ کریں (بقول چیخوف تخلیق کار کے لیے مطالعہ ومشاہدہ آب حیات کی مانند ہے) خوب مشق کریں اور اپنے تخلیقی کام کو نکھارنے کے لیے اپنے مشاہیر کے ساتھ مشورے کیا کریں اور ساتھ ہی اردو زبان کو اپنی طبیعت کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔ ان ہی چیزوں سے علمی، ادبی اور ذہنی راہیں روشن ہوتی ہیں اور تخلیق کار کے لیے ان عوامل کا ہونا ناگزیر ہے۔

م ا ل: بہرحال ہم آپ کے شکرگزار ہیں کہ آپ نے اتنا وقت دیا اور بغیر کسی تکلف کے ہم سے باتیں کیں۔ شکریہ

نورشاہ: شکریہ!!!

■

Mohd Iqbal Lone
Research Officer, J&K Academy of Art Culture and Language Lalmandi
Srinagar - 190008

عالمی اردو کانفرنس
مندوبین کے تاثرات

جب ایئر لائنز کے طیارہ نے ابوظہبی سے دہلی کے لیے اڑان بھری تو دل کو تجسس اور ایک یقینی اور بے یقینی کی کیفیت نے گھیر لیا۔ اپنی زندگی میں پہلی بار انڈیا جارہا تھا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا جس کے روح رواں جناب ارتضی کریم ہیں۔ ان سے میری ملاقات قطر میں عالمی مشاعرے اور سیمنار میں ہوئی تھی۔ ایک مخلص اور متحرک شخصیت ہیں۔ انتہائی زیرک اور ذہین گفتگو ایسی جو آپ کے دل میں اترتی چلی جائے۔ بزم صدف انٹرنیشنل جس کے زیر اہتمام مشاعرہ اور سیمنار منعقد ہوا تھا اس کے کرتا دھرتا اور منتظم اعلیٰ جناب شہاب الدین احمد جو خود اپنی ذات میں انجمن ہیں ایسی حیرت انگیز شخصیت کہ جس سے مل لیں وہ ان کا گرویدہ ہوجائے۔ فیصلے انتہائی مضبوطی سے کرتے ہیں ان پر قائم رہنا کوئی شہاب الدین سے سیکھے۔ پھر سونے پر سہاگہ کہ قطر میں جناب شہاب الدین کے ساتھ جناب ارتضی کریم کی موجودگی نے اس مشاعرے اور سیمنار میں رنگینیاں بھردی تھیں۔

ارتضی کریم صاحب اور شہاب الدین احمد سے خوشگوار ملاقات کا تاثر لے کر میں قطر کے سیمنار اور مشاعرے سے واپس ابوظہبی آگیا۔ کچھ ہی روز گزرے تھے کہ شہاب الدین کا فون آیا کہ 17 تا 19 مارچ کو دہلی میں حکومت ہند کی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے ایک سیمنار اور مشاعرہ کا انعقاد کیا جارہا ہے آپ کو جانا ہے اور آپ کے مقالے کا موضوع ہے "خلیج میں اردو" میں نے عرض کیا: ویزے کا کیا ہوگا؟ فرمایا آپ کی متعلقہ اداروں سے کلیرنس کرواکے ابوظہبی میں ہندوستانی سفارت خانے کو بھیج دی جائیں گی اور آپ کو صرف جاکر ویزہ لگوانا ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔ ابوظہبی میں ہندوستان کے سفارت خانے نے ویزہ لگانے کے تمام مراحل طے کروادیے۔ جہاز اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئرپورٹ دہلی پر اتر چکا تھا۔ امیگریشن کے مراحل سے گزر کر ایئرپورٹ سے باہر آیا اور ٹیکسی لے کر اشوک ہوٹل پہنچ گیا۔ وہاں پر میرے لیے کمرہ بک تھا۔ کمرے میں پہنچ کر تھوڑی دیر آرام کیا کہ امارات سے عزیزی احیاء الاسلام کا واٹس اَپ پر پیغام آیا کہ میرے دوست ونیت نے اپنے آدمی آپ کے ہوٹل بھیج دیے ہیں ان کے ساتھ آپ پرانی دہلی دیکھ لیں۔ تھوڑی دیر میں میں انتہائی اشتیاق اور تجسس کے جذبات کے ساتھ پردیپ کے ساتھ اشوک ہوٹل سے پرانی دلی جارہا تھا۔ سب سے پہلے میں درگاہ حضرت نظام الدین اولیا پر گیا حاضری کی سعادت حاصل کی سب کا سلام آپ کو پہنچایا میری بڑی دیرینہ آرزو تھی جو اللہ تعالی نے پوری کی۔ وہاں سے نکل کر انڈیا گیٹ گئے پھر طے ہوا کہ جامع مسجد دہلی کے سامنے فوڈ اسٹریٹ ہے وہاں کھانا کھایا جائے۔ کھانا کھا کر واپس ہوٹل آگیا۔

ملک زادہ جاوید ملنے آگئے ان سے بات چیت ہورہی تھی کہ محترم ارتضی کریم ہمارے میزبان اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کمرے میں تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ شہاب الدین احمد بھی تھے جن کے متعلق میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں۔ کافی دیر گفتگو رہی پھر صبح ناشتے پر ملنے کا پروگرام طے ہوا۔ ناشتے کے بعد ارتضی کریم صاحب کے ساتھ اشوک ہوٹل کے خوبصورت ہال میں گئے۔ آپ یقین جانیے ایک ایک جزئیات پر ارتضی کریم صاحب غور کررہے تھے اور اپنے عملے کو ہدایت دیتے جارہے تھے۔ ان کی اس قدر محنت اور جانفشانی سے اندازہ ہوا کہ ارتضی کریم کسی ادارے کے ڈائریکٹر ہی نہیں بلکہ اپنی ذات میں خود ایک ادارہ اور انجمن ہیں اور مرکزی وزیر سرکاری مصروفیات کی وجہ سے تشریف نہیں لاسکے مگر حکومت ہند کے دو وزرا اور مرکزی رہنما شاہنواز صاحب موجود تھے۔ قطر سے محمد صبیح الدین بخاری بھی تشریف لائے تھے اردو کے فروغ کے حوالے سے بڑی سیر حاصل تقاریر ہوئیں جن سے مجھے انداز ہوا کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل جب تک ارتضی کریم جیسے عاشق اردو موجود ہیں انتہائی روشن ہے۔ ارتضی کریم صاحب کو حال ہی میں مجاہد اردو کا اعزاز بھی دیا گیا ہے۔ اسی اجلاس میں تمام غیر ملکی مندوبین سے ملاقاتیں ہوئیں جو دنیا کے مختلف ممالک سے تشریف لائے تھے جناب شمس الرحمن فاروقی

چوتھی عالمی اردو کانفرنس کے دوسرے دن کے دوسرے اجلاس کا منظر: پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر شین اختر، رتن لال ہانگلو، پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر حبیب نثار، ڈاکٹر رضا حیدر

اور طنز و مزاح کی دنیا کے ایک بہت بڑے نام مجتبیٰ حسین صاحب سے ملاقات کا بھی شرف حاصل ہوا جناب انعام دار بھی موجود تھے۔ قطر سے احمد اشفاق، ترکی سے ڈاکٹر خاقان قیوم جو، ایران سے محترمہ زینب سعیدی، ترکی کی اریکس یونیورسٹی سائینا تھہ وتھل چاپلے، ڈاکٹر وفا یزدان، یونیورسٹی آف تہران، سعودی عرب سے مہتاب قدر، قطر سے شہاب الدین احمد، آصف علی عادل اور تاشیانہ شاتگی اور جرمنی سے ودیاراج اور متحدہ عرب سے ریحان خان اور ظہورالاسلام جاوید کانفرنس کے بیرونی مندوبین میں شامل تھے اور ہندوستان سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر ایم سعیدالدین، نند کشور وکرم، پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر ظہیر قاضی، خواجہ عبدالمنتقم، جاوید قدوس، سید محمد اشرف، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر عین الحق، کیول دھیر، شہاب الدین احمد، عین الحسن، محترمہ صدف اقبال، شعیب رضا فاطمی وغیرہ شامل تھے۔ 17 مارچ اور 18 مارچ کو روز تین اجلاس ہوئے تھے جن میں مختلف مقالہ نگاروں نے اردو کے حوالے سے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ 19 مارچ کو کانفرنس کا آخری دن تھا۔ 18 مارچ کو آخری اجلاس میں عالمی مشاعرہ تھا جس کی نظامت راقم الحروف کو دی گئی تھی۔ دبستان دہلی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے شاعر اور بین الاقوامی شعرا نے مشاعرے کو رونق بخشی جن میں اقبال اشہر، فاروق بخشی، احمد اشفاق، ڈاکٹر قاسم خورشید، محترمہ صدف، اعجاز اسد، جناب قدر، ناشر نقوی، پروفیسر عین الحسن، معین شاداب، شمس تبریزی، اسرار جامعی، جاوید دانش، غضنفر، ظفر ابدالی، شیو کمار بلگرامی، راشد انور راشد، رجنیش کمار، محترمہ قمر سرور شامل تھیں۔ بڑا کامیاب مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرے کی صدارت جاوید دانش نے کی۔ 19 مارچ کو صبح کے پہلے اجلاس کی صدارت بھی راقم الحروف نے کی۔ انتظامات کے حوالے سے یہ کانفرنس ایک مثالی اور یادگار تھی جسے برسوں یاد رکھا جائے گا۔ سید سروش آصف اور فرحت نور خان مستقل ٹیلی فون پر ابوظہبی سے میری خیریت دریافت کرتے رہے۔ جاوید دانش نے حسب معمول اپنے داستان گوئی کے پروگرام میں حاضرین کو مسحور کیے رکھا۔ آخری دن 19 مارچ کو اختتامی اجلاس میں مرکزی وزیر جناب پرکاش جاوڈیکر نے صدارت کی جن کی وزارت کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ادارہ کام کرتا ہے۔ ان کی آمد پر بیرونی ممالک سے آئے ہوئے مندوبین کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کو گلدستہ پیش کرنے کا اعزاز مجھے دیا گیا۔ وزیر موصوف نے اپنی تقریر میں اردو سیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ مجھے اردو سکھانے کا انتظام کیجیے۔ یہ بھی اردو کے لیے بے حد نیک شگون تھا۔ اس موقعے پر جاوید دانش کی کتاب 'ایک اور آوارگی' کا اجرا وزیر موصوف نے کیا۔ آخر کار یہ کانفرنس انتہائی کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ مندوبین ایک دوسرے سے انتہائی گرم جوشی سے ملے۔ تمام مندوبین جناب ارتضیٰ کریم اور ان کے عملے کے لیے کلمات تحسین ادا کر رہے تھے کہ اس قدر شاندار انتظام و انصرام خال خال ہی نظر آتا ہے جو یہاں دیکھا گیا ہے۔ کانفرنس کے اختتام کے بعد مجھے تین دن دہلی میں رک کر دہلی اور پرانی دہلی کو دیکھنا تھا۔ اختتامی اجلاس میں نشتر امروہوی ملنے کے لیے آ گئے۔ بضد ہو گئے کہ بقیہ تین دن آپ میرے گھر پر رہیں گے میں نے بتایا کہ میں ہوٹل بک کرا چکا ہوں کہنے لگے کل یہاں سے آپ کا چیک آؤٹ ہے میں گاڑی لے کر آ جاؤں گا آپ میرے گھر کے ہوتے ہوئے کہیں اور نہیں رہیں گے۔ بہت سمجھایا مگر نہ مانے بالآخر ان کی ضد اور محبت کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ہوٹل کی بکنگ ارتضیٰ کریم صاحب سے کہہ کر منسوخ کروائی۔ دوسرے دن وہ آ گئے ان کے گھر چلا گیا۔ گھر میں اس قدر محبتیں ملیں کہ بیان کرنا محال ہے بھابھی اور ان کا بیٹا ایسے پرخلوص لوگ آج کی دنیا میں کم ہی ہوں گے بقول جوش ملیح آبادی:

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

نشتر امروہوی نے دوسرے دن شاندار نشست کا

شمس تبریز

شیو بلگرامی

مظفر ابدالی

پروفیسر چندر شیکھر

قاسم خورشید

صفدر امام قادری

اہتمام کیا اور اس تقریب میں ان کی تحقیقی کتاب 'اردو ادب میں طنز و مزاح' کی رونمائی ہوئی۔ نشست میں ملک زادہ جاوید، شکیل جمالی، رضی صاحب، رحمٰن مصور، علینہ عترت، نشتر امروہوی، بینا خان اور دیگر لوگ تھے۔ بڑی خوبصورت نشست تھی۔ شکیل جمالی نے بہت خوبصورت نظامت کی۔ نشتر امروہوی اور ان کی زوجہ یمن نقوی اور انئین بیٹے نے اس قدر میری خاطر اور خدمت کی ہے کہ دل سے ان سب کے لیے دعائیں نکلتی رہیں۔ کانفرنس میں کئی نئے دوستوں سے ملاقات ہوئی جن میں حقانی القاسمی، اظہر اقبال، ڈاکٹر آصف علی محمد، ایم یو عبد علی، محمد احتشام الحسن، عادل گاندھی، زاہد الحق، پروفیسر آزردہ، مشتاق احمد نوری، فاروق سید، مصطفیٰ عمری قابل ذکر ہیں۔

—ظہور الاسلام جاوید، (ابوظہبی)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام 17-19 مارچ 2017 کو منعقدہ چوتھی عالمی اردو کانفرنس میں مدعو کرنے کے لیے خصوصی طور پر ممنون ہوں۔

آپ نے اس کانفرنس کے حوالے سے میرے تاثرات اور مشورے کی فرمائش کی ہے۔ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ کونسل کا یہ پروگرام اردو کی عالمی بستیوں کے لیے کسی آئیڈیل سے کم نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آپ نے پوری عرق ریزی کے ساتھ بشمول ہندوستان، دنیا بھر کے تمام ممالک کے مندوبین کو جمع کیا۔ ساتھ ہی ان کی گراں قدر آرا سے نئی نسل کو مستفیض ہونے کا موقع بھی عنایت کروایا۔ اس عہد میں اس کانفرنس کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ اردو کے نام نہاد لوگ احساس کمتری کے شکار ہیں اور اس زبان کے حوالے سے اپنے منفی رویے سے نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں، جبکہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو اپنی خوبیوں کی وجہ سے ہر دور میں زندہ رہی ہے اور آئندہ بھی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہے گی۔ اگر ہم اس زبان سے استفادہ نہ کرسکے تو یہ دوسرے اہل علم اور اہل جنوں کی بستیوں میں منتقل ہوجائے گی۔ آپ نے اس کانفرنس کے حوالے سے اردو کی نئی عالمی بستیوں میں اس کے احوال کو پیش کرتے ہوئے یہ لائحہ عمل بھی تیار کیا ہے کہ اس زبان کے فروغ میں نئی نسل پوری شدت کے ساتھ شامل ہوسکے۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ بیرون ممالک میں رہنے والے ایسے افراد کی بھی شناخت کی جائے جو بے لوث جذبے کے ساتھ اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ کونسل کا کام ہے کہ سب سے پہلے بالکل نئی آبادیوں کو روشناس کروائے۔ میرا خیال ہے کونسل سے بہتر یہ کام کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ آپ وزیر تعلیم پرکاش جاوڈیکر کے اس خواب کی تعبیر بھی بن جائیں جس سے تعلیم کے شعبے میں پوری دنیا میں زبان کی آبیاری ہوسکے اور اردو پوری شدت سے نئی کونپلوں کی طرح ابھرتی رہے۔

—قاسم خورشید، پٹنہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام، چوتھی عالمی کانفرنس 17-19 مارچ 2010 کو بہت شاندار سطح پر منعقد ہوئی۔ خاص طور پر مشاعرہ اور افسانہ خوانی کی محفلوں سے کانفرنس کے وقار میں مزید اضافہ ہوا۔ مختلف عنوانات پر معلومات افزا مقالات پڑھے گئے۔ رہائش، کھانے پینے اور ہوٹل سے کانفرنس ہال تک آنے جانے کے سلسلے میں کوئی کمی محسوس ہونے نہیں دی گئی۔ آپ بطور ڈائرکٹر اور آپ کے ساتھ اہتمام کرنے والے ہر وقت کشادہ روئی سے پیش آئے۔ مجھے اس کانفرنس میں شرکت کرنے کا موقع ملنا باعث فخر ہے اور آپ کی بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے لیے یہ موقع مہیا کیا۔ میں اچھی یادوں کے ساتھ انڈیا سے واپس آئی۔ میں اردو کی خدمت گزار ہوں اور اردو زبان و ادب میری پوری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ ہر حوالے سے اردو کی خدمت کرنے کے لیے حاضر ہوں اور ہر تعاون میرے لیے اعزاز کا باعث ہوگا۔

—ڈاکٹر وفا یزدان منش، شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف تہران

احمد علی برقی

اعجاز اسد

اسرار جامعی

معین شاداب

راشد انور راشد

اقبال اشہر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام مورخہ 17 تا 19 مارچ 2017 کو منعقدہ چوتھی عالمی اردو کانفرنس میں آپ نے شرکت واستفادہ کا موقع عطا فرمایا، اس کے لیے میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اس کانفرنس میں شریک نہ ہوتا تو اکابرین فہم وادب سے مستفیض نہ ہو پاتا۔ آپ کی فعال قیادت میں کانفرنس نے نہ صرف کامیابی کی منزلیں طے کی ہیں بلکہ اسے ایک سنگِ میل کی حیثیت بھی حاصل ہوئی ہے۔ امید قوی ہے کہ آئندہ ملک وبیرون ملک میں منعقد ہونے والی دیگر کانفرنسوں پر اس کے اثرات و نقوش بھی مرتب ہوں گے۔ آپ نے تمام مہمانان کے طعام وقیام کے اعلیٰ معیار کے ساتھ بڑے پیمانے پر ایک دوسرے سے ملاقات کی جو صورت پیدا کی وہ آپ ہی کا حصہ ہے اور اس کے لیے میں ایک بار پھر آپ کا ممنون ہوں۔

—— **امام اعظم**، ریجنل ڈائرکٹر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ریجنل سینٹر کولکاتا

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، آپ کی سرپرستی میں مسلسل اہم علمی وادبی امور انجام دے رہا ہے جس کے لیے میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ کونسل کے ذریعے عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد یقیناً ہماری ادبی تاریخ میں ایک سنگِ میل ہے۔ جس خلوص اور محبت کے ساتھ کئی ممالک کے اہم ادیبوں اور دانشوروں کی کہکشاں کو آپ نے عالمی اردو کانفرنس کے موقعے پر جمع کیا اسے اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ ہمیں پوری امید ہے کہ آپ کی نگرانی میں یہ ادارہ اردو زبان کے فروغ میں مسلسل نمایاں امور انجام دیتا رہے گا۔

—— **سید رضا حیدر**، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام مورخہ 17 تا 19 مارچ 2017 کو منعقدہ چوتھی عالمی اردو کانفرنس میں آپ نے شرکت واستفادے کا موقع فراہم کیا اس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ کی فعال رہنمائی میں کانفرنس نے نہ صرف کامیابی کی نئی منزلیں طے کی ہیں بلکہ اسے ایک تاریخی مقام بھی عطا کیا ہے۔ کانفرنس کی کامیابی پر میں ایک بار پھر آپ کو اور آپ کی ٹیم کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

عالمی اُردو کانفرنس میں ایک اجلاس اردو میڈیم تعلیم کے مسائل وچنوتیوں پر بھی ہو تو بہتر ہوگا تاکہ اس پر کھل کر بحث کی جاسکے اور کوئی لائحہ عمل تیار کیا جاسکے۔

میں اپنی علالت کے سبب وقت پر جواب نہ دے سکا۔ تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

—— **ڈاکٹر محمد احسن**، ریجنل ڈائرکٹر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ریجنل سینٹر بھوپال

میں اپنے ادارے کے ایم ای سوسائٹی کے عہدے داران اور اپنی جانب سے مشکور ہوں کہ اس چوتھی عالمی اردو کانفرنس کے توسط سے ایسی ہفت رنگ وہشت پہلو شخصیتوں سے مستفیض ہونے کا موقع ملا جو زندگی کے مختلف دائروں میں اپنی عظمت کا اعلان واعتراف اس طرح کرتی ہیں کہ ہر دائرے میں ان کی عظمت کی ایک نئی دنیا آباد ہوتی ہے، ساتھ ہی شیریں گفتار، بشر دوست اور صلح کل انسان پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب کو اس تاریخی عالمی اردو کانفرنس کے کامیاب انعقاد اور انصرام کے لیے تہنیت پیش کرتے ہیں۔ یہ کانفرنس یقیناً مشترکہ تہذیب کی مستحکم علامت کے ساتھ ساتھ ذہنی وسماجی انقلاب کی نمائندہ ثابت ہوگی جو ماضی کی بے اعتنائی کا مداوا بھی ہے ایک ایسی سعی مشکور ہے جسے مورخ فراموش نہ کرسکے گا۔

اس کانفرنس سے مجھے جو تاثر ملا ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ ہم بزم کے عادی ہیں رزم کے نہیں، ہم فریاد کے عادی ہیں للکار کے نہیں، ہم اسرار کے عادی ہیں آشکار کے نہیں، مختصراً یہ کہ دشتِ وحشت میں بھی آداب لیے پھرتے ہیں۔ وزارتِ ترقی انسانی وسائل اور قومی کونسل برائے فروغ، اردو زبان کی کاوشیں ان کے سنجیدہ مقاصد کی ترجمان ہیں۔ ایک مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ اسکیموں کی حصولیابی کے مراحل کو کسی قدر آسان بنایا جائے کیونکہ جو اصل مستحقین ہیں وہ گاؤں اور قصبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بنیادی تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ بہترین اذہان زبانوں کی ترویج اور مسابقتی امتحانات میں شامل ہوسکیں۔ بلاشبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک بحرِ بے کنار ہے لیکن کسی کارِ خیر میں ہم آبجو کا کردار نبھا سکیں تو یہ ہمارے لیے باعثِ صد افتخار ہوگا۔

—— **جویریہ قاضی**، صدر مدرسہ مومن گرلز ہائی اسکول، بھیونڈی، تھانے، مہاراشٹر

ہم آپ کے بہت مشکور ہیں کہ آپ نے ہمیں عالمی کانفرنس میں مدعو کرکے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ آپ کی تعریف اور اردو ادب کے لیے آپ کی خدمات تو دیکھی اور سنی تھی۔ لیکن کیا کریں جب تک بصارت شہادت نہ دے چشم وذہن یقین نہیں کرتے۔ پہلی بار کئی نئے اور باصلاحیت واہل افراد کو ایک اسٹیج پر یکجا دیکھا اور حقیقت میں لگا کہ اردو کے لیے اچھے دن آگئے ہیں۔ اردو کے لیے یہ ایک خوش آئند مقام ہے بدلتی ہواؤں سے آپ اردو کی بقا کے لیے خوشبو سمیٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

—— **ڈاکٹر ہاجرہ بانو**، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

■

بچوں کی نفسیات اور کھیلوں کے ذریعے تعلیم

محمد قمر سلیم

روسو، فروبیل، مانٹیسری، ٹیگور وغیرہ نے بچوں کی نفسیات کے عین مطابق کھیل کے ذریعے تعلیم کو ایک اہم مقام عطا کیا ہے۔ کھیل کے ذریعے تعلیم طفل مرکوز تعلیم پر مبنی ہے۔ جماعت میں چھوٹے چھوٹے کھیلوں کے ذریعے بچوں کی ذہنی، سماجی، ادبی، جسمانی، جذباتی نشوونما اور ان کی دلچسپی، توجہ، تحریک، جوش وخروش، اعتماد اور سیکھنے کے عمل کی نشوونما کی جاسکتی ہے۔ تعلیم وتدریس کے عمل میں بچوں کی شرکت سے ان کو لامحدود خوشیاں عطا کی جاسکتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ محرکات کی نشوونما اور سیکھنے کے عمل کو عملی طور پر یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں اساتذہ، کھیلوں کے ذریعے تعلیم، پر صرف زبانی جمع خرچ کرتے ہیں۔ ہمارے اساتذہ مشکل سے ہی اپنے مضامین کو کھیلوں کے ذریعے پڑھاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تدریس بے معنی، بد مزہ، فرسودہ، یکسانیت سے لبریز اور روکھی ہوتی ہے جو عام طور سے بچوں کی عدم دلچسپی کا باعث بنتی ہے۔ بہت کم اساتذہ ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کھیلوں کے ذریعے تدریس میں جان پھونکی جاسکتی ہے۔

کھیلوں کے ذریعے تعلیم میں تعلیم کا مرکز بچہ ہوتا ہے۔ آج کے ترقی یافتہ سماج میں اطلاعاتی اور مراسلاتی تکنیک کے استعمال نے دنیا کو ایک گلوبل گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے اور اس میں رہنے والے تمام لوگ ایک خاندان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح اگر دنیا گلوبل گاؤں ہے تو انسانیت گلوبل خاندان ہے۔ جب ایک سماج اتنا وسیع ہو اور جس کا پھیلاؤ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہو تو ایسی صورت میں اطلاعاتی اور مراسلاتی نظام کی ضرورت پڑتی ہے۔ ماحولیاتی مسائل اور دوسرے بڑھتے ہوئے خطرات نے انسانیت کو ایک گلوبل خاندان کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس صورت میں ہمیں اپنے بچوں کو زندگی میں آنے والے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنا پڑے گا، جس کے لیے اطلاعاتی اور مراسلاتی نظام کو جاننا ضروری ہے۔ اور اس نظام کا بہ خوبی استعمال صرف اور صرف اساتذہ پر منحصر ہے۔ اس طرح اسکول اور اساتذہ کی ذمے داریاں کافی حد تک بڑھ جاتی ہیں۔ کیونکہ تعلیم صرف سیکھنے تک محدود نہیں ہے۔ تعلیم کا مقصد بچے کی مکمل نشوونما کرنا ہے اور مکمل نشوونما میں شخصیت کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج زبان کی تدریس میں نئے پہلو اور رجحانات کو شامل کیا جارہا ہے جس میں ذہانت کے تمام پہلوؤں کا استعمال کیا جارہا ہے اور اس میں کھیل بھی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن کھیل کا زندگی میں صحیح استعمال کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا ایک اہم فعل ہے۔ کیونکہ کھیل کو زیادہ تر لوگ تعلیم سے جوڑنا پسند نہیں کرتے ہیں۔

تعلیم کا مقصد ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے حالات کا جم کر مقابلہ کیا جائے اور تعلیم کا صحیح استعمال کیا جاسکے۔ ایسے میں ذہن میں چند سوالات ابھرتے ہیں:

1۔ کیا تعلیم سیکھنے کے مترادف ہے؟

2۔ اگر ہاں، تو کیا ہماری درس گاہیں بچوں کو تعلیم یافتہ بنا رہی ہیں؟

3۔ کیا سیکھنے کا عمل فطری ہے؟

4۔ کیا ہماری تدریس ہمارے طلبا کے لیے مفید ہے؟

مندرجہ بالا سوالات کے جواب حل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک مفکر ہالٹ (Holt) کے خیالات کا تجزیہ کریں۔ اس کے مطابق 'اسکول ایک ایسی جگہ (درس گاہ) ہونی چاہیے جہاں بچے وہی سیکھیں جو وہ سب سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں، برمقابل اس کے ہم سوچتے ہیں کہ انھیں کیا جاننا ہے۔ ایک بچہ جو جاننا چاہتا ہے اس کو وہ یاد رکھتا ہے۔ اور اس کا استعمال کرتا ہے۔ وہ بچہ جب کسی کی خاطر اور کسی وجہ سے کچھ سیکھتا ہے اور جب ضرورت پڑتی ہے تو بھول جاتا ہے۔'

آج بھی حالات بدلے نہیں ہیں۔ آج بھی بچہ ذہنی طور پر بہت زیادہ دباؤ میں رہتا ہے اور اس کی پریشانی یہ ہے کہ:

- اساتذہ سوچتے ہیں کہ وہ اپنے طلبا کی دلچسپیوں کو بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی دلچسپیاں اور بچوں کی دلچسپیاں ایک جیسی ہیں۔ اور اس حسین سوچ کے نتیجے میں فرسودہ روایات برقرار ہیں۔
- بچے کی پریشانی یہ ہے کہ اسکول کا پیریڈ صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارے اساتذہ وہی پرانے طریقوں سے تدریسی عمل انجام دیتے ہیں۔
- بچے کے لیے اسکول کی گھڑی دنیا کی سب سے سست رفتار گھڑی ہے۔ بچے کی فطرت ہے کہ وہ ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا اور پھر ہمارے بے مزہ اسباق، اس پر اساتذہ کی فرسودہ تدریس جس کی وجہ سے بچے کا پڑھائی میں عدم دلچسپی دکھانا ضروری ہے۔

- آج کے اسکول دماغی اسپتال اور قید خانے ہیں اور طلبا قیدی۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو آنے والے دنوں میں ہماری درس گاہیں بہت جلدی دنیا کے پردے پر نظر نہیں آئیں گی۔ ایسے اساتذہ کی ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں عظیم مفکر رابندر ناتھ ٹیگور کے خیالات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ہمارے اسکول اسپتال ہیں اور ان میں دی جانے والی تعلیم ایک تکلیف دہ علاج ہے۔ یہ اس لیے کہ ہمارے اساتذہ بچے کی عین فطرت کے مطابق تعلیم دینے کے بجائے اپنی سوچ اور خواہشات کو ان پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچے کی پریشانی کی دوسری وجہ استاد کے ساتھ اس کے رشتے ہیں۔ آج کے اساتذہ میں محبت اور ہمدردی کا فقدان ہے۔ وہ بچے کو ایک ایسے گاہک کی شکل میں دیکھتے ہیں جو صرف ان کی کمائی کا ذریعہ ہیں۔ ایک استاد کا بچے سے ماں کے جیسا رشتہ ہونا چاہیے۔ آج ہم سوچنے پر مجبور ہیں کہ:

...... کیا استاد بچے کو ماں کی طرح پیار دیتا ہے؟
...... کیا استاد بچے کی خواہشات کا احترام کرتا ہے؟
...... کیا ان کی دی ہوئی تعلیم بچوں کی زندگی سنوارنے میں کارآمد ہے؟

اگر ہم ان سوالات کا تجزیہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ چند اساتذہ ہی ان سوالوں پر کھرے اترتے ہیں۔ عام طور سے تو اساتذہ میں تدریس کا رجحان ہی نہیں ہے اور جو اساتذہ بچوں کی دلچسپیوں کے مطابق کام کرنا چاہتے ہیں ان کی چند مجبوریاں ہیں جس کی بنا پر وہ چاہنے کے باوجود بھی بچوں کی خواہشات کو پورا نہیں کر پاتے ہیں۔ ان کی چند مجبوریاں اس طرح ہیں:

* وہ آج کے تعلیمی نظام میں آزادانہ طور پر کام کرنے سے قاصر ہیں۔
* انھیں متن کو چننے کا اختیار نہیں ہے۔
* انھیں نصاب مکمل کرنے کی فکر اور جستجو رہتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ جو کچھ پڑھاتے ہیں بچے کی فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔ ان تمام مجبوریوں کے باوجود اگر استاد سنجیدہ ہے تو وہ بچوں میں ان کی دلچسپیوں کے مطابق تبدیلیاں لاسکتا ہے۔ ان کی دلچسپیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درس و تدریس کے عمل کو انجام دے سکتا ہے۔ لیکن اس سے اس کے کام میں ذمّے داریاں شامل ہو جائیں گی۔ ایک استاد کا کام صرف اسباق پڑھانا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی پوری شخصیت کی نشوونما کرنا ہے اس طرح استاد کا کام:

1۔ بچوں کے سیکھنے کی صلاحیت کو اجاگر کرنا۔ ہمارے اساتذہ درسی کتاب سے اسباق پڑھا کر اس کو رٹنے کا کام کرواتے ہیں اور یاد کرواتے ہیں کچھ عرصے کے بعد بچہ اسے بھول جاتا ہے یا اسے اتنا ہی آتا ہے جتنا اسے رٹا دیا گیا ہے اس صورت میں اس کے سیکھنے کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا بہت ضروری ہے۔

2۔ بچے کی انفرادیت کو مدِ نظر رکھنا۔ اس دنیا میں ہر بچہ اپنی انفرادیت لے کر آیا ہے۔ ہر بچہ اپنی جسمانی قوتوں کے ساتھ ساتھ ذہنی قوتوں اور صلاحیتوں میں ایک دوسرے سے الگ ہے، اس صورت میں استاد کو ہر بچے کو اس کی انفرادیت کے مطابق ہی تربیت دینی چاہیے۔

3۔ بچے کے جذبات کی نشوونما کرنا۔ بچے بہت جذباتی ہوتے ہیں استاد کو ان کے جذبات کی قدر کرنا چاہیے اور ان کو ان کے جذبات پر قابو رکھنے کی صلاحیت کی نشوونما کرنی چاہیے خاص طور سے وہ بچے جن کے ماں باپ دونوں نوکری پیشہ ہوں، اور وہ ماں باپ جو اپنے کاروبار کی وجہ سے اپنے بچوں کو وقت نہیں دے پاتے ہیں۔

4۔ بچے کو مادی نہ بنانا۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بچے مشینوں کے عادی ہو گئے ہیں وہ ہر چیز مادی نظریے سے دیکھتے ہیں۔ ان کے لیے رشتے، اخلاق، قدریں کوئی معنی نہیں رکھتی ہیں۔ اس صورت میں استاد کی ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔

یہ ہمارے تعلیمی نظام کا افسوسناک پہلو ہے کہ ہم طلبا کے جذبات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو بھی طور طریقے طالب علم سیکھتا ہے اخلاقی نقطۂ نظر سے اس کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ آج کل اسکولوں میں نتائج کو لے کر مقابلوں نے طلبا کو ایک مادی اشیا بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ اسکول میں پرنسپل صاحبان، اساتذۂ کرام اور گھر میں والدین اس تگ و دو میں لگے رہتے ہیں کہ ان کے بچے کس طرح زیادہ سے زیادہ نمبرات لائیں اور ان کا نام روشن ہو، اس دوڑ میں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بچوں کے جذبات بھی ہوتے ہیں لیکن والدین کی بے جا خواہشات کی وجہ سے بچوں پر ذہنی دباؤ پڑتا ہے جو ان کی شخصیت کے لیے مضر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا میں خودکشی کے رجحانات بڑھتے جارہے ہیں۔

ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ہماری دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور دو چھوٹے چھوٹے کان دنیا کی کھڑکیاں اور علم کے دروازے ہیں۔ اور ان کے ذریعے بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے۔ یہی سیکھنا اگر کھیلوں کے ذریعے کیا جائے تو وہ سیکھ تاعمر اور پختہ ہوگی۔ ہم کھیلوں کے ذریعے بچوں میں مندرجہ ذیل مختلف صلاحیتوں کو ابھار سکتے ہیں:

...... مشاہدہ
...... سننا
...... مراسلہ (ترسیل)
...... لکھائی
...... مصوّری

کیونکہ ہمارا طریقۂ تدریس فرسودہ ہے جس کی وجہ سے استاد کا پڑھایا ہوا 70 فی صد سے زیادہ بچوں کے سر سے گزر جاتا ہے۔ استاد کچھ کہتا ہے بچے کچھ اور سنتے ہیں۔ پھر وقت کی کمی کی وجہ سے ان کی غلطیاں بھی درست نہیں ہو پاتی ہیں۔ جب ہم بچوں کو کھیل کے ذریعے سکھاتے ہیں تو وہ جلدی سیکھتے ہیں۔ کھیلتے وقت بچے ایک گروپ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور یہ گروپ سماجی نظام کی شکل میں کام کرتا ہے۔ اسکول کو سماج کا چھوٹا روپ کہا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے سیکھنے کا عمل حقیقی زندگی سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ کھیل کو حقیقی زندگی سے جوڑنے کے لیے استاد کو فراخ دلی اور کھلے دماغ سے کام لینا چاہیے۔

کچھ فلسفیوں جیسے نیل، ہالٹ، فلپ وغیرہ نے بچوں کے جذبات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسے اسکولوں پر زور دیا جہاں سیکھنے کی آزادی ہو، بچوں کو عزت بخشی جائے اور احساس کمتری کے جذبے سے دور رکھا جائے۔ ایسے اسکولوں میں سیکھنے کی خواہشات کو ابھارا جائے اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس سے سیکھنے میں مدد ملے اور جماعت میں ایک ایسا ماحول قائم کر دیا جائے جہاں بچہ نہ ختم ہونے والی خواہشات کا تصور کر سکے اور اسے سیکھنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔ ان کی رہنمائی کی جائے اور ان کے راستے میں آنے والی ہر مشکل کو دور کیا جائے۔ جماعت میں ایسا ماحول کھیلوں کے ذریعے تعلیم سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ کھیلوں سے تحریک پیدا ہوتی ہے اور شاید ہی کوئی ایسا بچہ ہوگا جو کھیلوں سے بیگانہ ہوگا کیونکہ کھیل ان کی فطرت کے مطابق ہوتے ہیں اس لیے سیکھنے کا عمل خود بہ خود شروع ہو جاتا ہے۔

فروبیل، مانٹیسری، ٹیگور وغیرہ نے کھیلوں کے ذریعے تعلیم کو بہت اہمیت دی ہے۔ چھوٹے چھوٹے کھیلوں کے ذریعے بچوں کی ذہنی، سماجی، ادبی، جسمانی، جذباتی نشوونما کی جا سکتی ہے اور بچوں کی شرکت کی بنا پر لامحدود خوشیاں میسر کی جا سکتی ہیں۔ محرکات کی نشوونما کے ذریعے سیکھنے کے عمل کو عملی طور پر یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

■

Muhammad Qamar Saleem
Associate Professor
Flat No. 3, Atmashanti CHS, Plot No. 33
Vashi-Navi Mumbai. 400703. (MS)

قیام نیر

فن خاکہ نگاری اور سعادت حسن منٹو کا خاکہ

خاکہ کو انگریزی میں پن اسکیچ (Pen Sketch) کہا جاتا ہے۔ یہ لاطینی لفظ Schediom سے ماخوذ ہے جس کا لغوی معنی Extempore یعنی فی البدیہہ ہے۔ انگریزی میں اسے دو طرح سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایف اسکاٹ کے مطابق:

"A short musical or dramatic play.

A brief , descriptive article"

(بحوالہ سعادت حسن منٹو۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری، ص 240)

اردو میں بھی خاکہ لفظ کے اعتبار سے انھی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ صنف ادب کے لحاظ سے خاکہ ایک ایسے بیانیہ مضمون کو کہا جاتا ہے جس میں شخصیت کے لوازم سے تحریری تصویر بنائی گئی ہو۔ پروفیسر رئیس فاطمہ کے مطابق:

''خاکہ یا مرقع نگاری ایک مشکل فن ہے کیونکہ شخصی خاکہ مضمون سے علاحدہ ایک صنف ہے، جس میں وہ شخصیت اپنے خد و خال کے ساتھ پوری طرح جلوہ گر ہو جس پر قلم اٹھایا گیا ہو۔ یعنی لکھنے والا اپنی فکر سے مطلوبہ شخصیت کا مرقع اس طرح کھینچے کہ وہ پڑھنے والے کے سامنے زندہ ہو جائے۔''

(منٹو کی خاکہ نگاری۔ رئیس فاطمہ مشمولہ ''روشنائی'' کراچی، منٹو نمبر، جنوری تا مارچ 2013، ص 95)

اردو میں اس کا عکس بہت پہلے سے نظر آتا ہے۔ اس کے چند نقوش قدیم تذکروں میں مل جاتے ہیں۔ نثار احمد فاروقی نے ''دریائے لطافت'' کو اردو خاکے کی روایت کے آغاز کا ابتدائی عکس قرار دیا ہے لیکن یہ بنیادی طور پر فارسی زبان میں ہے۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے خاکہ نگاری کی باضابطہ ابتدا کی تھی لیکن دوسرے تحقیق کار نے اس دعوے کو بھی تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ 'آب حیات' میں خاکوں سے زیادہ سوانحی رجحانات ہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ 'آب حیات' اردو ادب میں سوانح اور خاکے کی درمیانی کڑی ہے۔

مولوی عبدالحق نے 1900 میں 'منشی امیر احمد صاحب مرحوم' اور 'پروفیسر مرزا حیرت' کے عنوان سے دو خاکہ نما مضمون لکھ کر خاکے کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ڈپٹی نذیر احمد پر 1927 میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے 'نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا۔ اس میں فن خاکہ نگاری کے بیشتر لوازمات موجود ہیں۔

خاکہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس پر خاکہ لکھ رہا ہے اس کی خوبیوں اور خامیوں سے پوری طرح آگاہ ہو ساتھ ہی اس کے ذہن سے بھی آشنائی رکھتا ہو۔ علی ثنا بخاری کی اس بات سے پوری طرح اتفاق کیا جاسکتا ہے:

''موضوع کی بھرپور عکاسی کے لیے خاکہ نگار کے پاس ماہر مصور کا قلم ہونا چاہیے۔ یہی خصوصیات سوانح عمری اور خاکہ نگاری میں حد فاصل قائم کرتی ہے۔ اس لحاظ سے خاکہ ایک ایسا سوانحی مضمون ہوتا ہے جس میں کسی شخص کے داخلی و خارجی محرکات، کردار، حرکات و سکنات، ماحول، افتاد طبع، میلانات، عقائد و اعمال اور رجحانات کی مجمل مگر جامع تصویر شگفتہ اسلوب میں پیش کی گئی ہو۔''

(سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر علی ثنا بخاری، ص 243)

مختصر یہ کہ خاکہ موضوع سے براہ راست تعلق کے بعد ہی لکھا جاسکتا ہے۔ اردو میں اس صنف میں جو عظیم فن پارے سامنے آتے ہیں ان کے لکھنے والوں کو موضوع سے براہ راست گہرا تعلق رہا ہے۔

اردو ادب میں جدید ترین خاکے عصمت چغتائی نے لکھے ان کا لکھا ہوا خاکہ 'دوزخی' بے حد مقبول ہوا۔ عصمت نے منٹو کا شخصی خاکہ بھی لکھا لیکن وہ 'دوزخی' کے مقابلے بھی کمزور رہا۔ منٹو نے بھی خراج تحسین کے طور پر سب سے پہلا خاکہ عصمت چغتائی ہی پر لکھا۔

سعادت حسن منٹو کے خاکوں کے دو مجموعے 'گنجے فرشتے' (1952) اور 'لاؤڈ اسپیکر' (1955) شائع ہوئے ہیں۔ ان میں کل 22 خاکے شامل ہیں۔ انھوں نے کل 26 خاکے لکھے۔ ان میں 'میرا صاحب'، 'عصمت چغتائی'، 'منٹو'، 'تین گولے'، 'پری چہرہ نسیم بانو'، 'نور جہاں'، 'ستارہ دیوی'، 'پارو دیوی' اور 'پراسرار نیناں' بے حد مقبول ہوئے۔

سعادت حسن منٹو ایک ایسے ادیب تھے جسے کوئی مصلحت سچائی لکھنے سے نہ روک سکی۔ انھوں نے جو دیکھا اسے کاغذ پر اتار دیا۔ احمد عقیل روبی کے مطابق:

''منٹو کے خاکے انسانوں کے خارجی اور باطنی مطالعے ہیں۔ اس نے انسانوں کو باہر سے دیکھا اور پھر بے دھڑک ان کی ذات کے اندھے کنویں میں اتر گیا۔ کنکر، پتھر، موتی، کیچڑ جو ملا لے کر باہر آگیا اور سب کچھ

کرداروں کے چہرے پر مل دیا...''

(منٹو کی خاکہ نگاری، عقیل احمد روبی مشمولہ سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ، ڈاکٹر انیس ناگی، ص 240)

منٹو کے خاکے نظریات کے اظہار کی وجہ سے طویل ہو جاتے ہیں لیکن اس اظہار بیان کی وجہ سے فنی خاکہ نویسی کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ ان کے فن میں رمزیت، اشاریت، تجسس کے ساتھ ساتھ دلکشی اور دلنشینی بھی ہوتی ہے۔ وہ خاکہ لکھتے وقت نہ تو مدح سرائی کرتے ہیں اور نہ ہجو گوئی بلکہ اپنے خاکوں میں حقیقت نگاری کو فن کی بنیاد بناتے ہیں۔ وہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

''میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شیمپو نہیں، کوئی گھونگر پیدا کرنے والی مشین نہیں — میں بناؤ سنگار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی۔ اس کے منہ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔ میراجی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ بر خود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے — اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے، اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔''

(گنجے فرشتے، سعادت حسن منٹو، ص 348، بحوالہ 'فکر و تحقیق' دہلی (منٹو نمبر) جولائی، اگست، ستمبر 2012)

سعادت حسن منٹو نے دوسروں پر بہت سے خاکے لکھے لیکن خود اپنے اوپر بھی ایک خاکہ بعنوان 'منٹو' لکھا ہے۔ جب میں نے پہلی بار ان کا یہ خاکہ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی کتاب 'منٹو اور مزاح' میں پڑھا۔ تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دوسروں پر طنز و مزاح کرنے والے اپنے اوپر طنز کے تیر بھی چلا رہے ہیں اور مزاح کی پھلجھڑی بھی چھوڑ رہے ہیں۔ دوسروں کے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا قدرے آسان ہے لیکن اپنے کے بارے میں پوری ایمان داری کے ساتھ حقیقی زندگی کو سامنے رکھ کر کہنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ منٹو نے یہ کر دکھایا ہے:

''میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے۔ اس لیے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل رہا ہے۔'' (منٹو)

منٹو نے دوسروں پر لکھے گئے خاکوں میں اپنی سوانح ڈال دی ہے تو بھلا اپنے اوپر لکھا گیا خاکہ اس عمل سے کیسے بچ سکتا تھا:

''ہم اکٹھے پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے، اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے اسی لیے میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نبھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہو گئی ہے۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ منٹو ایسا ون ٹو آدمی تو میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا جسے اگر جمع کر دیا جائے تو تین بن جائے۔'' (منٹو)

خاکہ نویسی میں تصویر کشی ضروری ہے۔ خاکہ نویس جتنی نمایاں اور واضح تصویر بنائے گا پڑھنے والا اتنا ہی موضوع سے آگاہی حاصل کرے گا۔ سعادت حسن منٹو نے اس باریکی کا خیال رکھتے ہوئے اپنی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

''اس نے انٹرنس کا امتحان دو بار فیل ہو کر پاس کیا تھا، وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں اور آپ کو یہ سن کر بھی حیرت ہوگی کہ وہ اردو کے پرچے میں ناکام رہا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اردو کا بہت بڑا ادیب ہے اور میں یہ سن کر ہنستا ہوں اس لیے کہ اردو اب بھی اسے نہیں آتی۔ وہ لفظوں کے پیچھے یوں بھاگتا ہے جیسے کوئی جعلی شکاری تتلیوں کے پیچھے....اس کی لٹھ بازی عام محاوروں کے مطابق جاٹوں کی لٹھ بازی نہیں ہے۔ وہ بنوٹ اور پھکیت ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا بلکہ تنے ہوئے رسے پر چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا، اب گرا.....لیکن وہ کمبخت کبھی نہیں گرا۔'' (منٹو)

سعادت حسن منٹو خاکہ نگاری میں نفسیاتی ژرف بینی کو اولیت دیتے ہیں۔ وہ دل کے اندر جھانک کر دیکھتے ہیں اور اصلیت کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ کہیں کہیں تو نفسیاتی تجزیے سے انھوں نے اتنا کام لیا ہے کہ ماہر نفسیات نظر آنے لگے ہیں۔ اپنے اوپر لکھے گئے خاکہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اب میں اس کے اسکول کی زندگی کی طرف آتا ہوں۔ بہت ذہین لڑکا تھا اور بے حد شریر۔ اس زمانے میں اس کا قد زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین فٹ ہوگا۔ وہ اپنے باپ کا آخری بچہ تھا۔ اس کو اپنے ماں باپ کی محبت تو حاصل تھی لیکن اس کے تین بڑے بھائی جو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے اور ولایت میں تعلیم پا رہے تھے، ان سے ان کو کبھی ملاقات کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے کہ وہ سوتیلے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں۔ اس سے بڑے بھائی ایسا سلوک کریں لیکن یہ سلوک اسے اس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی۔

اچھا اب اس کی افسانہ نگاری کے متعلق سنیے! وہ اول درجے کا فراڈ ہے۔ پہلا افسانہ اس نے بعنوان 'تماشا' لکھا جو جلیانوالا باغ کے خونیں حادثے سے متعلق تھا۔ یہ اس نے اپنے نام سے نہ چھپوایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پولیس کی دست برد سے بچ گیا۔'' (منٹو)

خاکہ نگاری میں منفرد اسلوب کی ضرورت ہے۔ ان کے خاکے عام طور پر افسانوی اسلوب لیے ہوئے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ منٹو کے خاکوں کا انجام بھی افسانوی انداز کا ہوتا ہے۔ وہ قاری کو چونکا دینے والے انداز میں اپنے خاکوں کو ختم کرتے ہیں:

''وہ ان پڑھ ہے، اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔ ہیگل کا وہ صرف نام ہی جانتا ہے۔ ہیولک ایلس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ......میرا مطلب ہے تنقید نگار یہ کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مفکروں سے متاثر ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، منٹو کسی دوسرے شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے چغد ہیں۔ دنیا کو سمجھانا نہیں چاہیے۔ اس کو خود سمجھنا چاہیے۔

میں آپ کو پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ منٹو، جس پر فحش نگاری کے سلسلے میں کئی مقدمے چل چکے ہیں، بہت طہارت پسند ہے لیکن میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک ایسا پا انداز ہے جو خود کو جھاڑتا پھٹکتا رہتا ہے۔'' (منٹو)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سعادت حسن منٹو نے نہ صرف دوسروں پر خاکے لکھے ہیں بلکہ اپنے آپ کو بھی خاکہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ اگر وہ افسانہ کے بجائے زیادہ توجہ خاکہ نگاری پر دیتے تو افسانے کی طرح خاکہ نگاری میں بھی وہ اتنے ہی مشہور ہوتے جتنا کہ افسانوں کی وجہ سے ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ منٹو اردو کا ایک بڑا خاکہ نگار ہے۔ اپنے آپ پر لکھا گیا خاکہ 'منٹو' خاکہ نگاری کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔

■

Dr. Qayam Nayyar
At/P.O.: Bardaha, Via: Kamtaul
Dist: Madhubani, Bihar, Pin: 847304
Mob: 09973743606

عابد سہیل کی خاکہ نگاری

فیروز عالم

عابد سہیل کی شناخت ایک صحافی، افسانہ نگار اور نقاد کے طور پر تو مسلّم ہے ہی وہ ایک بہترین خاکہ نگار بھی تھے۔ 'کھلی کتاب' اور 'پورے، آدھے ادھورے' کے نام سے ان کے خاکوں کے دو مجموعے منظر عام پر آئے۔ ان خاکوں کو جس نے بھی پڑھا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان خاکوں کی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر انھیں اردو کے اہم خاکہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ خاکے پہلی سطر سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ عابد سہیل نے اپنے خاکوں کی بنیاد صداقت، حسن سلوک، حقیقت اور معروضیت پر رکھی ہے۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اس لیے بہت ممکن تھا کہ ان کے خاکوں میں تخیل اور مبالغہ در آئے لیکن انھوں نے بڑی خوبی سے ان سے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔ البتہ افسانوی فن سے انھوں نے جو چیز اپنے خاکوں کے لیے لی ہے وہ ہے پُر اثر انداز بیان۔ ان کے خاکوں کو پڑھتے وقت بعض اوقات افسانے کا گمان ہوتا ہے کیونکہ ان میں اس قدر روانی اور دلکشی ہوتی ہے کہ قاری ایک مرتبہ پڑھنا شروع کرے تو ختم کیے بغیر اسے چین نہیں آتا۔ بعض اوقات ان کے خاکوں میں جذباتی انداز بھی ملتا ہے لیکن یہ ان اشخاص پر لکھے ہوئے خاکے ہیں جن سے عابد سہیل کا گہرا جذباتی تعلق رہا ہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں کسی کا عیب بیان کرنے یا کمیاں تلاش کرنے کی بجائے شخصیت اور کردار کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر خاکے ایسے لوگوں پر لکھے ہیں جو اپنے وقت کی عبقری شخصیات تھیں، اور جن سے انھیں قربت حاصل رہی۔ ان میں ڈاکٹر عبدالعلیم، آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن، ایم چلپت راو (روزنامہ 'نیشنل ہیرالڈ' کے ایڈیٹر، جو اپنی اصول پسندی اور ایمانداری کے لیے مشہور تھے اور وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو ان کے دوست اور مداح بھی تھے)، اسرار الحق مجاز، سید احتشام حسین، مسعود حسن رضوی ادیب، شوکت صدیقی اور قمر رئیس خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ عابد سہیل نے اردو کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور ہندی ادب اور دیگر میدانوں سے تعلق رکھنے والے افراد پر بھی دلچسپ خاکے تحریر کیے ہیں۔

عابد سہیل کے خاکوں کے پہلے مجموعے 'کھلی کتاب' میں چودہ شخصی خاکوں کے علاوہ ایک خاکہ لکھنؤ کے اولڈ انڈیا کافی ہاؤس کا بھی ہے جو اس وقت کے لکھنؤ کی تہذیبی اور علمی زندگی کا بہترین مرقع ہے۔ اس کتاب میں آنند نرائن ملا، احمد جمال پاشا، وجاہت علی سندیلوی، عشرت علی صدیقی (جو حیات اللہ انصاری کے بعد 'قومی آواز' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔)، نسیم انہونوی، راجیش شرما (ہندی شاعر)، مقبول احمد لاری اور ڈاکٹر عبدالحلیم (ڈاکٹر عبدالعلیم کے بیٹے) کے خاکے بھی شامل ہیں۔ دوسرے مجموعے 'پورے، آدھے ادھورے' میں طویل و مختصر 25 خاکے ہیں۔ ان میں احسن فاروقی، اسرار الحق مجاز، سید سبط محمد نقوی، سریندر کمار مہرا،

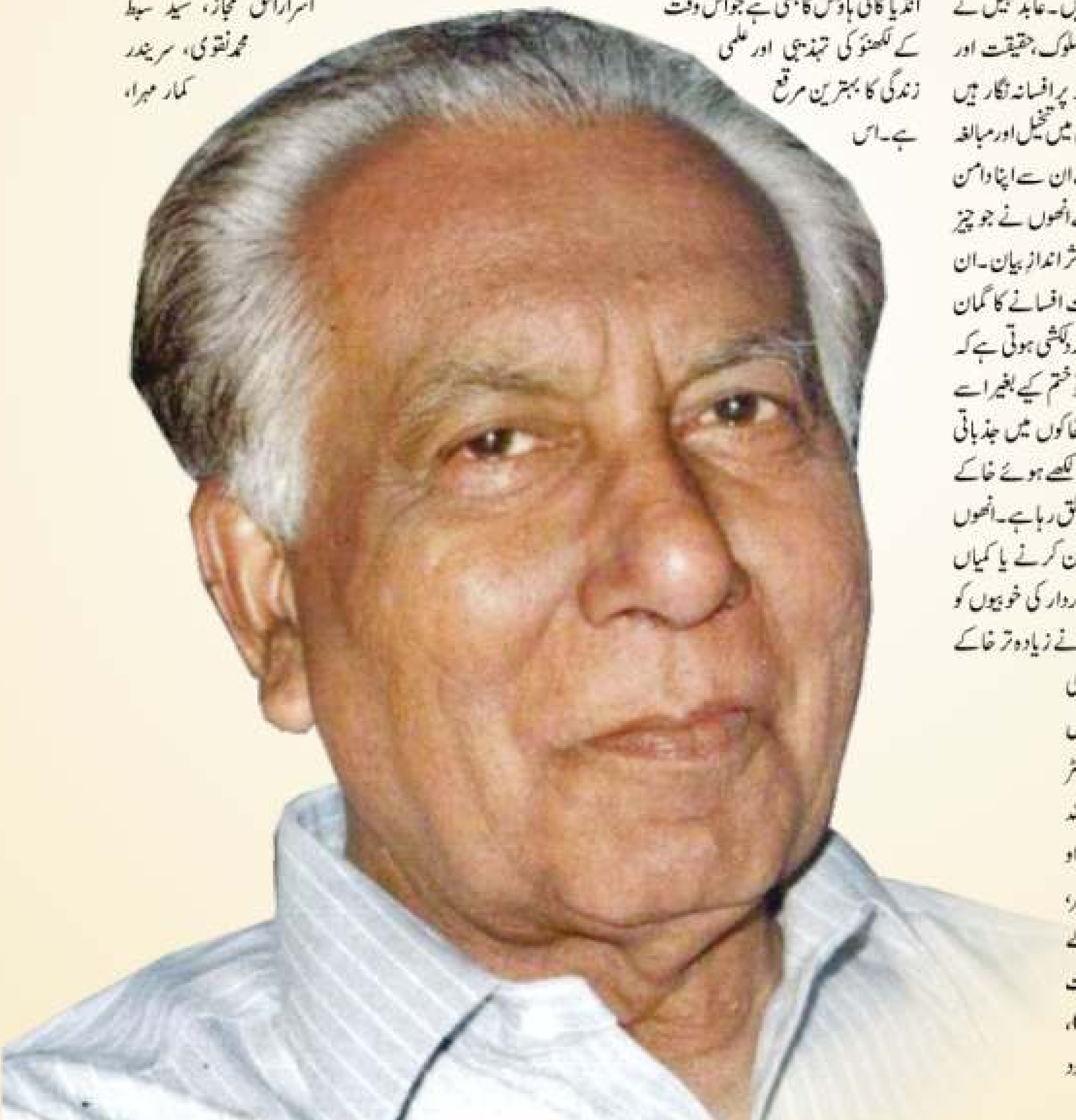

سلامت علی مہدی، شمس الرحمٰن فاروقی، شوکت صدیقی، صباح الدین عمر، قمر رئیس، قیصر تمکین، کیفی اعظمی، محمد حسن، نیر مسعود اور 'ماہنامہ کتاب' پر تحریر کردہ خاکے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اور ان شخصیات کے ذہن و مزاج اور احوال و کوائف سے بخوبی واقف کراتے ہیں۔

عابد سہیل کے یہ خاکے سوانحی نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں ممدوحین کے کارناموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ خاکہ نگار نے ممدوح کو جیسا دیکھا اور محسوس کیا ہے، کاغذ پر اس کی تصویر اتارنے کی سعی کی ہے۔ یہ تصویریں اتنی جاندار اور موثر ہیں کہ متعلقہ شخصیات اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہیں اور ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم انھیں برسوں سے جانتے ہیں۔

ان خاکوں میں اس دور کا لکھنؤ مجسم ہو گیا ہے۔ اس دور کی تہذیب و ثقافت، سیاست و صحافت اور علمی و ادبی محفلوں کا آنکھوں دیکھا حال عابد سہیل نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ شوکت صدیقی پر لکھے گئے خاکے میں اس عہد میں کتابوں کی دکانوں اور مختلف اہل علم افراد کے گھروں میں منعقد ہونے والی ادبی محفلوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان دنوں کافی ہاؤس اور انجمن کے جلسوں کے علاوہ جو سرور صاحب کے بیرو روڈ کے مکان پر ہونے لگے تھے، شہر میں ادیبوں کے جمگھٹ کے دو مرکز اور بھی تھے، ایک تو یہی نظیر آباد کا 'کتابی دنیا' اور دوسرا امین آباد کا 'دانش محل'۔ اول الذکر کی رونق تھے سلام مچھلی شہری، کمال احمد صدیقی، منظر سلیم، 'جہنم سے ایک خط' نام کے افسانے سے راتوں رات مشہور ہو جانے والے کامریڈ شکیل، مجید پرویز، برجموہن ناتھ کاچرو وغیرہ اور بزرگوں میں ڈاکٹر احسن فاروقی جن کا ناول 'شام اودھ' ان دنوں تخلیق کے مراحل سے گزر رہا تھا........دانش محل میں احتشام حسین، ڈاکٹر وحید مرزا، شجاعت علی سندیلوی، کشن پرشاد کول، احتشام صاحب، کبھی کبھی علیم صاحب اور سرور صاحب اور بعد کے دنوں میں خلیل اللہ خاں خلیل شام میں اکثر آتے۔ سچ پوچھیے تو 'مکتبہ جامعہ' کی شاخ کے خاتمے کے بعد شہر میں ادبی کتابوں کی سب سے بڑی دکان یہی تھی۔''[1]

عابد سہیل کے خاکوں میں زیادہ تر شخصیات کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ لکھنؤ جو علم و ادب اور تہذیب کا گہوارہ رہا ہے اور آزادی کے بہت بعد تک اس کی صالح اقدار و روایات معدوم نہیں ہوئی تھیں۔ ان خاکوں میں پیش کیے جانے والے افراد اور ان کے ارد گرد کے لوگوں (ان میں مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی) میں اعلیٰ اور ارفع قدروں

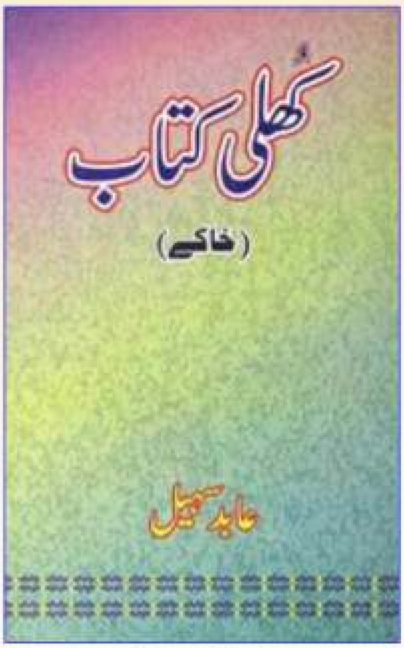

کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دھوپ چھاؤں خود خاکہ نگار کی زندگی کا سرمایہ بھی ہے۔ 'کھلی کتاب' کے خاکوں میں عموماً اور اولڈ انڈیا کافی ہاؤس میں خصوصاً اس تہذیب کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ ان میں لکھنوی تہذیب، لوگوں کا رہن سہن، آپسی رشتے، بڑوں کا احترام، چھوٹوں سے شفقت، آداب گفتگو، آداب نشست و برخاست، بحث و مباحثہ اور شعر و سخن کی زندہ تصویریں موجود ہیں۔

'کھلی کتاب' کے پیش لفظ میں عابد سہیل خاکہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خاکہ نگار کو 'مانگے کے اجالے' میں خود کو موثر کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور اس کے لیے اپنی نام نہاد ہمہ دانی اور خوبیوں کے اظہار سے اجتناب برتنا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنف کے علم اور تجربہ کی بنیاد پر کوئی شخصیت خاکہ نگار کو 'فرشتوں جیسی' معلوم ہوتی ہو تو اس کے اظہار میں صرف اس لیے بخل برتنا کہ اسے غلط سمجھا جا سکتا ہے، شاید مناسب نہیں۔ لیکن کمزوریوں کے بیان میں کسی قدر احتیاط ضروری ہے، کیونکہ اول تو یہ کہ شک کے فائدے سے کسی کو محروم رکھنا ہرگز مناسب نہیں اور دوسرے یہ کہ شاید عیبوں کی کھتونی پر روشنائی صرف کرنے کا مشکل ہی سے کوئی جواز پیش کیا جا سکے۔''[2]

عابد سہیل نے مذکورہ بالا اقتباس میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کو پیش نظر رکھ کر ان خاکوں کا مطالعہ دلچسپ ہوگا۔ انھوں نے اپنے ممدوحین کی خوبیوں کے ذکر میں کنجوسی سے کام نہیں لیا ہے اور ان کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں سے اغماض برتا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے ان خاکوں کو مکمل مداحی بنا دیا ہو۔ انھوں نے بعض افراد کی کمزوریوں کی طرف نازک اشارے بھی کیے ہیں۔ انھوں نے ممدوحین کی خوبیاں براہ راست انداز میں بیان کرنے کی بجائے واقعات اور ان کے اعمال کے ذریعے اجاگر کی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم، چلپت راو، عشرت علی صدیقی، احمد جمال پاشا اور راجیش شرما پر لکھے گئے خاکے اس کی بہترین مثال ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے علیم صاحب کی انسان دوستی اور خدمت خلق کے جذبے کا اندازہ ہوتا ہے۔

''انتقال کے بعد ان کی میز پر عربی زبان و ادب سے متعلق کئی مضامین کے خاکوں کے علاوہ ایک لفافہ ملا جس پر مکتوب الیہ کا نام و پتہ درج تھا۔ خط کے ساتھ ایک خاصی بڑی رقم کا ڈرافٹ پن کیا ہوا تھا۔ لیکن وہ خط نہیں ملا جس کا جواب یہ تھا۔

علیم صاحب نے لکھا تھا۔

'مجھے نہ تمھارا نام یاد ہے نہ شکل و صورت، نہ یہ یاد ہے کہ میں نے تمھاری یا کسی طالب علم کی کبھی کوئی مدد کی۔ بفرض محال تمھاری مدد کی بھی گئی تو اس کی جزا کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ رقم واپس کر دی جائے بلکہ مناسب یہ ہوگا کہ تم دوسروں کے ساتھ وہ سلوک کرو جو تمھارے ساتھ دوسروں نے کیا۔ تمھارا ڈرافٹ منسلک ہے۔''[3]

ڈاکٹر عبدالعلیم عابد سہیل کے رشتے کے ماموں تھے۔ عابد سہیل ان کی شخصیت اور علم و دانش سے بہت متاثر تھے۔ وہ ایک طرح سے ان کے آدرش معلوم ہوتے ہیں۔ اس خاکے میں فطری طور پر جذباتیت در آئی ہے لیکن یہ عیب نہیں، اس کا حسن ہے، کیونکہ اس سے حقیقت اور واقعیت کا رنگ مزید گہرا ہو گیا ہے۔

ایم چلپت راو، حیات اللہ انصاری اور عشرت علی صدیقی کے خاکوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں صحافت کا کیا معیار تھا اور صحافیوں کے لیے یہ پیشہ کتنا مقدس تھا۔ وہ کس قدر بااصول اور دیانت دار لوگ تھے۔ ایم چلپت راو نے جنھیں ایم۔ سی۔ کے نام سے جانا جاتا تھا، اپنے اخبار میں کانگریس پارٹی کی غلط پالیسیوں پر بھی اداریے لکھے اور یہ احساس دلایا کہ صحافی کے لیے ایمانداری، حق گوئی اور ملک و قوم کی خدمت کی بنیادی اہمیت ہے اور پارٹی کی اہمیت ثانوی۔ ایم سی کے اس طرح کے ایک اداریے کی شکایت جب پنڈت نہرو سے کی گئی تو ان کا جواب تھا کہ ''نیشنل ہیرالڈ ایم سی کا اخبار ہے۔ میں اس

میں مداخلت نہیں کرسکتا۔'' پنڈت نہرو کے انتقال کے بعد ایم سی کی دیانت داری اور اصول پسندی کی قدر کرنے والا کوئی نہ رہا اور ان کی بے حد ناقدری ہوئی۔ ان کی موت دہلی کے ایک ڈھابے میں ہوئی جہاں انھیں پہچاننے والا بھی کوئی نہ تھا۔ یہ انجام تھا اس عظیم صحافی کا جس کے اداریوں کی گونج اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں بھی سنائی دیتی تھی۔ نیشنل ہیرالڈ میں ملازمت سے قبل عابد سہیل نے ادبی اور فلسفیانہ موضوعات پر لکھنا شروع کردیا تھا۔ اخبار کی پالیسی کے مطابق ادارے کا کوئی رکن کسی دوسرے اخبار یا رسالے میں نہیں لکھ سکتا تھا۔ انھوں نے ایم سی سے ادب اور فلسفہ پر مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھنے کی اجازت مانگی تو انھوں نے لکھا: "Yes Abid, you may continue to write on literary and philosophical subjects, but I hope you will sell the articles, not yourself." اس اصول پر ایم سی خود بھی تا حیات کاربند رہے۔ گورنر ہاؤس سے عشائیے کا دعوت نامہ آیا جس میں بیوی کے ساتھ ڈنر سوٹ میں آنے کی درخواست تھی۔ ایم سی نے دعوت نامے پر یہ لکھ کر لوٹا دیا کہ نہ ان کی بیوی ہیں اور نہ ان کے پاس ڈنر سوٹ ہے۔ دراصل وہ نام ونمود اور شہرت سے دور بھاگتے تھے۔ گوپالا ریڈی جو ایم سی کے بچپن کے دوست تھے، یوپی کے گورنر بن کر آئے تو انھوں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن ایم سی کسی نہ کسی بہانے سے ٹالتے رہے۔ آخر جب اصرار بڑھا تو ایم سی نے گورنر ہاؤس جانے کی دو شرطیں رکھیں۔ پہلی یہ کہ راج بھون نیوز (جو اس زمانے میں ہر روز انگریزی اخباروں کا مستقل کالم ہوتا تھا اور جس میں گورنر سے ملاقات کرنے والوں کے بارے میں اطلاع شائع ہوتی تھی) میں اس ملاقات کی خبر نہیں آئے گی اور دوسری یہ کہ انھیں لانے اور واپس پہنچانے کے لیے سرکاری گاڑی نہیں آئے گی۔ چنانچہ دونوں شرطیں مان لی گئیں اور ایم سی رکشہ سے گورنر ہاؤس گئے۔

حیات اللہ انصاری کے خاکے سے پتہ چلتا ہے کہ صحافت سے سماج کا کتنا اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔ حیات اللہ انصاری کا اپنے ہی ایک اداریے کے خلاف اپنے ایک جونیئر اسٹاف کا خط شائع کرنا ان کی عظمت کی بھی دلیل ہے اور صحافت کے اصولوں کی پاسداری کی آئینہ داری بھی۔

عشرت علی صدیقی ایک کل وقتی صحافی تھے۔ صحافت کے علاوہ انھیں اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ قومی آواز (جس کے وہ ایڈیٹر بھی رہے تھے) ان کی رگ رگ میں اس طرح بسا ہوا تھا کہ ایک دن انھوں نے خواب میں دیکھا کہ اخبار کے دفتر میں آگ لگ گئی ہے تو بھاگے بھاگے وہاں چلے آئے۔ یہ تھی ان کی اپنے اخبار سے محبت۔ وہ زبان کے معاملے میں بے حد حساس تھے اور لفظ کے غلط استعمال پر بہت ناراض ہوتے۔ قومی آواز میں ایک صاحب تھے۔ ان کی عادت یہ تھی کہ جس بات کے لیے منع کیا جاتا وہ ضرور کرتے۔

''متین صاحب...... '' عشرت صاحب بائیں کان کے اوپر اور ٹوپی کے نیچے سر کھجاتے ہوئے کہتے۔ ''آپ سے کتنی بار کہا کہ 'مہلوک' کوئی لفظ نہیں ہے۔ لیکن آپ ...... آج بھی وہ مقامی خبروں میں ہے۔''4

مقبول احمد لاری لکھنؤ کے ثروت مند لوگوں میں سے تھے۔ وہ اکثر ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہتے تھے۔ شاعروں اور ادیبوں سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ عابد سہیل نے جو طویل عرصے تک ان سے بدظن رہے، اپنے خاکے میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ اردو زبان و ادب سے ان کی دلچسپی اور ادیبوں کے ساتھ ان کے ہمدردانہ سلوک کا ذکر خاکہ نگار نے نہایت خوبصورتی سے کیا ہے۔

عابد سہیل نے شخصی کمزوریوں پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے لیکن چند مقامات پر یہ کمزوریاں نرالے انداز میں سامنے آئی ہیں۔ مزاح نگار احمد جمال پاشا کے انتہا پسند رویے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بعض معاملات میں جمال انتہاؤں پر کاربند رہتے ہیں۔ کسی کی تعریف کرنے پر آئیں گے تو اسے حسن یوسف، ید بیضا، دم عیسیٰ اور ہر ممکن خوبی سے متصف کردیں گے اور کسی سے ناراض ہوں گے تو کون سا عیب ہے جو اس میں تلاش نہ کرلیں گے۔ بے پر کی اڑائیں گے تو ایسی کہ بڑے سے بڑا داستان گو بھی پانی نہ پائے اور اگر جھوٹ پکڑ جائے تو فوراً معافی مانگ لیں گے۔''5

''اولڈ انڈیا کافی ہاؤس'' ایک یادگار خاکہ ہے جس میں گذشتہ لکھنؤ کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ کافی ہاؤس شہر کے مشاہیر شاعروں، ادیبوں، دانش وروں، مفکروں اور مصوروں کا مرکز تھا جہاں ہرایرے غیرے کو آنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہاں سیاست، ثقافت، ادب اور فن غرض ہر موضوع پر گفتگو ہوتی، زوردار بحثیں ہوتیں لیکن ایک حد کے اندر، جس سے باہر جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ وہاں بیٹھنے والوں میں ڈی پی مکھرجی، آل احمد سرور، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، سید احتشام حسین، یشپال، ڈاکٹر ویر بہادر سنگھ، ڈاکٹر عبدالعلیم، امرت لال ناگر، محمد حسن، آرائین ہشت (مشہور آرٹسٹ)، ایم۔ چلپت راو، شوکت صدیقی، مجاز، سلام مچھلی شہری، رضیہ سجاد ظہیر، ایاز انصاری، کمال احمد صدیقی، مُنیب الرحمٰن، منظر سلیم، سید محمد جعفر، عابد سہیل، مدرا راکشش، وِدیا ساگر اور قیصر تمکین جیسی ہستیاں شامل تھیں۔ آزادی سے قبل یہاں پنڈت نہرو، کے ڈی مالویہ، رفیع احمد قدوائی اور اندر کمار گجرال بھی آتے تھے۔ عابد سہیل کے لفظوں میں:

''معلوم نہیں کافی ہاؤس میں ایسی کیا خوبی تھی کہ ہر پڑھا لکھا شخص یا ہر وہ شخص جو خود کو پڑھا لکھا ظاہر کرنا چاہتا تھا یا سمجھتا تھا، وہاں ضرور آتا تھا۔.......... اب کافی ہاؤس کی دنیا بدل چکی ہے۔ سارے چراغ ایک ایک کرکے بجھ چکے ہیں۔.......... شاعروں، ادیبوں اور مصوروں سے لکھنؤ آج بھی خالی نہیں لیکن علم و ادب اب عبادت نہیں رہ گئے ہیں، ذریعۂ معاش اور اعزازات اور انعامات کے حصول کا وسیلہ بن گئے ہیں۔.......... کافی ہاؤس نام کو اب بھی موجود ہے، اپنی شکست کی آواز بنا ہوا۔''6

عابد سہیل کا اسلوب دلکشی، روانی اور سادگی سے عبارت ہے۔ انھیں زبان پر دسترس حاصل ہے اور وہ بے حد خوبصورت اور رواں نثر لکھتے ہیں۔ ان کی نثر نہ صرف لفظوں کے برمحل استعمال کی وجہ سے پُرلطف ہوگئی ہے بلکہ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ان لفظوں میں معنی کے مختلف ابعاد پوشیدہ ہیں۔ ان کی نثر پختہ اور شگفتہ ہے۔ وہ کبھی کبھی مکالماتی انداز بھی اختیار کرتے ہیں۔ ان کی زبان موضوع اور ماحول سے ہم آہنگ ہے۔ بعض جگہوں پر تخلیقی نثر کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں۔

''علیم صاحب نے خاموشی کو خوش بیانی کا اعجاز بخشا تھا۔ بڑے سے بڑا غم، بڑی سے بڑی خوشی، ان کے پاس سے مؤدب گزر جاتے تھے۔''7

اس ایک جملے میں خاکہ نگار نے ڈاکٹر عبدالعلیم کی شخصیت کا نچوڑ پیش کردیا ہے۔

احمد جمال پاشا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''......ادیبوں کی ایک ادا بھی تو اسے نہیں آئی...... نہ چہرے پر سنجیدگی کی مصنوعی چادر، نہ گفتگو میں تصنع، نہ بڑے بڑے ادیبوں کے الٹے سیدھے حوالے، نہ فلسفہ، نہ حکمت، نہ فرد کی تنہائی، نہ تنہائی کا فرد۔ لیکن یہ سب کچھ چاہے اسے نہ آیا ہو، مزاح نگار ہے وہ چوکھا۔''8

منظر سلیم کے متعلق ان کا خیال ہے:

''لوگ زندگی میں کامرانیاں حاصل کرنے کے بعد ان سیڑھیوں کو بھول جاتے ہیں بلکہ گرا دیتے ہیں جن کے

سہارے وہ بلندیوں تک پہنچتے ہیں۔لیکن منظر سلیم نہ اپنی مفلسی کے دنوں کو بھولے تھے اور نہ ان لوگوں کو جنھوں نے ان کے ذہنی اور علمی افق کو روشن کیا تھا۔''9

اختصار اور جامعیت عابد سہیل کے خاکوں کی ایک اور اہم خصوصیت ہے۔وہ غیر ضروری تفصیل میں کبھی نہیں جاتے بلکہ کبھی کبھی تو صرف اشارہ کر دیتے ہیں۔لیکن ان اشاروں کی مدد سے ہی وہ شخصیت کے تمام گوشوں پر سے پردے اٹھا دیتے ہیں۔حیات اللہ انصاری کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ کٹر کانگریسی تھے اور کمیونسٹوں کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان پر خاکہ پڑھنے کے بعد ہمیں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔انھوں نے 'قومی آواز' میں بہت سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا تھا جن کا تعلق بائیں بازو سے تھا۔اسی طرح آنند نرائن مُلّا کے خاکے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک انتہائی منصف مزاج جج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت نرم دل اور ہمدرد انسان تھے۔ڈاکٹر عبدالعلیم، چلپت راو، حیات اللہ انصاری، آنند نرائن ملا اور عشرت علی صدیقی جیسے اصول پسند، وسیع النظر اور مثالی شخصیات کے بارے میں ہم کبھی نہ جان پاتے اگر یہ خاکے نہ لکھے گئے ہوتے۔

دروں بینی اور انسانی نفسیات سے عابد سہیل کو ابتدا سے دلچسپی رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے زیادہ تر خاکوں میں انسان کے اندرون میں جھانکنے کی کوشش ملتی ہے۔احمد جمال پاشا، ایم سی، عبدالعلیم، راجیش شرما اور منظر سلیم کے خاکوں میں ان کے باطن کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

جزئیات نگاری ان خاکوں کی ایک اور خوبی ہے جو انھیں موثر بناتی ہے۔خاکہ نگار کی تیز نگاہ چھوٹی چھوٹی بظاہر غیر اہم چیزوں کو بھی دیکھ لیتی ہے۔ان سے خاکے کا اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔ایم سی کی چپل کے فیتے جو ہمیشہ کھلے رہتے تھے، آنند نرائن ملا کی سفید شیروانی، سفید ٹوپی، چوڑی دار پاجامہ، اور ان کی انگلیوں میں گھومتا ہوا کار کی چابی کا چھلا یا عشرت علی صدیقی کا بار بار کان کے اوپر اور ٹوپی کے نیچے سر کھجانے کا ذکر نہایت دلچسپ ہیں۔ایم چلپت راو کے بارے میں عابد سہیل لکھتے ہیں:

''گردن جھکائے، پتلون کی جیبوں میں اس طرح ہاتھ ڈالے جیسے وہ اسے سنبھالے ہوئے ہوں، ایم سی شاید اپنے جسم کے بوجھ کے سبب دھیرے دھیرے چلتے تو ان کی چپل کے فیتے جو ہمیشہ کھلے رہتے، ایک عجیب سی آواز پیدا کرتے۔''10

عابد سہیل نے اپنے خاکوں میں صاحب خاکہ کی مکمل شخصیت ہمارے سامنے پیش کردی ہے۔انھوں نے

اختصار اور جامعیت عابد سہیل کے خاکوں کی ایک اور اہم خصوصیت ہے۔وہ غیر ضروری تفصیل میں کبھی نہیں جاتے بلکہ کبھی کبھی تو صرف اشارہ کر دیتے ہیں۔لیکن ان اشاروں کی مدد سے ہی وہ شخصیت کے تمام گوشوں پر سے پردے اٹھا دیتے ہیں۔حیات اللہ انصاری کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ کٹر کانگریسی تھے اور کمیونسٹوں کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان پر خاکہ پڑھنے کے بعد ہمیں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔انھوں نے 'قومی آواز' میں بہت سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا تھا جن کا تعلق بائیں بازو سے تھا۔اسی طرح آنند نرائن مُلّا کے خاکے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک انتہائی منصف مزاج جج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت نرم دل اور ہمدرد انسان تھے۔

سوانحی حالات بیان کرنے کی بجائے شخصیات کا ادراک کرایا ہے۔بعض اوقات وہ جذباتیت کا شکار بھی ہوئے ہیں خصوصاً ایم سی، ڈاکٹر عبدالعلیم اور احمد جمال پاشا کے خاکوں میں، لیکن یہ ناگزیر تھا کیوں کہ وہ ان کے بے حد قریب رہے ہیں اور جس سے قربت ہو، اس کا ذکر آنے پر جذباتی ہو جانا فطری ہے۔

احسن فاروقی پر لکھا گیا خاکہ اگرچہ مختصر ہے لیکن ہے دلچسپ۔اس کے مطالعے سے بطور استاد اور بحیثیت ایک انسان کے احسن فاروقی کی شخصیت کی خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں۔احسن فاروقی اردو کے ادیب اور انگریزی کے استاد تھے اور ان دونوں حیثیتوں میں نہایت کامیاب۔وہ انگریزی شاعری پڑھاتے تھے اور ان کا طریقۂ تدریس اس قدر دلکش تھا کہ ان کی کلاس میں دوسرے سیکشن کے طلبہ بھی آکر بیٹھ جاتے تھے۔ڈانٹ پھٹکار کی بجائے وہ محبت اور خلوص سے طلبہ کی تربیت کرتے تھے۔ہر طالب علم کا مسئلہ ان کا ذاتی مسئلہ بن جاتا تھا اور اسے حل کیے بغیر انھیں چین نہیں آتا تھا۔امتحان کے زمانے میں ان کے گھر میں طالب علموں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

''امتحان بہت قریب آجاتے تو فاروقی صاحب کا والا قدر روڈ کا مکان طلبہ کا مہمان خانہ بن جاتا۔دس پندرہ لڑکے ہر شام وہاں موجود رہتے۔ہر گھنٹے دو گھنٹے پر اندر سے چائے بن کے آتی اور ڈاکٹر فاروقی ان دس بارہ دنوں میں انگریزی کے سارے کورس کی ایک ایک اہم بات بتا دیتے۔بتا کیا دیتے گھونٹ کے پلا دیتے۔''11

'پورے، آدھے ادھورے' کے زیادہ تر خاکوں میں وہ لطف و اثر نہیں ہے جو 'کھلی کتاب' کے خاکوں کی خصوصیت ہے۔اس میں چند ہی خاکے ایسے ہیں جو قاری کے ذہن پر دیرپا نقوش چھوڑ پاتے ہیں۔خود عابد سہیل کو بھی اس کا احساس تھا۔شاید اسی لیے انھوں نے اس کا عنوان 'پورے، آدھے ادھورے' رکھا۔پیش لفظ میں انھوں نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے:

'پورے، آدھے ادھورے' شاید ویسی نہیں جیسی 'کھلی کتاب' تھی۔اصل سبب اس کا یہ ہے کہ اچھا برا پہلے جیسا لکھ لیتا تھا ویسا بھی اب بس میں نہیں رہ گیا ہے۔لیکن ایک سبب اس کا اور بھی ہے۔اب شاید ایسا کچھ، جس کے لیے جان کی بازی لگائی جائے یا جیا ہی جائے، بہت تھوڑا بچ رہا ہے۔افسوس، اب انسان بینک بیلنس کے پیمانوں سے تولے جاتے ہیں۔بینک بیلنس یا اس کے جتن سے کہیں انسان بنتے ہیں، زندہ رہ جانے والے کردار تشکیل پاتے ہیں، شخصیتیں ابھرتی ہیں؟''12

سلامت علی مہدی پر تحریر کردہ خاکہ اس مجموعے کے چند بہترین خاکوں میں ایک ہے جس میں اس زندہ دل اور زمانہ شناس انسان کی شخصیت کے تمام گوشے اجاگر ہو گئے ہیں جو حد درجہ بدصورت تھا لیکن اپنی خوش گفتاری اور ذہانت کی وجہ سے ہر محفل میں چھا جاتا تھا۔یاروں کا یار تھا اور اس ہنر سے خوب واقف کہ کس کو بیوقوف بناتا ہے اور کس کی مدد کرتی ہے۔اپنے مخالفین سے کیسے بدلہ لینا چاہیے، سلامت علی مہدی اس گر سے خوب واقف تھے۔سترہ اٹھارہ صفحات پر مشتمل یہ خاکہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔عابد سہیل کے افسانوی مجموعے 'جینے والے' میں شامل افسانے 'نہ دھوپ نہ سایہ' کا مرکزی کردار سلامت علی مہدی سے متاثر ہو کر ہی تشکیل دیا گیا تھا۔خاکے کے اختتام پر عابد سہیل نے ان کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ممدوح کے تئیں ان کے دلی جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''خدا سلامت علی مہدی کے گناہوں کو معاف اور ان کی نیکیوں کو ان پر حاوی کردے۔ساتھ میں ایک التجا اور بھی ہے کہ ان ایسا ایک آدھ کبھی کبھی ضرور بھیج دیا کرے کہ وجود کائنات میں رنگ بھرنے میں ایسوں کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور ایسا نہ ہوا تو ایک دن یہ دنیا ایک فیس (لیس) بک اور ٹوئٹر بن جائے گی اور مسجدوں میں ہر روز بم پھٹنے لگیں گے۔''13

مذکورہ بالا خاکوں کے علاوہ اس مجموعے میں شامل احسن فاروقی، اسرار الحق مجاز، سید سبط محمد نقوی، سریندر کمار مہرا، سید احتشام حسین، شوکت صدیقی، صباح الدین عمر، قمر رئیس، قیصر تمکین محمد حسن اور کیفی اعظمی پر لکھے گئے خاکے دلچسپ بھی ہیں، ان کی شخصیت سے بھی واقف کراتے ہیں اور خاکہ نگاری کے اصولوں پر کھرے بھی اترتے ہیں۔

اخبار کے ساتھ ساتھ ادبی صحافت سے بھی عابد سہیل کا گہرا تعلق رہا ہے۔ انھوں نے 1962 سے 1975 تک کوئی پندرہ برس تک اردو کا اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ 'کتاب' اکیلے اپنے دم پر شائع کیا۔ خاکہ 'ماہنامہ کتاب' میں انھوں نے ان تمام دشواریوں اور مسائل کا ذکر کیا ہے جن سے عموماً اردو رسائل کی مدیران اور مالکان کو سابقہ پڑتا ہے۔ ماہنامہ 'کتاب' کے مجلس مشاورت میں احتشام حسین، حیات اللہ انصاری اور کچھ دنوں تک قمر رئیس اور سہیل عظیم آبادی بھی شامل رہے۔ اس میں سب سے

> اخبار کے ساتھ ساتھ ادبی صحافت سے بھی عابد سہیل کا گہرا تعلق رہا ہے۔ انھوں نے 1962 سے 1975 تک کوئی پندرہ برس تک اردو کا اپنی نوعیت کامنفرد رسالہ 'کتاب' اکیلے اپنے دم پر شائع کیا۔ خاکہ ' ماہنامہ کتاب' میں انھوں نے ان تمام دشواریوں اور مسائل کا ذکر کیا ہے جن سے عموماً اردو رسائل کی مدیران اور مالکان کو سابقہ پڑتا ہے۔

آخری نام عابد سہیل کا ہوتا تھا۔ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی خوب پذیرائی کی اور انھیں ادبی دنیا سے متعارف کرایا۔ اگرچہ عابد سہیل ترقی پسند تھے لیکن انھوں نے جدیدیت سے وابستہ قلم کاروں کی تخلیقات بھی تواتر سے شائع کیں۔ مخالف آرا کو بھی انھوں نے بغیر حذف وترمیم کے شائع کیا اور ادبی دیانت داری کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ وہ طویل عرصے سے نیشنل ہیرالڈ اور قومی آواز سے وابستہ تھے لیکن انھوں نے اشتہارات کے حصول کے لیے کبھی اس کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو رسالے کے لیے خاصے اشتہارات حاصل کر سکتے تھے اور خود ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ رسالے کو اپنے خون جگر سے سینچتے رہے اور پھر ایک وقت ایسا آیا جب مالی مشکلات کی وجہ سے رسالے کو جاری رکھنا ممکن نہ رہا اور اس طرح ایک تاریخ ساز رسالہ بند ہو گیا۔ یہ پہلا رسالہ تھا جس کے سالانہ خریداروں کو بقیہ رقم واپس دی گئی۔ بعد میں 'شب خون' نے بھی اس روایت کی پیروی کی۔ 'کتاب' میں عابد سہیل نے کبھی اپنی تصویر شائع نہیں کی۔ اس رسالے میں انھوں نے اپنی تحریریں بھی شاذ و نادر ہی شائع کیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اس رسالے کے مدیر کے طور پر ان کے عزیز دوست عبدالحلیم خاں کی ملازمہ کے بیٹے جمیل احمد کا نام چھپتا تھا۔ عابد سہیل چونکہ نیشنل ہیرالڈ میں زیر ملازمت تھے اس لیے وہ اپنا نام بطور مدیر نہ دے سکتے تھے۔ عام طور سے اس صورت حال میں مدیر کے طور پر لوگ اپنی بیوی یا بچوں کا نام دیتے ہیں لیکن عابد سہیل کو نام ونمود اور شہرت سے کیا غرض تھی۔ انھوں نے ادبی صحافت کی ایک ایسی مثال پیش کی جس پر چلنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ ''کتاب'' نے جو خاص نمبر شائع کیے ان کی دستاویزی اہمیت ہے۔ عابد سہیل ان خاص نمبروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان خاص نمبروں نے ادبی صحافت میں 'کتاب' کی دھوم ضرور مچادی لیکن الوداعی شمارہ کا راستہ بھی ہموار کر دیا۔ 'کتاب' کو اپنی ضخامت اور تعداد اشاعت کا بوجھ برداشت کرنے کے لیے اشتہارات کی حمایت حاصل نہ تھی اور ایک فرد واحد گھر پھونک کے تماشہ کر بھی رہا تھا اور اس کا تماشائی بھی تھا۔''14

عابد سہیل کے ان تمام خاکوں کے مطالعے سے خود ان کی شخصیت کے بہت سے اسرار کھلتے ہیں۔ ان کی دلنواز شخصیت کی تعمیر و تشکیل، خلوص، روشن خیالی، رواداری، ذہنی کشادگی، اعلیٰ ظرفی، اصول پسندی، انکسار، لیے دیے رہنے کا انداز، شہرت اور نام ونمود سے بے نیازی، بڑوں اور بزرگوں کے حد درجہ احترام، اپنی تہذیب وثقافت سے والہانہ لگاؤ، اردو زبان وتہذیب سے محبت، خودداری اور خود اعتمادی وغیرہ سے ہوئی ہے۔ ان خاکوں میں عابد سہیل کی شخصیت کی یہ خوبیاں خود بخود اجاگر ہوتی ہیں۔ حالانکہ انھوں نے شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی ہے کہ اپنا ذکر کم سے کم کریں۔ انسانیت کی جن اعلیٰ اقدار کو وہ دوسروں میں دیکھنے کے آرزومند ہیں ان کے بیشتر ممدوحین ان سے واقعتاً مالا مال تھے۔ خود عابد سہیل کی شخصیت بھی انھی خوبیوں سے عبارت ہے۔

عابد سہیل کے خاکوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جن لوگوں کو موضوع بنایا ہے ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو دلکش اور سادہ زبان میں روانی اور برجستگی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ اس ضمن میں شخصیت کے مثبت پہلوؤں کی عکاسی پر ان کی خصوصی توجہ رہی ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم، ایم چلپت راو، عشرت علی صدیقی، احمد

> عابد سہیل چونکہ نیشنل ہیرالڈ میں زیر ملازمت تھے اس لیے وہ اپنا نام بطور مدیر نہ دے سکتے تھے۔ عام طور سے اس صورت حال میں مدیر کے طور پر لوگ اپنی بیوی یا بچوں کا نام دیتے ہیں لیکن عابد سہیل کو نام و نمود اور شہرت سے کیا غرض تھی۔ انہوں نے ادبی صحافت کی ایک ایسی مثال پیش کی جس پر چلنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ "کتاب" نے جو خاص نمبر شائع کیے ان کی دستاویزی اہمیت ہے۔

جمال پاشا، راجیش شرما، اولڈ انڈیا کافی ہاؤس اور ماہنامہ 'کتاب' پر ان کے خاکے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ چلپت راو انگریزی کے صحافی تھے اور راجیش شرما ہندی کے شاعر اور اتر پردیش کے محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ میں جوائنٹ ڈائرکٹر۔ عابد سہیل نے ان پر جتنا پُر اثر خاکہ لکھا ہے ویسا شاید ہی انگریزی یا ہندی میں لکھا گیا ہو۔ ان خاکوں کی گوناگوں خصوصیات کی بدولت اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں عابد سہیل کو ایک اہم اور منفرد مقام حاصل ہے۔

حوالے:

1. پورے، آدھے ادھورے۔ صفحہ۔ 116
2. کھلی کتاب۔ صفحہ۔ 8
3. کھلی کتاب۔ صفحہ۔ 22
4. کھلی کتاب۔ صفحہ۔ 99
5. کھلی کتاب۔ صفحہ۔ 147
6. کھلی کتاب۔ صفحہ۔ 195,205,207
7. کھلی کتاب۔ صفحہ۔ 20
8. کھلی کتاب۔ صفحہ۔ 143
9. کھلی کتاب۔ صفحہ۔ 139
10. کھلی کتاب۔ صفحہ۔ 38
11. پورے، آدھے ادھورے۔ صفحہ۔ 22
12. پورے، آدھے ادھورے۔ صفحہ۔ 16
13. پورے، آدھے ادھورے۔ صفحہ۔ 89
14. پورے، آدھے ادھورے۔ صفحہ۔ 222

کتابیات:

1۔ کھلی کتاب: عابد سہیل، ناشر: مصنف 22 ایس پی، چتین وہار، سیکٹر۔ سی لکھنؤ 226024

2۔ پورے، آدھے، ادھورے: عابد سہیل، ناشر، عرشیہ پبلی کیشنز، دریا گنج، دہلی، 110002

Dr. Firoz Alam
Asst. Professor
Centre for Urdu Culture Studies,
Maulana Azad National Urdu University,
Gachibowli, Hyderabad, 500032 (TS)
Email: firozdde@gmail.com

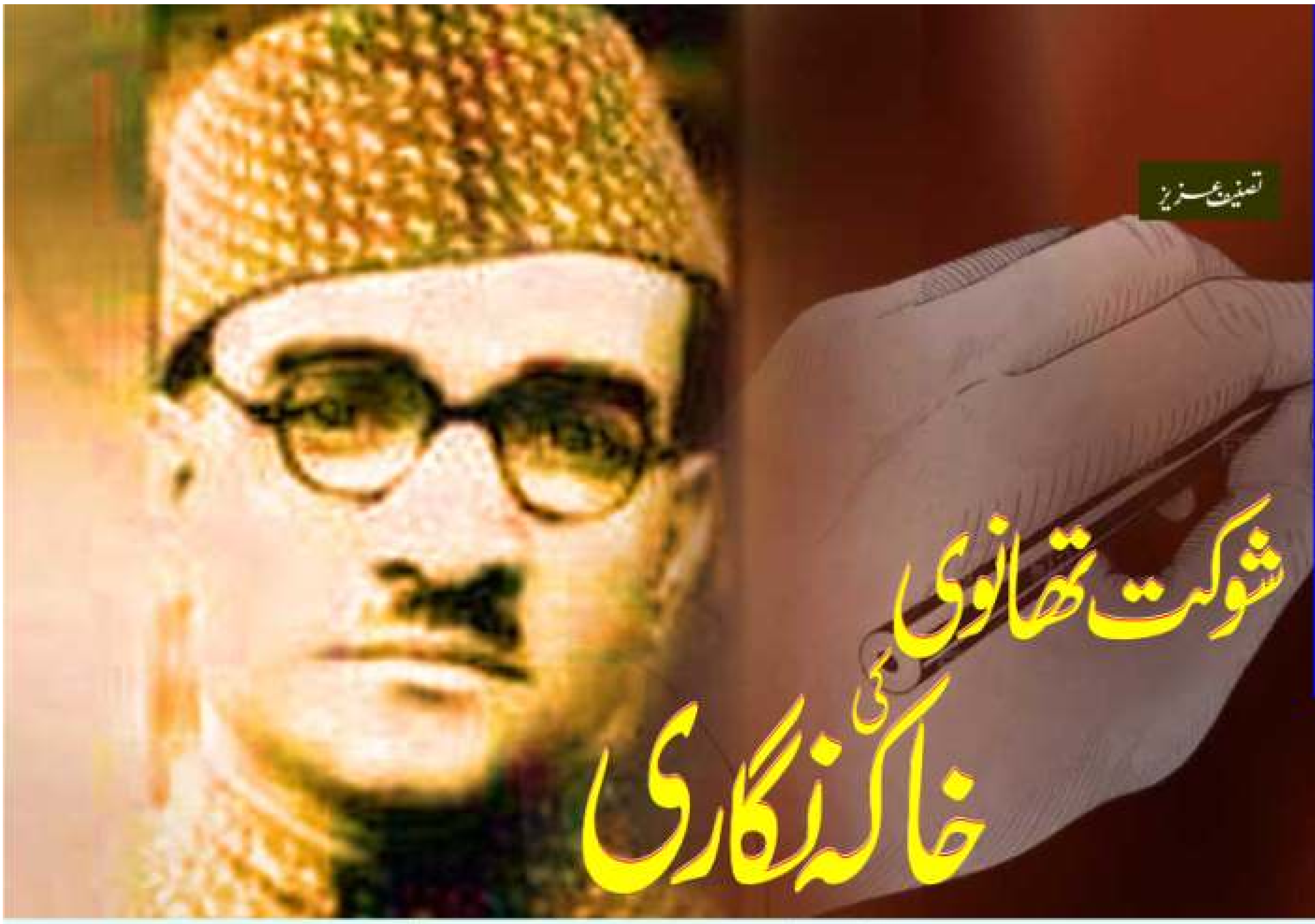

شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری

تصنیف عزیز

لغت میں خاکہ کے معنی ہیں وہ نقشہ جو صرف حدود کی لکیریں کھینچ کر بنایا جائے۔ اردو میں خاکے کے لیے بہت سی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں، مثلاً شخصی مرقع، قلمی تصویر، مرقع، وغیرہ۔ لیکن ادبی اصطلاح میں خاکہ سے مراد وہ تحریر ہے جس میں خاکہ نگار اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کی بنا پر کسی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نہایت مختصر انداز میں دلچسپ طریقے سے اس طرح پیش کرے کہ شخصیت کی چلتی پھرتی تصویر سامنے آجائے، اور ساتھ ہی اس میں افکار و خیالات کی جھلک بھی نمایاں ہو۔ یہی خاکہ نگاری کے فن کا امتیازی وصف بھی ہے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین اپنی کتاب 'صنفیات' میں خاکہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''صنف کی حیثیت سے خاکہ کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ مختصر الفاظ میں اشاروں کی مدد سے 'موضوع' کی ظاہری و باطنی شخصی رذاتی خصوصیات کا بیان کیا جائے، بالکل اسی طرح جیسے ایک مصور یا کارٹونسٹ اپنے موضوع کی نمایاں ظاہری شناختی صفات کو صرف لکیریں کھینچ کر روشن کر دیتا ہے۔''[1]

خاکہ کے ابتدائی نقوش 'محمد حسین آزاد' کے تذکرے 'آب حیات' (1880) میں نظر آتے ہیں، لیکن اسے باقاعدہ ایک صنف کے طور پر سب سے پہلے 'مرزا فرحت اللہ بیگ' نے فنی خوبیوں کے ساتھ برتا، اور اپنا قابل قدر نمونہ 'نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی' پیش کر کے خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ بعد میں خاکہ نگاری کی صنف کو اردو ادب کے بہت سے ادیبوں نے پروان چڑھایا۔ جن میں مولوی عبدالحق، ضیاء الدین احمد برنی، عبدالماجد دریابادی، عبدالمجید سالک، اعجاز حسین، رشید احمد صدیقی، خواجہ حسن نظامی، دیوان سنگھ مفتون، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، محمد طفیل، شوکت تھانوی، فکر تونسوی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

خاکہ نگاروں کی اس صف میں ایک اہم نام 'شوکت تھانوی' کا ہے، جو اپنے آپ میں ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا شمار اردو ادب میں ہندوستان و پاکستان کے بہترین اور بلند پایہ مزاح نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ شوکت تھانوی نے اردو ادب کی متعدد و متنوع اصناف میں طبع آزمائی کی اور بیک وقت ناول، افسانہ، مضمون، ڈرامہ، خاکہ، شاعری، اور صحافت تقریباً ہر صنف میں اپنے جادو نگار قلم کے جوہر دکھائے ہیں اور ان اصناف کو اپنے فلسفۂ حیات کے پیش کرنے اور لوگوں کو ہنسانے کا ذریعہ بنایا۔ شوکت تھانوی کی تخلیقات کی تعداد تقریباً 80 ہے۔

خاکہ نگاری میں شوکت تھانوی کے دو مجموعے ملتے ہیں پہلا 'شیش محل' جو 1943 میں شائع ہوا، دوسرا 'قاعدہ بے قاعدہ'۔ دونوں مجموعوں میں تمام شخصیتوں کے خاکے حروف تہجی کے تحت لکھے گئے ہیں ظرافت شوکت تھانوی کا مستقل فن ہے، لہٰذا اپنے اسی فن کی فنکاری سے انھوں نے 'شیش محل' کے نام سے ایک ایسا مجموعہ تیار کیا، جس میں 112 شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔ ان خاص و عام شخصیتوں کے خاکے، جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح ادب اور شوکت تھانوی دونوں سے رہا ہے۔ ان میں ادیب، شاعر، صحافی، ریڈیو ڈرامہ نگار اور ناشر وغیرہ شامل ہیں، جن سے شوکت تھانوی کے دوستانہ اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ عبدالماجد دریابادی 'شیش محل' کے تبصرے میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ قلمی نگار خانہ، یوں کہیے کہ ایک عجائب خانہ ہے، بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور کہ ان کا تعارف بھی ان کی توہین، بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف وتعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، بعض ایسے بھی ہیں جو سب کچھ ہیں، بعض ایسے جو کچھ بھی نہیں۔ ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی، ایسے بھی ہیں جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک چکے ہیں۔ غرض ریاض خیرآبادی، ڈاکٹر عبدالحق، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، سے لے کر

افقر موہانی، اُمید امیٹھوی اور صدیق تک ڈپوتک، ہر ردیف، ہر قافیہ، ہر وزن، ہر بحر کے نمونے اس دیوان میں ہیں۔'' 2

شوکت تھانوی زندہ دل اور خوش فکر انسان تھے۔ اپنی خوش مزاجی کے باعث احباب سے بے تکلف ہو کر ملتے۔ اسی بے تکلفی کی بنا پر شوکت تھانوی شخصیتوں کے ظاہر و باطن کی خوبیوں اور خرابیوں سے واقف ہوئے۔ غرض شوکت تھانوی نے اپنے حلقۂ احباب میں جن سے کافی عرصے تک تعلقات رہے اور اس کے علاوہ بعض ایسے اشخاص جن سے ان کی صرف چند مرتبہ ہی ملاقات رہی، سبھی کو جیسا دیکھا، سمجھا، ویسا ہی دیانت داری کے ساتھ پیش کیا۔ بقول وقار عظیم ''ادیبوں اور شاعروں سے ان کے مراسم کی نوعیتیں مختلف اور گوناگوں ہیں، شیش محل اور قاعدہ بے قاعدہ کے تقریباً سوا سو خاکے باہمی مراسم اور روابط کی انھیں مختلف گوناگوں شکلوں کے دلکش مرقع ہیں۔ یوں یہ خاکے ایک طرف تو اُردو کے سو سے زیادہ ادیبوں کی نجی اور ادبی حیثیت کا تعارف ہیں اور دوسری طرف بہ حیثیت مجموعی خود شوکت کی پسند و ناپسندیدگی کے معیاروں کے آئینے ہیں۔'' 3

شوکت تھانوی کی قوت متخیلہ جس طرح حساس اور دور رس تھی، ایسے ہی قوت مشاہدہ کی بنا پر ان کی نظر لوگوں کے واقعات زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو سمجھنے میں قدرے تیز تھی۔ خوش مذاقی چونکہ شوکت تھانوی کی طبیعت کا جز ہے اس لیے ان کی نظر لوگوں کے حلیے، ان کی بات چیت کے طریقے، طرزِ عمل، اور روزمرہ زندگی میں ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات کے مضحک پہلوؤں پر فوراً جا ٹھہرتی، جسے شوکت تھانوی نے دلچسپ پیرائے اظہار عطا کر کے خاکوں میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر:

آرزو لکھنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''صورت قطعاً غیر شاعرانہ، کلام سے نرے شاعر، خودگراں گوش اور کلام جنت گوش، اشعار میں ترنم اور پڑھتے ہیں تحت اللفظ۔ داد کے الفاظ مشکل سے سنتے ہیں۔ مگر سلام دونوں ہاتھوں سے کرتے ہیں ہم اگر ان کو مشاعرے میں نہ دیکھتے تو زیادہ سے زیادہ کوئی حکیم سمجھتے.. مشاعروں کے علاوہ.. آپ کو اس قدر سنجیدہ اور باضابطہ پایا کہ گویا نجی مراسم میں بھی آپ عروض کا ہر وقت خیال رکھتے ہیں کہ سنجیدگی کا کوئی رکن کہیں سے گرنے نہ پائے...'' 4

ایک اور مثال:

''صرف زبان سے نہیں سارے جسم سے شعر پڑھتے ہیں۔ نہ داد لینے کا ہوش ہوتا ہے، نہ داد کی رسید

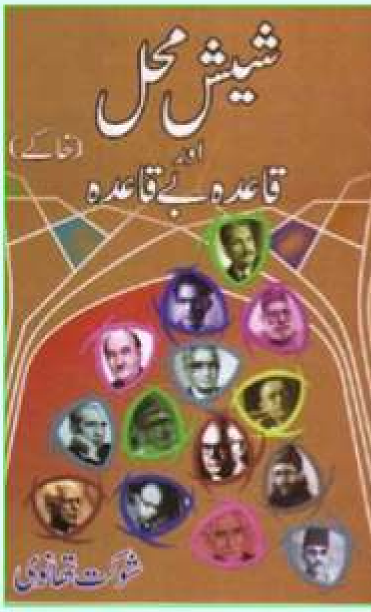

دینے کا۔ خود ہی جس شعر کو جی چاہتا ہے پچاس دفعہ پڑھ جاتے ہیں اور جس شعر کو جی چاہتا ہے ایک ہی مرتبہ پڑھ کر رہ جاتے ہیں۔'' 5

اختصار فنِ خاکہ نگاری کا امتیازی وصف ہے جو شوکت تھانوی کے مجموعے 'شیش محل' اور 'قاعدہ بے قاعدہ' میں بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن ان میں بیشتر خاکے ایسے مختصر ہیں کہ شخصیت پورے طور پر ابھر کر سامنے نہیں آسکی، بعض ایسے جو چند سطروں میں ختم ہو گئے اور صرف خاکے کا منصب ادا کرنے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمام تر خاکے مختصر سہی، لیکن دلکش ہیں جن کا مقصد قاری کے لیے ذہنی فرحت وانبساط کا سامان فراہم کرنا ہے۔ 'شیش محل' اور 'قاعدہ بے قاعدہ' میں بیشتر خاکوں کی جو نوعیت ہے وہ شخصی اور تعارفی حیثیت رکھتے ہیں، جنھیں شوکت تھانوی نے ذاتی مشاہدہ وتاثر کی مدد سے بیان کیا ہے۔ ان میں کہیں کہیں شخصیت کی تعریف وتوصیف میں مبالغہ آمیزی کا ہلکا سا رنگ ہے، کہیں تصویر کے مکمل ہونے میں ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن مشاہدے کی بنا پر کی گئی مصوری کے اس فن میں لفظوں کا عمل ساحرانہ ہے، جو قاری کے لیے مسرت وشادمانی کی خاص فضا قائم کرتا ہے۔ یہاں شوکت تھانوی لفظوں کی کاریگری سے لطیف مزاح پیدا کرنے میں بھی خاصے ماہر ہیں۔ مزاح کی یہ صورت، کبھی الفاظ کے الٹ پھیر سے، کبھی لفظ کی مناسبت سے نئے معنی ومفہوم لا کر، کبھی برجستہ محاوروں کے استعمال سے نمایاں کی ہے، جس کے عمدہ اور بہتر نمونے شیش محل اور قاعدہ بے قاعدہ میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:

''یہ زندہ اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں مگر مزاح نگاری نہیں کرتے تاکہ لوگ ترسیں اور اردو زبان خدانخواستہ اتنی ترقی نہ کر جائے کہ وہ انگریزی زبان بھی منہ دیکھتی رہ جائے، جس کے وہ مانے ہوئے ادیب ہیں وہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں سے پانی بھرواتے ہیں۔'' 6

''امتیاز علی ان کا نام ہے اور تاج تخلص، مگر شعر نہیں کہتے تاکہ تخلص خرچ نہ ہو جائے، اور تخلص اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ دنیا کا کیا بھروسہ نہ جانے کب شعر کہنا پڑ جائے۔'' 7

''لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر اکثر ملاقاتیں نصیب ہو جاتی تھیں نیا اور پرانا ادب تھوڑی دیر کے لیے درمیان سے اٹھ جاتا تھا اور بے ادبی کا خلوص دونوں طرف کارفرما نظر آتا تھا۔'' 8

ان مرقعوں میں شوکت تھانوی کے شخصیات سے ذاتی مراسم بھی صاف نظر آتے ہیں جس میں محبت وشفقت اور ہمدردی کے جذبے کے علاوہ کہیں کہیں طنز بھی ملتا ہے طنز بھی ایسے انداز اور شیریں الفاظ میں کہ خلش محسوس نہیں ہوتی۔ مثلاً اصغر گونڈوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شاعری پیشے کے طور پر نہیں تھی اور نہ شاعر کی حیثیت سے کبھی کوئی شعر کہا۔ بلکہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ جس شعر کے اعمال خداوند کریم کے نزدیک صالح ہوتے ہیں، اس کو اصغر سے کہلوا دیتا ہے۔ تمام نشاط روح اسی قسم کے خوش اعمال اشعار کی جنت ہے۔'' 9

امید امیٹھوی کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں:

''کلام استادانہ ہوتا ہے۔ فن کے ماہر ہیں مگر گفتگو کریں تو سمجھ میں نہ آئے۔ شعر خواہ کسی بحر کا ہو پڑھتے مثنوی کے انداز سے ہیں لے سمجھ میں آجاتی ہے۔ الفاظ سمجھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی گفتگو سمجھ لیتا ہے تو اس کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر شفقت میں ڈوبے ہوئے الفاظ فرما رہے ہیں۔ ورنہ عام طور پر گفتگو صرف یہ سمجھ میں آتی ہے کہ گویا لوٹا بھق بھق بھق کر کے کسی حوض میں ڈوب رہا ہے۔'' 10

احسن مارہروی کو ایک تقریب میں صافہ باندھے دیکھا تو بے ساختہ یوں پھبتی سے کام لیا:

''خدا کی قسم مولانا شبلی کے استقاء معلوم ہوتے ہیں آپ'' 11

شوکت تھانوی اصلاً مزاح نگار ہیں۔ ان کی قابلیت اور خداداد ذہانت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لفظوں کے مزاح میں شوکت تھانوی کے تخیل کی کارفرمائی اس وقت کمال کا درجہ رکھتی ہے۔ جب وہ بڑی سے بڑی شخصیت کو

چند کلمات میں سمیٹ لیتے ہیں۔ مثلاً

''یہ بابائے اردو مولانا عبدالحق ہیں۔ یہ ڈاکٹر بھی ہیں مگر علاج صرف اردو کا کرتے ہیں'' 12

''نام تو عظیم بیگ تھا مگر اس قدر کمزور اور دبلے پتلے تھے کہ نام پھبتی معلوم ہوتا ہے'' 13

شوکت تھانوی نے ان خاکوں میں کہیں کہیں شخصیتوں کی خصوصیات کو نہایت خوبصورتی سے نمایاں کیا ہے اور بعض جگہ مزاح کا پہلو پیدا کرنے کے لیے شخصیت کی خوبی کے الگ معنی بھی پیش کرتے ہیں۔ جو عام خیال سے منفرد ہوتا ہے۔ صوفی تبسم کی خصوصیت کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

''یہ کالج کے پروفیسر ہیں اور طالب علموں سے سر کھپانے کے بعد بھی اتنا دماغ اپنے لیے بچا لیتے ہیں کہ اکٹھی تین زبانوں کے شاعر ہیں اردو، فارسی اور پنجابی، تینوں زبانوں میں عمدہ شعر کہتے ہیں اور تین زبانوں کا شاعر ہونے کے باوجود بہت اچھے آدمی ہیں۔'' 14

'بابائے اردو' کی توجیہہ کی مثال:

''بابائے اردو اس لیے نہیں ہیں کہ اردو ان کی بیٹی ہے۔ البتہ جب یتیم ہوگئی تو مولوی عبدالحق نے اردو کو گود لے لیا۔ کہلائے صرف بابائے اردو، مگر سچ پوچھو تو اردو کو ماں اور باپ دونوں بن کر پالا اور اردو کے لیے اپنی زندگی تج دی'' 15

> **شوکت تھانوی نے ان خاکوں میں کہیں کہیں شخصیتوں کی خصوصیات کو نہایت خوبصورتی سے نمایاں کیاھے اور بعض جگہ مزاح کا پہلو پیدا کرنے کے لیے شخصیت کی خوبی کے الگ معنی بھی پیش کرتے ھیں۔ جو عام خیال سے منفرد ھوتا ھے۔**

شوکت تھانوی ادیبوں اور شاعروں کے فن پر ظرافت کے پیرائے میں تنقید اور موثر تبصرہ بھی کرتے ہیں جس کا مقصد قاری کے لیے تفریح و انبساط کا سامان کرنے کے ساتھ ساتھ ادیب یا شاعر کی شخصیت سے قاری کو مختصر طور پر متعارف کرانا ہے۔ 'صفی لکھنوی' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لکھنؤ کے سب سے بڑے اور ہندوستان کے بہت بڑے شاعروں میں سے ہیں۔ بڑائی کے لیے صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ عزیز لکھنوی مرحوم ایسے مستند استاد کے آپ استاد ہیں اور خود تلمیذ الرحمٰن..... صفی لکھنوی کے استادانہ کلام میں صرف 'داؤں پیچ' نہیں ہوتے بلکہ لطافت شگفتگی اور زندگی بھی ہوتی ہے۔ وہ بڑے سے بڑے ٹھوس مسئلے کو نہایت حسن کے ساتھ اپنے شعر میں پیش کر دیتے ہیں۔ تاکہ سننے والا اس بوجھ سے دب کر نہ رہ جائے بلکہ جھوم کر یہ بوجھ اٹھائے'' 16

مخدوم محی الدین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ترقی پسند شاعروں میں میرا سب سے محبوب شاعر مخدوم محی الدین ہے۔ نہایت بدصورت آدمی، لیکن اپنا کلام پڑھتے وقت مجھے بے حد حسین نظر آتا ہے... وہ ترقی پسند بن کر شاعر نہیں بنے ہیں۔ بلکہ شاعر تھے اور شاعری کو ساتھ لے کر ترقی پسند بنے ہیں.... مخدوم محی الدین میں رندانہ برجستگی، اور فنکارانہ لطافت نہایت سلیقہ کے ساتھ سموئی ہوئی موجود ہے۔ اور یہی ان کی انفرادیت کی روح ہے'' 17

شوکت تھانوی کے مرقعوں میں بے تکلف اور بے ساختہ مزاح کی یہ کچھ مثالیں ہیں جنھیں پڑھ کر شوکت تھانوی کی 'حس مزاح' اور قوت مشاہدہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں، کہ کس خوبی سے شوکت تھانوی نے شخصیتوں کی مختصر تصویر کشی میں لطیف مزاح، نکتہ آفرینی، لفظی بازیگری، فقرے بازی، اور پھبتی وغیرہ سے کام لیا ہے جس سے تحریر کی شگفتگی اور تصویر کی دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی مرقعوں کی کامیابی میں بھی۔ اس کے علاوہ زبان سادہ، سلیس اور صاف وشستہ ہے جو تکلف وتصنع سے یکسر پاک ہے۔ زبان کی یہی سادگی وشائستگی شوکت تھانوی کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ ان مرقعوں کا مقصد محض شاعر یا ادیب کی زندگی کے بعض دلچسپ پہلوؤں کو شگفتہ اور لطیف مزاح کے پیرائے میں اجاگر کرنا ہے تاکہ قاری محظوظ ہو سکے اور شوکت تھانوی اس میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

ہر چند کہ 'شیش محل' اور 'قاعدہ بے قاعدہ' میں شامل معروف و غیر معروف شخصیتوں کے مرقعے کسی مؤرخ یا سوانح نگار کے لیے اطمینان بخش نہ ہوں۔ پھر بھی ان مرقعوں میں شگفتہ تحریر، شوخ نگاری اور لطائف وظرائف کے جو عمدہ نمونے ملتے ہیں انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ اسلوب کی شگفتگی و برجستگی کے لحاظ سے اہم ہیں اور شوکت تھانوی کی ہمہ گیر شخصیت کا خاصہ بھی ہیں۔

حواشی:

1. قاضی افضال حسین، صفیات، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، طبع اوّل 2016، ص 219
2. ماخوذ از نقوش لاہور، شوکت نمبر، 1963، ص 38

> **ھر چند کہ 'شیش محل' اور 'قاعدہ بے قاعدہ' میں شامل معروف و غیر معروف شخصیتوں کے مرقعے کسی مؤرخ یا سوانح نگار کے لیے اطمینان بخش نہ ھوں۔ پھر بھی ان مرقعوں میں شگفتہ تحریر، شوخ نگاری اور لطائف وظرائف کے جو عمدہ نمونے ملتے ھیں انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ اسلوب کی شگفتگی و برجستگی کے لحاظ سے اھم ھیں اور شوکت تھانوی کی ھمہ گیر شخصیت کا خاصہ بھی ھیں۔**

3. ماخوذ از نقوش لاہور، شوکت نمبر، 1963، ص 41
4. شوکت تھانوی، آرزو لکھنوی مشمولہ شیش محل، اردو بک اسٹال، لاہور، بار اوّل 1943، ص 12
5. شوکت تھانوی، مجذوب مشمولہ شیش محل، اردو بک اسٹال، لاہور، بار اوّل 1943، ص 212
6. شوکت تھانوی، پطرس بخاری مشمولہ قاعدہ بے قاعدہ، نیو تاج آفس پوسٹ بکس، دہلی، س ن، ص 27
7. شوکت تھانوی، امتیاز علی تاج مشمولہ قاعدہ بے قاعدہ، نیو تاج آفس پوسٹ بکس، دہلی، س ن، ص 21
8. شوکت تھانوی، احتشام حسین مشمولہ شیش محل، اردو بک اسٹال، لاہور، بار اوّل 1943، ص 32
9. شوکت تھانوی، اصغر گونڈوی مشمولہ شیش محل، اردو بک اسٹال لاہور، بار اوّل 1943، ص 44
10. شوکت تھانوی، امید امیٹھوی مشمولہ شیش محل، اردو بک اسٹال لاہور، بار اوّل 1943، ص 51
11. شوکت تھانوی، احسن مارہروی مشمولہ شیش محل، اردو بک اسٹال، لاہور، بار اوّل 1943، ص 29
12. شوکت تھانوی، مولوی عبدالحق مشمولہ قاعدہ بے قاعدہ، نیو تاج آفس پوسٹ بکس، دہلی، س ن، ص 83
13. شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی مشمولہ شیش محل، اردو بک اسٹال، لاہور، بار اوّل 1943، ص 190
14. شوکت تھانوی، صوفی تبسم مشمولہ قاعدہ بے قاعدہ، نیو تاج آفس پوسٹ بکس، دہلی، س ن، ص 31
15. شوکت تھانوی، مولوی عبدالحق مشمولہ قاعدہ بے قاعدہ، نیو تاج آفس پوسٹ بکس، دہلی، س ن، ص 83
16. شوکت تھانوی، صفی لکھنوی مشمولہ شیش محل، اردو بک اسٹال لاہور، بار اوّل 1943، ص 171
17. شوکت تھانوی، مخدوم محی الدین مشمولہ شیش محل، اردو بک اسٹال، لاہور، بار اوّل، 1943، ص 20-219

■

Tasneef Aziz
Sarojni Naido Hall
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

عصمت کا تخلیقی سفر
ایک تحقیقی جائزہ

جمیل اختر

برصغیر کی ممتاز فکشن نگار قرۃ العین حیدر کا کہنا ہے کہ ''ہمارے اکثر ناقدین لکیر کے فقیر ہیں'' یہ بات انھوں نے اپنے اوپر کی جانے والی تنقید سے دل برداشتہ ہوکر کہی تھی اور اس لیے بھی کہ ایک ناقد نے شروع میں جو بات کہہ دی آنکھ بند کرکے بلا تحقیق کیے نسل در نسل سب دہراتے چلے گئے اور کسی نے بھی سچائی کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجتاً تنقید گمرہی کا شکار ہوتی چلی گئی۔ اس طرح کئی نسل کی تباہی کا سامان کرگئی۔ ہمارے ناقدین کو یہ بات شاید بری لگے لیکن سچائی یہی ہے جس سے ہم آنکھیں نہیں چرا سکتے۔

دراصل ہم لوگوں نے ادب میں کچھ بت بنا رکھے ہیں اور ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر بات پر آمنا وصدقنا کہہ دیتے ہیں۔ اپنے دماغ کے دریچے نہیں کھولتے اور بنی بنائی ڈگر پر چل پڑتے ہیں جس نے تحقیق وتنقید کے میدان میں ایک خلفشار وانتشار پیدا کر رکھا ہے اور سچائی ہم سے کوسوں دور ہے۔ تحقیق وتنقید کا معیار نقل در نقل کا ہوکر رہ گیا ہے۔ ہمارے اکثر ناقدین و محققین اپنے منصب سے عہدہ برآ ہونے کے بجائے اس کے وقار کو مجروح کر رہے ہیں۔ ادب کی کوئی بھی صنف ہو وقار واعتبار محال ہے۔

فکشن کا تو اور بھی برا حال ہے۔ پریم چند سے لے کر آج تک انتشار وخلفشار کی کیفیت ہنوز برقرار ہے۔ بہت سے تحقیق طلب امور بغیر کسی ثبوت وشہادت اور حوالے کے روز اول سے آج تک نقل در نقل ہو رہے ہیں اور تحقیق وتنقید دونوں اپنے منصب سے عہد برآ نہیں ہو رہی ہے۔ انتشار کی یہی صورت حال عصمت چغتائی کے یہاں بھی بنی ہوئی ہے۔ ان کے اولین افسانے کا سراغ ہمارے ناقدین و محققین اب تک نہیں لگا پائے۔ اب جب کہ عصمت کی صدی منائی جا رہی ہے ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں کل کھڑے تھے۔ عصمت پر خصوصی نمبر نکل رہے ہیں۔ نئی نئی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ مجموعے پر مجموعے شائع ہو رہے ہیں۔ جامعات میں کئی تحقیقی مقالے لکھے گئے کچھ مزید لکھے جانے ہیں۔ لیکن ان سب میں نیا مواد کہیں بھی شامل نہیں۔ ہر جگہ جو کچھ موجود ہے اُسی کو سامنے رکھ کر تحقیق بھی اپنے قد ابھار رہی ہے اور تنقید بھی۔ میں نے عصمت پر شائع ہونے والی بیشتر کتابوں کا جائزہ لیا ہے اور مجھے مایوسی ہوئی۔

میں عصمت چغتائی کی کلیات کے سلسلے میں گذشتہ کئی سالوں سے ان پر تحقیقی مشن میں لگا ہوں۔ اب تک بہت سے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھا ہے اور مشن کی تکمیل تک بہت سی نئی حصول یابیوں کی توقع ہے۔ میں نے عصمت کے بہت سے ایسے افسانے تلاش کرکے نکالے ہیں جو ان کے کسی بھی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ ان میں سے چند افسانوں کا ایک نیا مجموعہ 'گل دان' کے نام نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے 2013 میں شائع بھی کیا ہے۔ آج اس مجموعہ کو شائع ہوئے دو سال ہوگئے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ادبی افق پر اپنی حاضری درج کرانے والے ناقدین جو ہر کسی کی پیدائش اور موت پر اپنے قلم کی جولانی دکھانے سے باز نہیں آتے انھوں نے اس مجموعے کے مطالعے کی زحمت ہی نہیں اٹھائی یا انھیں اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عصمت پر لکھی جانے والی تنقید میں وہ اغلاط آج بھی اُسی صحت مند طریقے سے موجود ہیں جیسے پہلے تھیں۔ اردو افسانے کی روایت میں مرزا حامد بیگ نے 'بچپن' کو عصمت کی پہلی کہانی قرار دیا ہے۔ کتاب کے حجم اور ان کے نام سے مرعوب ہوکر اور لوگوں نے بھی اس بیان کو سچ مان لیا اور اسے دہراتے چلے گئے۔'' چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''پہلی کہانی 'بچپن' کے عنوان سے لکھی جو مئی 1938 میں ساقی میں شائع ہوئی۔ کچھ لوگ 'گیندا' کو پہلی کہانی مانتے ہیں۔ خود عصمت نے کئی انٹرویو میں کہا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اشاعت کے حوالے سے 'گیندا' ان کی

تیسری کہانی ہے دوسری کہانی 'نیرا' ہے۔

(علی احمد فاطمی: سہیل عصمت نمبر اداریہ ص 11)

عصمت چغتائی کا تخلیقی سفر عصمت چھاپ افسانہ 'گیندا' سے شروع ہو کر غیر عصمت چھاپ افسانہ 'ہندوستان چھوڑ دو' تک پہنچتا ہے۔''

(عصمت چغتائی: منظر پس منظر علی احمد فاطمی، سہیل عصمت نمبر مئی اگست 15، ص 98)

یہ دونوں اقتباس علی احمد فاطمی کے ہیں۔ ایک میں 'بچپن' اور دوسرے میں 'گیندا' کو اول افسانہ قرار دے رہے ہیں۔ تضاد کی اس صورت حال کو آپ کیا کہیں گے؟

پروفیسر سید محمد عقیل فرماتے ہیں:

''ان کا پہلا افسانہ 'فسادی' جنوری 1938 میں ساقی میں چھپا اور بعد کو 'کافر' 'خدمت گار' 'ڈھیٹ' اور 'بچپن' شائع ہوئے۔''

(عصمت چغتائی اور ان کے افسانے: سہیل گیا، عصمت نمبر، ص 183)

میں اس طرح کے غیر ذمے دارانہ اقتباسات سے اپنے مضمون کو بوجھل نہیں کرنا چاہتا۔ عصمت نمبر میں شائع تمام مضامین اور کتابوں میں یہی بیان من و عن نقل کیا گیا ہے۔ میں ہر کسی کی بات کا فرداً فرداً جواب نہ دیتے ہوئے صحیح صورت حال سے بیان کی طرف آتا ہوں تاکہ حقیقت آپ پر خود ہی روشن ہو جائے۔

عصمت چغتائی نے اپنا افسانوی سفر 1938 سے شروع کیا۔ ان کی پہلی کہانی 'ڈھیٹ' ہے جو ساقی دہلی مارچ 1938 میں شائع ہوئی۔ ساقی میں ہی اپریل 38 میں 'کافر'، مئی 38 میں 'بچپن'، اکتوبر 38 میں 'خدمت گار'، جون 39 میں 'نیرا'، اگست 39 میں 'اُف یہ بچے' اکتوبر 39 'پردے کے پیچھے' شائع ہوئیں۔ 1938 میں رسالہ ساقی کے علاوہ کسی دوسرے رسالے میں عصمت کی کہانی کے شائع ہونے کے کوئی شواہد نہیں ملتے۔ مارچ 38 سے اکتوبر 38 تک کل چار کہانیاں ساقی میں شائع ہوئیں۔

مارچ 38 سے دسمبر 1948 تک عصمت ساقی میں شائع ہوتی رہیں اور اس مدت میں عصمت کی کل 25 کہانیاں ساقی میں شائع ہوئیں اسی مدت میں ساقی کے علاوہ 'رفیق نسواں' لاہور اگست 39 میں 'لیوز'، نیا ادب لکھنؤ 39 میں 'گیندا' ادبی دنیا فروری 40 میں تاریکی، سالنامہ 40 میں 'شادی'، فروری 41 میں 'بیمار'، نومبر 41 میں 'تل' شائع ہوئیں۔ ادب لطیف سالنامہ 42 میں 'لحاف' افسانہ نمبر 45 میں 'حسین بی'، سالنامہ 46 میں معائنہ جولائی 46 میں لال چیونٹے شائع ہوئیں۔

1946 کے بعد عصمت کی کہانیاں آجکل دلی، شاہ راہ دہلی، نیا دور کراچی، نقش کراچی، نقوش لاہور وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد یعنی 70 اور 80 کے دہے میں ان کی کہانیاں سیپ کراچی، شمع، روبی، بانو، بیسویں صدی دہلی، شاعر بمبئی، الفاظ علی گڑھ، کتاب لکھنؤ، گفتگو بمبئی میں شائع ہوئیں۔ 80 کے بعد سے انتقال تک ان کی زیادہ تر کہانیاں صرف شمع، روبی، بانو اور بیسویں صدی دلی میں شائع ہوئیں۔ یہاں تک کہ ان کی 'آخری کہانی' بھی بیسویں صدی میں ان کے انتقال کے بعد جنوری 92 میں اسی عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

1938 سے 1992 تک عصمت چغتائی نے ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ایک سو پچاس سے زائد کہانیاں لکھی ہیں۔ ڈرامے اور دوسری غیر افسانوی تحریروں کو چھوڑ کر۔ لیکن عصمت پر اب تک کوئی ایسی تحقیق سامنے نہیں آئی جو ان افسانوں کی چھان پھٹک کر کے ان کی صحیح تقویمی ترتیب بنا سکتی اور لوگوں کے سامنے صحیح صورت حال پیش کر سکتی۔ تمام محققین اور ناقدین نے عصمت کے شائع شدہ افسانوی مجموعوں کو ہی تحقیق کی صحیح کنجی مان لی اور عصمت کی کل پونجی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جامعات میں کی جانے والی تحقیق میں بھی اسی پر مکمل بھروسہ کیا گیا اور تحقیق جو تلاش و جستجو اور نئی دریافت کا تقاضا کرتی ہے اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔

اب ان کے افسانوی مجموعوں کی طرف آیئے۔ عصمت کے معتبر چھ افسانوی مجموعے شائع ہوئے: کلیاں، چوٹیں، ایک بات، چھوئی موئی، دو ہاتھ، بدن کی خوشبو ایک اور مجموعہ 'آدھی عورت آدھی خواب' کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ اس طرح سات افسانوی مجموعے مستند مجموعوں کی فہرست میں شامل ہوں گے۔ باقی جتنے بھی مجموعے ہیں سب جعلی ہیں اور افسانوی الٹ پھیر کر کے بنائے گئے ہیں جس پر میں آگے گفتگو کروں گا۔ پہلے مستند مجموعوں کی طرف آتے ہیں۔

پہلا افسانوی مجموعہ 'کلیاں' ہے۔ 1940 میں ساقی بک ڈپو سے اور 1941 میں مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں کل 13 افسانے شامل ہیں۔ دوسرا افسانوی مجموعہ چوٹیں (1942) ہے اس میں 13 افسانے شامل ہیں۔

تیسرا افسانوی مجموعہ 'ایک بات' مکتبہ اردو ادب لاہور سے 1942 میں شائع ہوا۔ اس میں 9 افسانے ہیں۔ 'چھوئی موئی' (1952) میں 7 افسانے شامل ہیں۔ 'دو ہاتھ' (1952) میں 8 افسانے شامل ہیں۔ 'بدن کی خوشبو' میں 6 افسانے شامل ہیں، آدھی عورت آدھا خواب میں 6 افسانے شامل ہیں۔ اس طرح عصمت کے افسانوں کی کل تعداد 62 ہوتی ہے۔ یعنی 150 میں صرف 62۔

اب ذرا جعلی اڈیشنوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ ہندوستانی بازار میں تو نہیں لیکن پاکستانی بازار میں اس کی بھرمار ہے۔ ان کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق تیس سے زائد ہے اور 'عصمت کے سو افسانے' کے نام سے عصمت کی ایک کلیات بھی چار جلدوں میں بازار میں آئی ہے۔ پہلے یہ پاکستان میں شائع ہوئی ہندوستان میں کتابی دنیا دلی نے اسے شائع کیا ہے۔ اس میں ان تمام جعلی اڈیشنوں میں شائع نئے افسانوں کو ملا کر کلیات کی شکل دے دی گئی ہے لیکن کتنے صحیح افسانے ہیں کتنے غلط اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ کسی میں بھی حوالہ شامل نہیں ہے۔ تقریباً چالیس نئے افسانے اور پاکستانی پبلشروں کی بدولت ہمیں بہ آسانی دستیاب ہو گئے۔ اس کے لیے ہمیں ان پبلشروں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ منافع بازاری کے چکر میں وہ تحقیقی فریضے کی انجام دہی میں جانے انجانے طور پر شامل ہو گئے۔

چلیے کسی طرح کھینچ تان کر یہ تعداد سو تک تو پہنچی۔ ابھی تقریباً پچاس افسانوں کی تلاش کا مسئلہ ہنوز باقی ہے۔ ان پچاس میں سے 17 افسانے تو 'گلدان' میں میں نے شامل کر دیے۔ بارہ افسانے اور میں نے تلاش کر لیے ہیں۔ باقی میں سے زیادہ تر کا سراغ تو لگ گیا لیکن رسائل کی عدم دستیابی کی وجہ سے وہاں تک رسائی ابھی ممکن نہیں ہو سکی ہے۔ رسائی کے لیے وسائل کی بھی کمی ہے۔

مارچ 1938 سے دسمبر 1940 تک عصمت نے کل 19 افسانے تحریر کیے جن میں سے 13 کلیاں میں شامل کیے گئے اور بقیہ 6 افسانے اس مجموعے میں شامل نہیں ہوئے۔ 13 افسانوں میں 12 کے اشاعتی حوالے رسالوں سے دستیاب ہو گئے صرف 'بڑی شرم کی بات ہے' کا حوالہ ابھی نہیں مل سکا ہے۔ اسی طرح چوٹیں 1942 میں شائع ہوئی اس کے 13 افسانوں میں سے 'ساز' اور 'سفر میں' کے علاوہ سب کے حوالے دستیاب ہیں۔ ایک بات کے 9 افسانوں میں سے 4 کے حوالے دستیاب ہیں۔ ہیرو، جال، بیڑیاں، پیشہ، باورچی کے حوالے ابھی دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ 'چوٹیں' اور 'ایک بات' یہ دونوں مجموعے 1942 میں شائع ہوئے۔ 'چوٹیں' کی سنہ اشاعت پر مجھے شبہ نہیں لیکن 'ایک بات' کی سنہ اشاعت مجھے درست نہیں معلوم پڑتی۔ اس لیے کہ اس میں شامل دو افسانے ایک عنوان 'کتاب' 'ایک بات' ساقی جنوری 1943 اور 'ننھی سی جان' ساقی دسمبر 1943 میں شائع ہوئے۔ اگر یہ کتاب 1942 میں شائع ہوئی تو پھر دسمبر 1943 تک کے افسانے

اس میں کیسے شامل ہو سکتے ہیں۔ ان افسانوں کی موجودگی اس کی سنہ اشاعت پر سوالیہ نشان کھڑا کرتی ہے۔

پہلا افسانوی مجموعہ 'کلیاں' کی اشاعت اول زیادہ تر لوگوں نے ساقی بک ڈپو کے حوالے سے 1940 درج کی ہے۔ مرزا حامد بیگ نے 'اردو افسانے کی روایت' میں یہی سنہ درج کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ سنہ بھی درست نہیں ہے۔ سنی سنائی کا معاملہ معلوم پڑتا ہے اس لیے کہ اس میں دسمبر 1940 تک کے افسانے شامل ہیں۔ میں نے جب اس حقیقت کو جاننے کی کوششیں کی تو میرا شبہ صحیح نکلا۔ 1940 سے 1944 تک ساقی کے ایک ایک شمارے کی ورق گردانی سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ 'کلیاں' مکتبہ ساقی سے 1940 میں شائع ہی نہیں ہوئی۔ پھر حیرت ہے کہ یہ حوالے کہاں سے نقل ہوئے اور ہوتے چلے گئے۔ ساقی 1940 اور 1941 کے کسی بھی شمارے میں نہ 'کلیاں' کا اشتہار ملتا ہے نہ ہی اداریے میں نئی کتابوں کے ضمن میں اس کا ذکر ہے۔ جبکہ ہر نئی کتاب کی پیشگی اطلاع ساقی میں اشتہار کی شکل میں شائع ہوئی ہے اور اداریے میں ذکر بھی ہوتا رہا ہے۔ چھان بین کرنے پر ساقی سالنامہ جنوری 1942 میں 'کلیاں' کا اشتہار نظر آیا۔ پھر فروری 42 کے اداریے میں 'کلیاں' کے شائع ہونے اور چوٹیں کے زیر طبع ہونے کی اطلاع موجود ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے ساقی فروری 42 کے اداریے میں یہ اطلاع ان لفظوں میں دی ہے:

''اس سال چند بہت اچھی کتابیں خاص اہتمام سے شائع ہوئی ہیں۔ حضرت بہزاد کا مجموعہ کلام 'چراغ طور' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ محترمہ عصمت چغتائی کے سولہ افسانے 'کلیاں' کے نام سے شائع ہو گئے ہیں — ان کے علاوہ چند اور کتابیں زیر طبع ہیں جن میں اوپندر ناتھ اشک کا ناول 'ستاروں کے کھیل' عصمت چغتائی کے جدید مضامین کا مجموعہ 'چوٹیں' اور منٹو کے نئی طرز کے ڈرامائی مضامین جنازے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔''

فروری 42 کے بعد سے اس کا اشتہار مستقل موجود ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ 'کلیاں' ادارہ ساقی سے جنوری 1942 میں شائع ہوئی۔ سنہ 1940 کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ اس کا اوّل اڈیشن 1941 میں مکتبہ اردو ادب لاہور سے شائع ہوا اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ مکتبہ اردو ادب سے شائع کلیاں میں 17 افسانے ہیں اور ساقی سے شائع ہونے والے مجموعے میں 16 افسانے شامل ہیں۔ یہ فرق بھی ملحوظ خاطر رہے۔

'چوٹیں' 1942 میں ساقی اور ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ دونوں جگہوں سے شائع ہوئی۔ اس میں ایک خاکہ، ایک ڈراما اور 13 افسانے شامل ہیں۔ عصمت کا متنازعہ افسانہ 'لحاف' اسی مجموعے میں شامل ہے۔ اس سے قبل یہ افسانہ پہلی بار ادب لطیف سالنامہ 1942 میں شائع ہوا تھا۔ یہ بات میں خاص طور پر اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ اس افسانے کی اشاعت کے متعلق بھی کافی غلط فہمی ہے۔ اکثر لوگ اس کی اول اشاعت ساقی 42 میں مانتے ہیں جو کہ غلط ہے۔

1952 میں دو افسانوی مجموعے 'چھوئی موئی' اور 'دو ہاتھ' شائع ہوئے۔ ایک ورائٹی بک بنک لاہور اور اردو اکادمی سندھ کراچی سے دوسرا مکتبہ اردو ادب لاہور سے۔ چھٹا افسانوی مجموعہ 'بدن کی خوشبو' سرفراز احمد منظور پریس لاہور سے 1979 میں شائع ہوا۔ آخری مجموعہ 'آدھی عورت آدھا خواب' مکتبہ شعر و ادب پاکستان اور بیسویں صدی دہلی سے 1986 میں شائع ہوا۔ عصمت کے تمام افسانوی مجموعوں کے اس قدر جعلی اڈیشن شائع ہوئے ہیں کہ جسے جو ہاتھ لگا اس نے اسی کو صحیح مان لیا اور مزید تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی۔ عصمت کے تمام افسانوی مجموعے کسی بھی لائبریری میں یکجا نہیں ملتے۔ دو چار دو چار ہی ملتے ہیں۔ ایک نام کے کئی مجموعے ہیں اور مختلف ناشروں کے ذریعے شائع ہوئے ہیں۔ افسانوی مجموعہ 'کلیاں'، 'افسانے ڈرامے' کے نام بھی سے شائع ہوا ہے۔ لہٰذا تعین سنہ کا مسئلہ دشوار ضرور ہے ناممکن بالکل نہیں۔

ناممکن اس لیے نہیں کہ اگر ہم رسائل سے زیادہ تر افسانوں کے حوالے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ گتھی یوں ہی سلجھ جائے گی اور ہم افسانوی مجموعوں کے سنہ اشاعت پر پورے یقین کے ساتھ گفتگو کر سکیں گے اور ایک ایک حوالہ سچائی تک پہنچنے میں ہماری مدد کرے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ممکن کیسے ہو۔ ہم جب تک نقل بیانی کے رویے کو ترک نہیں کریں گے اور خود سے ذمے دارانہ کردار ادا نہیں کریں گے یہ ممکن نہیں ہوگا۔ ہمیں اپنی تن آسانیاں اور سہل پسندی کے رویے کو ترک کرنا ہوگا۔ ثانوی ذرائع پر اعتبار کو کم کرنا ہوگا۔ اصل کی تلاش کی طرف توجہ مرکوز کرنی ہوگی لاپرواہی کے رویے کو ختم کرنا ہوگا۔ تب ہی معیاری تحقیق کے تقاضے کو ہم کسی حد تک پورا کر سکیں گے۔ کاتا اور لے دوڑی یعنی عجلت پسندی سے پرہیز کرنا ہوگا۔

یہ تو تھی افسانوی مجموعوں اور افسانوں کی بات۔ ناولوں کے سنہ اشاعت میں بھی ہنگامہ مچا ہے۔ زیادہ تر ناولوں کے سنہ اشاعت پر مختلف رائیں ہیں۔ ادب کا طالب علم کس پر یقین کرے کس پر نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان کے اساتذۂ کرام بھی اس سے مبرا نہیں ہیں۔ ان کا پہلا ناول ضدی ہے جس کے تین سنہ اشاعت ہمیں ملتے ہیں۔ 1940، 1941، 42-1940 میں ساقی بک ڈپو۔ لیکن دونوں میں اشاعت اوّل درج ہے۔ ساقی سے 1942 میں یہ ناول شائع ہوا اس کی تحریری شہادت موجود ہے اور ایجوکیشنل بک ہاؤس کی بھی تحریری شہادت موجود ہے۔ اس روشنی میں طبع اوّل 1941 کو ہی مانا جائے گا۔ جب تک 1940 کی کوئی شہادت سامنے نہ آ جائے۔

دوسرا ناول 'ٹیڑھی لکیر' طبع اوّل 1944 اور 1945 دونوں درج ہے۔ لیکن درست سنہ 1944 ہے یوپی بک کارنر رام پور سے یہ ناول 1944 میں شائع ہوا تھا اور اس کی شہادت موجود ہے۔ 1945 میں مکتبہ اردو سرکلر روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

'معصومہ' کا سنہ اشاعت 1961 اور 1962 دونوں درج ہے۔ 1961 میں یہ ناول اشتیاق پبلی کیشنز، دریا گنج دہلی سے شائع ہوا۔ 1962 میں نیا ادارہ لاہور نے شائع کیا۔ ناول 'سودائی' کا سنہ اشاعت 1964 سبھوں نے درج کیا ہے۔ 1964 میں یہ ناول اسٹار پبلی کیشنز دہلی اور نیا ادارہ لاہور سے بہ یک وقت شائع ہوا۔ ناول 'ایک قطرۂ خون' 1975 میں فن اور شخصیت والے صابر دت نے شائع کیا۔ لیکن کچھ لوگوں نے 1976 بھی درج کیا ہے جو درست نہیں ہے۔ 'کاغذی پیرہن' جوان کا خود نوشت ناول ہے 1994 میں پبلی کیشن ڈویژن دلی سے شائع ہوا۔

ناول عجیب آدمی، جنگلی کبوتر، باندی، اور بچوں کے لیے لکھے گئے چند ناولٹ تین اناڑی، نقلی راج کمار، دل کی دنیا اور دیگر چند اور کی سنہ اشاعت کا مسئلہ بھی کافی الجھا ہوا ہے۔ جب تک مزید شہادت مل نہیں جاتی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اب جبکہ 'عصمت صدی' پورے ہندوستان میں دھوم دھام سے منائی جا رہی ہے ہم لوگوں کی ذمے داری بنتی ہے کہ اس غبار آلود فضا کو صاف کریں اور عصمت پر کچھ لکھنے سے پہلے سچائی جاننے کی کوشش کریں۔ ورنہ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔ ایک صدی کی گمرہی کے بعد روشنی کی نئی کرن تو پھوٹے اور محققین اور ناقدین اپنی ذمے داریوں سے عہد برآ ہونے کی کوشش کریں۔

■

Jameel Akhtar
18G, CPW D Colony, Vasant Vihar
New Delhi - 110057

ناصرہ سلطانہ

آگ کا دریا

قرۃ العین حیدر جدید اردو فکشن کی معمار ہیں۔ انھوں نے تہذیب، ثقافت، تاریخ، سیاست اور فنون لطیفہ کی تہہ در تہہ وسعتوں کو سمیٹ کر اردو فکشن کی تعمیر نو کی۔ قرۃ العین حیدر کے فن میں موضوع کی عظمت، کینوس کی وسعت، تکنیک کی تازہ کاری، فضا بندی کے انوکھے انداز اور زبان و بیان کی ندرتوں کا جادو موجود ہے جن کی بہترین مثال ان کے ناول 'آگ کا دریا' میں ملتی ہے جو کہ 1959 میں پاکستان سے شائع ہوا۔ ان کے اس شاہکار ناول نے ناول نگاری کے فن کو ایک نئی جہت عطا کی۔ قرۃ العین حیدر نے ڈھائی ہزار سال کی ہندوستانی تاریخ کو وقت کے ایک خاص تسلسل و تصور میں پیش کرتے ہوئے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی۔ یہ ناول اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

'آگ کا دریا' میں ہندوستانی تاریخ و تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اس پر پاکستان میں اس ناول کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار ہوا۔ مگر سنجیدہ مزاج لوگوں نے اس ناول کی پذیرائی بھی کی کیونکہ اس ناول میں ایک نئی تکنیک کا استعمال کرکے ایک مخصوص علامتی اور استعاراتی انداز میں انسانی مقدر کے المناک پہلوؤں کو ابھارا گیا ہے یہ صرف ملک کی تقسیم کے المیہ کی داستان نہیں ہے بلکہ انسانی تہذیب کے زوال کی داستان بھی ہے۔

اس ناول کا موضوع 'وقت' ہے۔ وقت دریا کی طرح رواں دواں رہتا ہے وہ اپنے جلو میں بے شمار چیزوں کو لیے بہتا چلا جاتا ہے۔ ناول نگار نے متعدد مقامات پر 'وقت' کا تذکرہ ایک موثر عظیم طاقت کے طور پر کیا ہے۔ 'وقت' اس ناول کا موضوع ضرور ہے لیکن ناول نگار نے وقت کو اصطلاحی معنی کے بجائے وسیع معنوں میں لیا ہے۔ اس میں تاریخ کے وہ صفحات بھی شامل ہیں جن پر جگہ جگہ 'وقت' کے نقوش ثبت ہیں۔

ناول نگار نے ہندوستان کی ڈھائی ہزار برس پر محیط انتہائی الجھی ہوئی تاریخ کے چار مختلف ادوار کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے اور ہر دور سے متعلق چار مختلف کہانیوں کو ایک لڑی میں پرو کر اس طرح پیش کر دیا کہ ہندوستان کی پوری تہذیب و ثقافت اپنے ارتقائی عمل سے گذر کر ایک مشترکہ تہذیبی اقدار کی تشکیل کرتی ہے اور تقسیم کی عظیم انسانی ٹریجڈی سے گذر کر تاریخ کے سفر میں آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ اس ناول کا آغاز کچھ مخصوص فقروں سے ہوتا ہے جو دیوتاؤں کے بارے میں ہیں اور جس میں دریا کو بھی اس کی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دیوتا مانا گیا جو غصہ ور ہوتا ہے، تباہ کن ہے، تند خو ہے، آتش مزاج ہے۔ اس ناول میں اس بے چین اور متلاشی روح کی طرف جگہ جگہ اشارہ ملتا ہے جو اپنے زمانے کے فکری اور تہذیبی دھاروں کو سمت دینے اور انسانیت کے زخموں کی سچائی کے لیے سرگرداں رہتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے اس موضوع کے لیے

ہندوستان کی تہذیبی وشعوری تاریخ کو ایک وسیع کینوس کے طور پر استعمال کیا ہے انھوں نے ہندوستان کی تہذیبی روح برصغیر میں ہمہ جہت بہتی ہوئی زندگی اور روحانی سمتوں کو اپنے گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول ہندوستانی تہذیب کے ابتدائی دور سے شروع ہوکر نئے ہندوستان میں مکمل ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ہندو مسلم تہذیب کی ہم آہنگی اور تقسیم ہند کے عوامل وعواقب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے اہم مراحل میں سے چند روشن پہلوؤں کو پیش کر کے ہندوستان کی روح کی عکاسی کی گئی ہے۔اس طرح 'آگ کا دریا' ایک ایسی دستاویز ہے جس میں شراوستی اور پاٹلی پتر کی تہذیب، ہندو مسلم مخلوط کلچر، انگریزی سامراج کی چیرہ دستیاں، جدوجہد آزادی، تقسیم وطن اور جدید ہندوستانی و پاکستانی معاشروں کی مکمل تصویر موجود ہے۔ مختلف تحریکوں، مذہبی کتابوں اور ہندوستان کی ان عظیم ہستیوں کا تذکرہ بھی اس ناول میں ملتا ہے، جنھوں نے اپنے ملک کا نام روشن کیا ہے۔

اس طرح یہ ناول ویدک عہد سے شروع ہوکر تقسیم ہند کے واقعات کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں ہندوستانی تہذیب کو پیش کرتا ہوا ختم ہوجاتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد تہذیب کے اس ساگر میں ایک نئی لہر اٹھی ہے اس کا مطالعہ دوسرے دور کا موضوع ہے۔ مسلمانوں کے انحطاط کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم ہندوستان میں جمنے لگتے ہیں۔اس بڑھتی ہوئی تازہ دم قوم کا ہراول دستہ جن ریشہ دوانیوں سے کام لیتا ہے اور اس کے مقابلے مغلیہ شان وشوکت کے آخری محافظ جس تن آسانی اور اخلاقی پستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کا تخلیلی عکس ہم تیسرے دور میں دیکھتے ہیں۔اس دور میں جدید لکھنؤ کی بھی ایک جھلک ہم دیکھ لیتے ہیں۔ چوتھے دور میں عمل کا مرکز ہندوستان سے یورپ منتقل ہوجاتا ہے اور وہی نسل جو اوپری متوسط طبقے کی نمائندگی تیسرے دور کے آخر میں لکھنؤ میں کررہی تھی، لندن، کیمبرج اور پیرس میں نظر آتی ہے۔ چوتھا اور پانچواں دور تقسیم ملک کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی معاشرے سے متعلق ہے۔ یہاں اس بات کا اظہار بے حد ضروری ہے کہ ناول اس طرح پانچ ادوار پر مشتمل ہے لیکن ناول نگار کا مقصد تاریخ نگاری نہیں بلکہ تاریخ کے یہ مختلف موڑ کہانی کے عمل کے لیے صرف ایک پس منظر کا حکم رکھتے ہیں۔ ناول نگار اپنے تخیل کی مدد سے واقعات میں رنگ آمیزی کرتا ہے اور جمالیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں ہونے دیتا، چنانچہ قرۃ العین حیدر نے فلسفہ وتاریخ کے عناصر کو ایک نفیس نمونے میں ڈھال کر پیش کیا ہے اس کے لیے انھوں نے اپنے بہترین رومانیت سے بھرپور بیانیہ انداز کے ساتھ ساتھ ایک نئی تکنیک کا سہارا لیا ہے جو مغربی افسانوی شکل میں پہلے سے متعارف وروشناس رہی لیکن اردو ناول میں چند ناکام تجربوں کے سوا اس کا استعمال کم تر ہی نظر آتا ہے وہ تکنیک شعور کی رو ہے۔

شعور کی رو تکنیک دراصل انسان کو اس کے حقیقی خدوخال میں پیش کرنے کی ایک موثر کوشش ہے، اس میں خارجی عمل سے زیادہ کردار کی انفسی زندگی پر زور دیا جاتا ہے کیونکہ کسی کردار کی حقیقی زندگی کو پیش کرنے کے لیے اس خارجی عمل کے بجائے ان کی انفسی کیفیات پر نظر رکھنا ضروری ہے جس کے زیر اثر خارجی عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔اس مقصد کے پیش نظر ناول نگار بقول عبدالسلام

”
اس ناول کے بیشتر کردار خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں، وہ اپنے مخصوص تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے نوجوانوں کی ذہنی وفکری صلاحیتوں کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار بیدار ذہن کے حامل ہیں۔ ذیل میں اس ناول کے اہم کرداروں کا جائزہ لیا جارہا ہے۔
“

''اپنے کیمرے کا رخ کردار کے نفس کی جانب کردیتا ہے۔اس طرح قاری کردار کے نفس کا مطالعہ براہ راست اور بلاواسطہ کرلیتا ہے''۔

'آگ کا دریا' اس طرح اس شعور کی رو تکنیک کی ایک کامیاب مثال ہے جس سے اردو ناول ایک نئی جہت سے آشنا ہوا۔ بہت سے نقادوں نے اس ناول کی اس خوبی کا اعتراف کیا ہے۔ بعض نقادوں نے اس ناول کو اس تکنیک کا ناکام تجربہ قرار دیا ہے۔ درحقیقت نقاد اردو تخلیقات کو تنقید کے مغربی معیار پر ناپتے ہیں اور فن کار سے اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ وہ مغربی اصولوں سے سر مو انحراف نہیں کرے گا جب کہ تخلیقی شعور اپنے مخصوص مزاج وماحول سے گہرا اثر قبول کرتا ہے۔

'قرۃ العین حیدر نے اس تکنیک کو اردو قاری کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے اور اسے زیادہ موثر ودلکش بنا کر پیش کرنے کے لیے مغربی اصولوں کو کہیں کہیں جزوی طور پر نظر انداز کردیا ہے۔ ہندوستانی ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر کا نام اس ضمن میں سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے شعوری طور پر اس تکنیک کو اپنے ناولوں میں برتا ہے۔مگر 'آگ کا دریا' اس ضمن میں خصوصیت کا حامل ہے۔ یہ شعور کی رو کی تکنیک کا ہی کرشمہ ہے کہ 'آگ کا دریا' میں ڈھائی ہزار سالہ ہندوستانی تہذیب وتاریخ کی داستان سمیٹ کر ناول کی شکل میں پیش کردیا گیا ہے۔

اس ناول میں اگر ایک طرف قرۃ العین حیدر کا تاریخی و تہذیبی شعور اپنے عروج پر ہے تو دوسری طرف تکنیک کی جدت اور تجربے کی وسعت بھی اپنی بلندی پر نظر آتی ہے۔فکر وتنقید کی یہی ہم آہنگی 'آگ کا دریا' کو اردو کا شاہکار ناول بنادیتی ہے۔

شعور کی رو والے ناولوں میں کردار نگاری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی ہے لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اردو زبان کو سب سے پہلے قرۃ العین حیدر نے اعلیٰ درجہ کے نستعلیق، مہذب اور روشن دماغ کردار دیے۔ ناول کے تمام کردار اتنے مکمل ہیں کہ وہ اپنے ماحول و مخصوص تہذیب کی علامت بن گئے ہیں۔ یہ کردار مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور اپنے عہد کی ترجمانی کرتے ہوئے ناول کی فضا میں گم ہوجاتے ہیں۔ یہ تمام کردار شروع سے آخر تک ناول کے کینوس پر بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا رول ادا کرتے ہیں اور کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا ہے۔

اس ناول کے بیشتر کردار خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں، وہ اپنے مخصوص تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے نوجوانوں کی ذہنی وفکری صلاحیتوں کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار بیدار ذہن کے حامل ہیں۔ ذیل میں اس ناول کے اہم کرداروں کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

گوتم

گوتم ہندوستان کے باشعور ذہن کی نمائندگی کرتا ہے اور اپنی فکری صلاحیتوں کی وجہ سے ہر دور میں ممتاز نظر آتا ہے، نام کی مماثلت کی وجہ سے اس میں گوتم بدھ کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ ہر دور میں متاثر کرتا ہے، قدیم عہد کا گوتم فلسفی ہے وہ اپنے عہد کا نمایاں طالب علم ہے اور مروجہ علوم میں دسترس رکھتا ہے۔ دوسرے عہد کا گوتم نیلامبر انگریزوں کی آمد کے بعد پڑھے لکھے طبقے کا نمائندہ نظر آتا ہے۔ وہ تعلیم حاصل کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی میں کلرک ہوجاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ملازمت سے

استعفیٰ دے کر ہندو کالج میں داخلہ لیتا ہے۔ بی اے کرنے کے بعد برہمو سماج کا سرگرم رکن بن جاتا ہے۔ تیسرا گوتم وشو بھارتی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ریلیف کے کاموں میں مصروف نظر آتا ہے۔

اس کام کے دوران اس کی ملاقات کمال سے ہوتی ہے جو اسے لکھنؤ لاتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ روس کا سفیر مقرر ہوتا ہے اور انگلینڈ اور امریکا کا سفر کرتا ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جب وہ وطن لوٹتا ہے تو ماضی کے نقوش اس کے ذہن میں زندہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ ہر دور میں پڑھے لکھے طبقے کا نمائندہ نظر آتا ہے۔

چمپک

قدیم عہد میں اس کا نام، چمپک ہے وہ گوتم سے سرجو کے کنارے ملتی ہے۔ وہ ہندوستانی عورت کی علامت اور اپنے عہد کے پڑھے لکھے طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ گوتم جیسے فلسفی سے بحث کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ چندر گپت موریہ سے جنگ کے بعد گرفتار ہو کر پاٹلی پتر جاتی ہے۔ یہیں اس کی شادی مالیات کے ایک ملازم سے ہوتی ہے۔ اس بات سے ایک باشعور لڑکی کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد چمپا ایودھیا کے ایک پنڈت کی لڑکی چمپاوتی کی شکل میں سامنے آتی ہے، یہیں اس کی ملاقات کمال ابو المنصور سے ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے سے محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کمال اس سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو وہ کہتی ہے ''مگر ہم

”
ناول کے اکثر کردار چمپا بائی کی طرف مائل ہوتے ہیں مگر وہ کسی سے شادی نہیں کرتی وہ لکھنؤ کی مثالی طوائف کی نمائندگی کرتی ہے، جب لکھنؤ کے برے دن آتے ہیں تو وہ بھکاری بن جاتی ہے۔ گوتم سے اس کی ملاقات ہر عہد میں ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے میں دل چسپی بھی لیتے ہیں مگر زندگی کے ساتھی نہیں بن پاتے ہیں۔ اس کی رومانیت اور اصول پسندی اس کو کسی کو اپنانے نہیں دیتی۔ حالانکہ اس کے دل میں بعض کرداروں کے لیے نرم گوشے موجود ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان جانے کے بجائے مراد آباد میں رہنا پسند کرتی ہے۔
“

تم کو یونہی اپنا پتی مانتے ہیں۔'' اس طرح چمپاوتی مذہبی تعصب سے بالاتر نظر آتی ہے۔ وہ صرف محبت کرنا جانتی ہے۔ تیسری مرتبہ وہ لکھنؤ کی طوائف چمپا بائی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے یہاں اس کی ملاقات کلکتہ کے شری اسٹلے نواب کمن اور گوتم نیلامبر سے ہوتی ہے۔

ناول کے اکثر کردار چمپا بائی کی طرف مائل ہوتے ہیں مگر وہ کسی سے شادی نہیں کرتی وہ لکھنؤ کی مثالی طوائف کی نمائندگی کرتی ہے، جب لکھنؤ کے برے دن آتے ہیں تو وہ بھکاری بن جاتی ہے۔ گوتم سے اس کی ملاقات ہر عہد میں ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے میں دل چسپی بھی لیتے ہیں مگر زندگی کے ساتھی نہیں بن پاتے ہیں۔ اس کی رومانیت اور اصول پسندی اس کو کسی کو اپنانے نہیں دیتی۔ حالانکہ اس کے دل میں بعض کرداروں کے لیے نرم گوشے موجود ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان جانے کے بجائے مراد آباد میں رہنا پسند کرتی ہے۔

کمال:

کمال بھی گوتم اور چمپا کی طرح ہمارے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے، سب سے پہلے وہ عربی النسل ابوالمنصور کمال الدین کی شکل میں سلطان شرقی کے مورخ کی حیثیت سے نظر آتا ہے، دوسری بار وہ صوفی اور پنڈتوں کی منڈلی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ آخری بار وہ نواب خاندان کے ایک فرد کی شکل میں نظر آتا ہے، وہ ایک ذہن پرست، با اصول، ایماندار، مخلص اور تصور پرست دکھائی دیتا ہے۔ وہ پاکستانی پروپیگنڈہ کے لیے لندن بھیجا جاتا ہے لیکن ہندوستان سے اس کی وابستگی میں فرق نہیں آتا۔

لندن سے ڈگریاں لے کر آیا تو اسے کوشش کے باوجود ملازمت نہ مل سکی۔ ایک یونیورسٹی میں انٹرویو کے لیے گیا تو اس سے کم تر صلاحیت رکھنے والے ایک امیدوار کو منتخب کر لیا گیا کیونکہ وہ ایک ہندو تھا۔ مجبوراً پاکستان چلا گیا یہاں بھی اسے سکون نصیب نہیں ہوا۔

ان کے علاوہ سرل، طلعت، عامر رضا جیسے اور بھی کردار ہیں جو اس ناول کو آگے بڑھانے میں معاون و مددگار ہیں۔ لیکن اہم کردار گوتم، چمپا اور کمال ہی ہیں جن کے ارد گرد کہانی کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔ یہ تمام کردار کافی دلکش مگر تصور پرست مثالی ہیں۔ ان کے اندر تمام اوصاف جمع کر دیے گئے ہیں جو کچھ فطری سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ناول روحانی طرز نگارش کا شاہکار ہے، ترشے تراشے جملے اپنے اندر بڑی لطافت اور نغمگی رکھتے ہیں۔

”
کچھ خامیوں کے باوجود یہ ناول ایک شاہکار ناول ہے جو اردو کے افسانوی ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جدید مغربی ناول سے قرۃ العین نے کئی چیزیں لی ہیں، لیکن ان سب کے امتزاج سے انھوں نے اردو میں اسلوب و اظہار کی جو نئی راہیں نکالی ہیں اور جو تجربے کیے ہیں ان کی قدر و قیمت کو تسلیم نہ کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔
“

قرۃ العین حیدر کے پاس لفظوں کا ایک بہترین خزانہ ہے جسے وہ اچھی طرح استعمال کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ اس ناول کے اسلوب نگارش سے ناول نگار کے تخلیقی شعور کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں انگریزی، ہندی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی الفاظ کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ یہ الفاظ اپنے بولنے والے کرداروں کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مکالمے مختصر مگر فکر اور جذبے میں ڈوبے ہوئے ہیں، کرداروں کی ذہنی کیفیت کو ابھارنے کے لیے ناول نگار نے منظر نگاری سے بھی کام لیا ہے۔ منظر نگاری سے یہ ٹکڑے بڑے فطری انداز میں استعمال ہوئے ہیں۔ عام طور سے ان کی تحریریں شیریں اور نغمگی میں ڈوبی ہوئی ہیں لیکن کہیں کہیں طنز کی نشتریت بھی نظر آتی ہے، کہیں کہیں ان کے لہجے میں تلخی اور جھلاہٹ بھی پیدا ہو گئی ہے لیکن ایسے مقامات کم نظر آتے ہیں۔

عام طور سے ان کا انداز نگارش بے ساختہ، برجستہ، سبک اور لطیف ہی ہوتا ہے۔ شعور کی رو ناول ہونے کی وجہ سے اس میں اشاریت اور ایمائیت بھی پائی جاتی ہے۔ انگریزی الفاظ کا غیر ضروری استعمال کہیں کہیں کھٹکتا ہے۔ کچھ خامیوں کے باوجود یہ ناول ایک شاہکار ناول ہے جو اردو کے افسانوی ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جدید مغربی ناول سے قرۃ العین نے کئی چیزیں لی ہیں، لیکن ان سب کے امتزاج سے انھوں نے اردو میں اسلوب و اظہار کی جو نئی راہیں نکالی ہیں اور جو تجربے کیے ہیں ان کی قدر و قیمت کو تسلیم نہ کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔

■

Dr. Nasra Sultana
Lecturer, Dept of Urdu
Delhi University, Delhi - 110007

سیدہ انجم

مولوی عبدالسلام بیگ شفیق جھالاواڑی کی ادبی خدمات

راجستھان ہندوستان کا وہ خطہ ہے جسے جغرافیائی اعتبار سے ریگستان کہا جاتا ہے، درحقیقت اردو ادب کا نخلستان ہے۔ جہاں اردو کے درخت کی شاخیں 19 ویں صدی کی پہلی دہائی میں پہنچیں۔ مرزا اکبر علی بیگ گل تلمیذ میر تقی میر اور عظمت اللہ نیاز نے دہلی سے جے پور پہنچ کر اردو شعر و ادب کا چراغ روشن کیا۔ عظمت اللہ نیاز نے 1811 میں 'قصۂ رنگین گفتار' کے نام سے اردو زبان میں ایک داستان لکھی جسے اردو نثر کی پہلی تصنیف مانا جاتا ہے۔ اسی طرح مرزا اکبر علی بیگ گل کو ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے راجستھان کا پہلا صاحب دیوان شاعر بتایا ہے[1] اسی زمانے میں (1834) جے پور کے دفاتر میں کام کاج اردو زبان میں شروع ہوا۔ ریاست کے قوانین اردو میں مرتب ہوئے اور 1846 میں سرکاری پریس میں طبع ہوئے [2] اس سے قبل 1817 میں ریاست ٹونک کے قیام کے زمانے سے وہاں بھی اردو شعر و ادب کی آبیاری شروع ہو چکی تھی۔ 1857 سے قبل اجمیر میں بھی اردو شعر و ادب کی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں وہاں نظام الدین ممنون اور عبدالکریم خاں شرق جیسے صاحب دیوان شعرا پہنچ چکے تھے۔ راجستھان کی چند ریاستوں میں 1857 سے قبل اردو شعر و ادب کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن بیشتر ریاستوں میں 1857 کے بعد اردو شعر و سخن کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ بعض ریاستیں علم و ادب کا گہوارہ بن گئیں۔ ان میں ریاست جھالاواڑ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں کے حکمرانوں خصوصاً مہاراجہ رانا بھوانی سنگھ کی علم دوستی، ادب نوازی اور عدم تعصب کے سبب اس کے عہد حکومت میں ہر علم و فن کو پھلنے پھولنے کا بھرپور موقع ملا۔[3]

اگر چہ ریاست جھالاواڑ 1838 میں قائم ہو چکی تھی [4] لیکن ریاست کی ادبی تاریخ مہاراجہ رانا بھوانی سنگھ کے دور حکومت (1899-1929) کے دوران واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ یہ رئیس اہل کمال اور اہل فن کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس لیے آپ کے دربار میں آغا شاعر قزلباش تلمیذ داغ، نیرنگ کاکوروی تلمیذ محسن کاکوروی، کیف ٹونکی، جیسے اساتذۂ سخن اور منشی شمبھو دیال دانش، پنڈت پرشوتم لال سوریہ دوج شاد، و شمبھر ناتھ سکسینہ نشتر، عزیز الرحمان عزیز جھالاواڑی، محمد حسین رضوی رسا، سید یوسف علی یوسف، مرزا رفیق بیگ تسلیم جیسے شعرا و ادبا موجود تھے [5] خصوصاً نیرنگ کاکوروی کے بسلسلۂ ملازمت جھالاواڑ تشریف لانے (1899) کے بعد باقاعدہ اردو شعر و ادب کا سلسلہ قائم ہوا [6] آپ کے بہت سے شاگرد

ہوئے جن کی تعداد 54 تک پہونچتی ہے [7] ذاتی طور پر مشاعروں کا انعقاد یہاں کے معززین کے دولت خانوں پر شروع ہوا۔ جن کے حالات مہاراجہ موصوف کو معلوم ہوئے لہٰذا 1905 میں مہاراجہ کے ایما پر پندرہ روزہ مشاعرہ کی بنیاد ڈالی گئی اور ماہنامہ رسالہ آفتاب جاری کیا گیا۔ مولانا حالی رسالہ آفتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خط میں لکھتے ہیں ''رسالہ آفتاب کے دو نمبر پہنچے۔ ان کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی اور پڑھ کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ ہمارے رئیسوں کا اس طرف متوجہ ہونا اور اس لیاقت سے علمی مضامین لکھنا ہندوستان کے پہلے دن آنے کی دلیل ہے۔ بابو امبالال صاحب کا مضمون تعلیم پر اور آپ کا مضمون تعصب پر بہت عمدہ ہے۔''[8]

1912 میں 'شاعری کی کایا پلٹ' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری ہوا جس کی نگرانی کے لیے انجمن سخن شعرا قائم کی گئی۔ اسی طرح 1914 میں پہلی جنگِ عظیم کے حالات عوام تک پہنچانے کے لیے رسالہ 'جنگِ یورپ' جاری کیا گیا۔ یہ تینوں رسالے جیل پریس میں ہی شائع ہوتے تھے۔ مہاراجہ موصوف نے اپنے درباری شعرا منشی شمبھو دیال دانش کو ملک الشعرا، نیرنگ کاکوروی کو افتخار الشعرا اور کیف ٹونکی کو امام الشعرا کے خطاب سے نوازا تھا اور اپنے درباری شعرا کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ روایتی گل و بلبل کی شاعری کو چھوڑ کر مولانا حالی کی طرح اصلاحی اور اخلاقی شعر کہیں[9] اس دور میں علم و ادب اور تہذیب و تمدن کے عروج کے سبب پروفیسر پریم شنکر شریواستو نے جھالاواڑ راجستھان کا لکھنؤ لکھا تھا۔[10]

مہاراجہ رانا بھوانی سنگھ کے جانشین مہاراجہ رانا راجیندر سنگھ مخمور خود شاعر تھے۔ ان کا دربار بھی شعروادب کا ایک مرکز تھا۔ اگرچہ مہاراجہ رانا راجیندر سنگھ کے 1943 میں انتقال اور 1947 میں نیرنگ کاکوروی کے وصال کے بعد جھالاواڑ کی ادبی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں۔ ادبی ماحول منتشر ہو گیا۔ خاص طور پر تشکیلِ راجستھان کے بعد ریاستی حکومت ختم ہو گئی۔ جس کا اثر اردو شعروادب پر پڑا۔ ایسے حالات میں جھالاواڑ میں اردو زبان و ادب کو جن شعراء نے محفوظ رکھا ان میں مولوی عبدالسلام بیگ شفیق کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جنھوں نے شعروادب کی بھرپور خدمت کی۔ اپنے شاگردوں کو شعرو سخن کی طرف مائل کیا۔ 'بزم نیرنگ' قائم کی اور جھالاواڑ کی ادبی عظمت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی[11] مولوی عبدالسلام بیگ شفیق کی شخصیت اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بابائے اردو راجستھان ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی فرماتے ہیں

شفیق صاحب کی غزلوں کو اردو غزل کی کلاسکی روایات کی کڑی کہا جا سکتا ہے۔ روایت کے پاس و لحاظ کے ساتھ آپ کی غزلوں میں جدت کا التزام بھی کثرت سے ملتا ہے۔ بنیادی طور پر آپ کی غزلیات اصلاح پسندی کے جذبات، فلسفیانہ نکات، متصوفانہ اور عارفانہ خیالات اور اخلاقیات کے گہرے مشاہدات سے بہرہ ور ہیں۔ البتہ روایتی غزل میں بھی آپ کی نفاست پسندی سوقیانہ یا عامیانہ خیالات سے دور ہے۔ ابتدا تا انتہا آپ کے یہاں شائستگی اور پاکیزگی کا اہتمام نظر آتا ہے۔

''مولانا شفیق کی واحد شخصیت جھالاواڑ میں اردو کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے پر لانے کی کوشش کرتی نظر آتی تھی...... حقیقت یہ ہے کہ جھالاواڑ کی اس دور کی ادبی تاریخ میں مولانا شفیق کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ موصوف نے جہاں درس و تدریس کے ذریعے اردو کی تعلیم پر توجہ فرمائی وہاں اپنے احباب اور شاگردوں میں ذوقِ شعرو ادب کو ابھارا اور جھالاواڑ میں اردو کو زندہ رکھا۔''[12]

مولوی عبدالسلام بیگ شفیق کی پیدائش 10 اپریل 1910 بمقام جھالاواڑ ہوئی [13] آپ کے والد مرزا رفیق بیگ تسلیم بلند مرتبہ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ آپ کے آبا و اجداد قصبہ پھپھوند ضلع اٹاوہ اتر پردیش کے رہنے والے تھے اور عربی فارسی میں کامل دستگاہ رکھنے والے تھے۔ چونکہ نسبتاً مغل تھے اس لیے فنِ سپہ گری بالخصوص فنِ توپ اندازی میں مہارت تامہ رکھنے کی وجہ سے شاہی فوج میں بابر بادشاہ کے زمانے سے ہی فوجی عہدوں پر فائز رہے۔ شفیق صاحب کو شاعری ورثے میں ملی۔ آپ کو نیرنگ کاکوروی تلمیذ محسن کاکوروی کے سلسلۂ تلمذ کا شرف حاصل ہے [14] آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ غزل کے وسیلے سے اپنے تخیلات و افکار اور نظریات کو غنائیت سے ہم کنار کرنا آپ کی استادانہ مشاقی کی دلیل ہے۔ غزل کے علاوہ حمد باری تعالیٰ، نعت سرور کائنات، منقبت، مسدس، قصیدہ، رباعی، تضمین، مخمس، چار بیت وغیرہ اصنافِ سخن میں بھی آپ کی فکرِ رواں کے جوہر آب دار صاف صاف جھلکتے ہیں۔

شفیق بلند پایہ شاعر بھی تھے اور زود گو بھی، ان کا شعری سرمایہ کافی ضخیم ہے۔ موصوف نے ازخود اپنے کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جس میں چار دواوین باعتبار ترتیب ادوار حروف تہجی ہیں:

(1) نیرنگِ سخن (2) تسلیمِ ادب (3) تصوراتِ ضمیر (4) یوسفستانِ غزل

باعتبارِ تقسیم دوسرا حصہ نعتیہ کلام پر مشتمل ہے جس میں دو دیوان شامل ہیں:

(1) قلزمِ انوار (2) کواکب النعت

تقسیم کلام کی رو سے تیسرا حصہ منظومات متفرقہ پر مبنی ہے جس میں کثرت سے حب الوطنی کے موضوع پر منظومات اور مسدسات شامل ہیں۔ نیز فارسی کلام کا مجموعہ 'کلامِ فارسی' بھی ہے اور کچھ نثری مضامین بھی ہیں۔ یہ سب غیر مطبوعہ ہیں۔ 1980 میں راجستھان اردو اکادمی نے آپ کے بہاریہ کلام کا انتخاب 'انتخاب کلام شفیق' کے نام سے پہلی اشاعت کے طور پر شائع کیا۔ آپ نے اپنے والد مرزا رفیق بیگ تسلیم کا دیوان اور مہاراجہ رانا راجیندر سنگھ مخمور کا دیوان مرتب کیا ہے۔ جو کہ غیر مطبوعہ ہیں۔ موصوف نے ترجمہ نگاری کا کام بھی انجام دیا ہے۔

1974-75 میں انڈین کاؤنسل آف ہسٹوریکل ریسرچ، نئی دہلی کے تحت ریسرچ پروجیکٹ 'جودھپور راجیہ کے کھیات' کے لیے فارسی زبان میں موجود مارواڑ کی تاریخ اور حکمرانوں سے متعلق مواد کو ہندی زبان میں منتقل کیا جو کہ آپ کے کمالِ علم و ہنر اور زبان دانی کا مظہر ہے [15]

شفیق صاحب کی غزلوں کو اردو غزل کی کلاسکی روایات کی کڑی کہا جا سکتا ہے۔ روایت کے پاس و لحاظ کے ساتھ آپ کی غزلوں میں جدت کا التزام بھی کثرت سے ملتا ہے۔ بنیادی طور پر آپ کی غزلیات اصلاح پسندی کے جذبات، فلسفیانہ نکات، متصوفانہ اور عارفانہ خیالات اور اخلاقیات کے گہرے مشاہدات سے بہرہ ور ہیں۔ البتہ روایتی غزل میں بھی آپ کی نفاست پسندی سوقیانہ یا عامیانہ خیالات سے دور ہے۔ ابتدا تا انتہا آپ کے یہاں شائستگی اور پاکیزگی کا اہتمام نظر آتا ہے۔ آپ کی غزلوں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ان کا وعدہ اگر وفا نہ ہوا
یہ تماشہ کوئی نیا نہ ہوا

عشق نے رکھا نہیں ہے ہم کو محتاجِ نظر
دیکھ لیتے ہیں تصور میں تیری تصویر ہم

وہ حسن ہے کہ شاہ بنا دے غلام کو
محمود ہو کے شاہ ہوا ہے ایازِ عشق

حسن اب دنیا نئی اپنی بسائے گا کہاں
دل دیا ہے وسعتِ کونین کے قابل مجھے
کمال جذب جنوں یہ ہے سر نثار کریں
جنوں وہ کیا جو گریباں ہی تار تار کریں

شفیق صاحب کی شاعری کا ایک اہم موضوع عشق الٰہی ہے۔ حسن و عشق کا بیان ہو یا فلسفیانہ رموز کا اظہار سب میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہے۔ آپ کی غزلوں میں تصوف سے متعلق مختلف موضوعات پر اشعار ملتے ہیں مثلاً وحدت الوجود اور وحدت الشہود اور فنا و بقا۔

تصوف و معرفت سے متعلق چند اشعار بطور خاص ملاحظہ کیجیے۔

وہ نہ قطرہ کو اگر اتنی بڑائی دیتا
سیپ میں گوہر نایاب دکھائی دیتا
اس کے جلوے منحصر کچھ طور و کعبہ پر نہیں
ہے جگہ کوئی جہاں پر وہ ضیا گستر نہیں
ہر شے میں تجھے اہل نظر دیکھ رہے ہیں
کچھ ہیں کہ ادھر اور اُدھر دیکھ رہے ہیں
فانی ہے وہ مقام جہاں پر کہ ہر نفس
آتا دکھائی دے کوئی جاتا دکھائی دے

درحقیقت مولوی عبدالسلام بیگ شفیق اپنے دور کے معزز نعت گو شاعر رہے ہیں۔ نعت کہنا آسان کام نہیں۔

دینی معلومات کے ساتھ شاعر کے دل میں رسول خداؐ سے سچی عقیدت و محبت بھی ہونا ضروری ہے اور یہ خوبیاں شفیق صاحب کے یہاں موجود تھیں اور آپ نے ان کو نبھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ آپ کو محسن کاکوروی سے

> **دینی معلومات کے ساتھ شاعر کے دل میں رسول خداؐ سے سچی عقیدت و محبت بھی ہونا ضروری ہے اور یہ خوبیاں شفیق صاحب کے یہاں موجود تھیں اور آپ نے ان کو نبھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ آپ کو محسن کاکوروی سے سلسلہ تلمذ کا شرف حاصل تھا اور محسن کاکوروی کا نام اردو کے نعت گو شعرا میں نمایاں ہے۔ شفیق صاحب کے نعتیہ کلام میں آپ کی عقیدت مندی پوری طرح سے جلوہ گر ہے۔**

سلسلہ تلمذ کا شرف حاصل تھا اور محسن کاکوروی کا نام اردو کے نعت گو شعرا میں نمایاں ہے۔ شفیق صاحب کے نعتیہ کلام میں آپ کی عقیدت مندی پوری طرح سے جلوہ گر ہے۔ آپ کی نعتیہ غزلوں سے چند اشعار تبرکاً ملاحظہ فرمائیں:

بشر سے ہو کیا وصف شانِ محمدؐ
ہے اللہ خود مدح خوانِ محمدؐ
یہ دیکھ آئے ہیں اہل نظر مدینے میں
حضورؐ آج بھی ہیں جلوہ گر مدینے میں
کہاں کیے گئے سامان یہ کسی کے لیے
بنائے دونوں جہاں صرف آپؐ ہی کے لیے
شہرہ ہے دو عالم میں رسولِ مدنی کا
سر آپؐ کے سہرہ ہے بہارِ چمنی کا

علامہ اقبال نے شاعر کو 'دیدۂ بینائے قوم' کہا ہے[16] لہٰذا قوم کی اصلاح کا جذبہ اور اخلاقی درس آپ کے کلام میں جا بہ جا اس طرح جلوہ فگن ہے:

یہ بھی ہے حسنِ خلق پہ انساں کے منحصر
دشمن سے وہ نکال لے صورت نباہ کی
سوتے لوگوں کو جگانا تو نہیں ہے مشکل
تم نے جاگے ہوئے لوگوں کو جگایا ہوتا
درحقیقت وہی انسان ہے انسانوں میں
روح دانائی کی جو پھونک دے نادانوں میں
عمل کچھ کام آتا ہے نہ کام آتی ہیں تقریریں
مناسب ہو جو تدبیریں تو بن جاتی ہیں تقدیریں

شفیق صاحب کے آئینہ فکر و تخیل میں ہماری تہذیبی روایات اور ہندوستانی ثقافت کے حقیقی رنگ جھلکتے ہیں۔ لیکن جب نئے زمانے کی بدلتی تہذیب کے بیان کا موقع ہو تو آپ کے قلم کی جولانیاں اس طرح بکھرتی ہیں:

کچھ وہ نئے چلن کی بتائیں تو خوبیاں
جو لوگ کہہ رہے ہیں پرانے چلن کو چھوڑ
اب نہ وہ تہذیب ہے باقی نہ وہ شرم وحیا
ساتھ پھرتے ہیں سر بازار ہنستے بولتے

اور حب الوطنی کی بات ہو تو بے ساختہ کہتے ہیں:

لب پہ یہی دعا سحر و شام ہے شفیق
اونچی رہے جہاں میں ہمارے وطن کی بات
شفیق یہ ہے کرشمہ ہماری ہمت کا
غریب بن کے رہے ہیں مگر وطن میں رہے

بحیثیت مجموعی مولوی عبدالسلام بیگ شفیق ملک کے کہنہ مشق، قادرالکلام اور استاد شاعر تھے۔ ان کی اعلیٰ تربیت کے نمونے ان کے تلامذہ محترم مظفر جھالاواڑی، راحت

> **بحیثیت مجموعی مولوی عبدالسلام بیگ شفیق ملک کے کہنہ مشق، قادرالکلام اور استاد شاعر تھے۔ ان کی اعلیٰ تربیت کے نمونے ان کے تلامذہ محترم مظفرجھالاواڑی، راحت گوالیاری، مسیح اللہ بیگ مسیح، سعیدشفیقی کی شکل میں دنیائے شعرو ادب کو منور کر رہے ہیں۔**

گوالیاری، مسیح اللہ بیگ مسیح، سعید شفیقی کی شکل میں دنیائے شعرو ادب کو منور کر رہے ہیں۔ حالانکہ آپ 2 فروری 1987 کو اس جہانِ فانی سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوگئے کہ:

اچھے اچھے کو یہ کر لیتی ہے آگے آگے
گلشنِ دہر میں جب بادِ فنا چلتی ہے

حواشی:

(1) راجستھان میں اردو زبان و ادب 1857 تک مصنفہ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی مطبوعہ شمر آفسیٹ دہلی 1992، ص 54
(2) راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی مصنفہ ڈاکٹر قمر جہاں مطبوعہ ایم آر آفسیٹ پرنٹرس دہلی 2009، ص 18
(3,5,9) راجستھان میں اردو زبان و ادب کے لیے غیر مسلم حضرات کی خدمات مصنفہ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی مطبوعہ جمال پرنٹنگ، پریس دہلی 1985، ص 242,243 ,12
(4) ماہنامہ رسالہ آفتاب جلد 3 شمارہ 1 تا 12 مطبوعہ جیل پریس جھالاواڑ 1909، ص 22
(6) دیوان نیرنگ مصنفہ نیرنگ کاکوروی مطبوعہ نیر پریس لکھنؤ 1929، ص 13
(7,14) نیرنگ سخن مصنفہ شفیق جھالاواڑی غیر مطبوعہ ص 7,8,27
(8) جائزہ زبان اردو مرتبہ مولوی عبدالحق ناشر انجمن ترقی اردو دہلی 1940، ص 93
(10) جرنل جلد 7، APRI ٹونک شمارہ 1، 1989، ص 109
(11) مقالہ یادگار شفیق از مظفر جھالاواڑی غیر مطبوعہ
(12) مقالہ شفیق جھالاواڑی از ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی غیر مطبوعہ
(13) انتخاب کلام شفیق مصنفہ شفیق جھالاواڑی مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی 1980، ص 8
(14) جودھپور راجیہ کے کھیات مرتبہ ڈاکٹر رگھوبیر سنگھ مطبوعہ انڈین کاؤنسل آف ہسٹوریکل ریسرچ دہلی 1988، ص 3
(6) صراحتیں مصنفہ مفتوں کوٹوی غیر مطبوعہ ص 96

■

Dr. Sayyeda Anjum
Eidgah Road, Jhalawar - 326001 (Rajasthan)

غلام نبی خیال

کشمیر کا کھیمندر
سنسکرت طنز و مزاح کا بادشاہ

کھیمندر سرزمین کشمیر میں پیدا ہوا۔ اپنے وطن مالوف سے اُسے اس قدر محبت تھی کہ ایک جگہ اس شاعر اعظم نے اپنی ایک نظم میں وطن کا موازنہ فردوس بریں سے کرتے ہوئے کہا کہ خدا کی جنت کی ساری رعنائیاں بھی حسن کشمیر کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ یہ کلام یوں ہے:

کشمیر منڈل نے، جو بہتری کرنے والے ممالک
میں سرفہرست ہے
اور جو علماء سے آباد اور دل نشین ہے
اسی نے اندر دیوتا کا غرور خاک میں ملا دیا
سورگ کو یہ گمان تھا
کہ بس وہی ہر طرح کے لطف، عشرت اور دیوتاؤں
سے آباد ہے
لیکن قدرت کی شفا بخش نعمتوں
اور دولت سے مالا مال ملکوں میں سرفہرست ہو کر
اور کشمیری عالموں کی روایات سے بھرپور
کشمیر منڈل نے سورگ کے اس گھمنڈ کو پاش پاش کردیا

ان اشعار سے کالیداس کا وہ کلام یاد آجاتا ہے جس میں اس نے بھی اپنے وطن اُجین کو جنت کا ایک حصہ کہا ہے اور جسے اُجین کے رہنے والوں نے اپنے ثواب سے بھرے اعمال کے معاوضے کی شکل میں حاصل کیا ہے۔

اگر چہ چند مورخوں کا خیال ہے کہ کالیداس بھی دراصل کشمیر نژاد تھا۔ اس دعوی کی حمایت میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کالیداس نے زعفران کے پھولوں کی، جو صرف کشمیر ہی میں پائے جاتے ہیں، جو تصویر کشی کی ہے وہ ایک کشمیری ہی کرسکتا ہے۔ بہرحال اس وقت ہمارا موضوع کھیمندر کی ممتاز ادبی، فنی اور عالمانہ شخصیت ہی ہے۔

سنسکرت کے سرکردہ تحقیق کار برج موہن چترویدی کہتے ہیں: ''کشمیر کی خوبصورتی اور نعمتوں اور عورتوں کے حسن کا تذکرہ بلہن اور کلہن نے بھی اپنی تخلیقات میں کیا ہے مگر کھیمندر کا اس نوع کا تذکرہ خود بخود اور براہ راست دوسروں کو مات دیتا ہے۔ وتستا (جہلم) دریا کا ذکر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کی جائے پیدائش اسی دریا کے کنارے کسی جگہ تھی۔ اگر چہ اس نے اپنے جنم کے حوالے سے کسی جگہ کی نشان دہی نہیں کی ہے البتہ گمان غالب یہ ہے کہ کھیمندر نے خانگی زندگی کو خیر باد کہہ کے اپنے آخری ایام ترپپور پہاڑی کی چوٹی پر گذارے ہیں۔ وہیں پر اس نے دش اوتار چرت تخلیق کی۔ اس کے آخری اشلوک میں شاعر نے اس کے وقت کی طرف اشارہ کیا ہے جو اعداد کے مطابق 1065 بنتا ہے۔''[1]

سنسکرت ادب کا ممتاز نقاد آنند وردھن کہتا ہے کہ شاعری میں ارفع واعلیٰ مقام حاصل کرنے کی تگ و دو میں چند سخن گو ہی ایسے ہوتے ہیں جنھیں مہا کوی کا خطاب دیا جاسکتا ہے۔ والمیکی اور ویاس بے شک بڑے شاعر تھے البتہ انھیں زیادہ تر ریشیوں کی حیثیت میں مانا جاتا ہے مگر بھاس، کالیداس، بھان، اور بھوبھوتی کے بعد کھیمندر ہی کو مہا کوی کہلائے جانے کا افتخار حاصل ہے۔

کھیمندر کا سال ولادت 990 کے آس پاس مانا جاتا ہے جبکہ اُس نے 1065 عیسوی میں انتقال کیا۔ اس نے ایک خوشحال گھرانے میں دسویں صدی کے اخیر پر جنم لیا۔ اس کے والد کا نام پرکاشیندر اور دادا سندھو تھا۔ اس وقت کشمیر میں جو علوم رائج تھے کھیمندر نے ان سبھی کا بغور مطالعہ کیا اور اس طرح وہ ریاضی، علم نجوم، فلکیات، طب، جراحی، سیاست، معاشیات، شیومت اور بودھ مذہب کا نابغۂ روزگار دانشور بن گیا۔ اس کے مشاغل کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اسے نغمات، ناولوں اور خوبصورت شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے کھیمندر کے بارے

میں مزید تفصیلات بہم کی ہیں۔ کھیمیندر کے بارے میں جسے وہ کشمیر میں سنسکرت شاعروں کا تاج کہتے ہیں، صوفی لکھتے ہیں: ''وہ سری نگر میں جھیل ڈل کے کنارے اس جگہ پیدا ہوا جہاں آج نشاط باغ ہے۔اس کا باپ پرکاشیندر ایک امیر اور پڑھا لکھا شخص تھا جو شیومت کا زبردست پیرو کار اور ابھینو گپت کا شاگرد تھا جس نے کشمیر میں شیوازم کی بنیاد کو استوار کیا کھیمیندر اپنے باپ کے تین بیٹوں میں سے ایک تھا۔اس نے کئی اساتذہ کے ہاں شیومت کا علم حاصل کیا جن میں گنگاک سب سے قابل تھا۔ پچیس سال کی عمر میں کھیمیندر نے شادی کی۔ اس کے یہاں سومیندر نام کا بیٹا پیدا ہوا۔ راجہ اننت نے کھیمیندر کو شہزادے کلاج کی تربیت کرنے پر مامور کیا۔''[2]

کشمیری مورخ محمد دین فوق نے اگرچہ راجہ اننت کے بارے میں مفصل اطلاعات فراہم کی ہیں تاہم وہ کھیمیندر کے بارے میں خاموش ہیں۔ راج اننت دیو اپنی کم فہمی اور نادانی کی وجہ سے سارا اقتدار اپنے لالچی اور ہوس پرست مصاحبوں کے ہاتھوں میں دے گیا جو علی الاعلان عوام کو دن دہاڑے لوٹنے لگے اور ملک میں ایک طرح کی خانہ جنگی پھیلنے لگے۔فوق لکھتا ہے کہ: ''اننت دیو نے جالندھر کے راجہ کی چھوٹی لڑکی شری متی سے شادی کر لی تو اس رانی کا قدم کشمیر کے لیے مبارک ثابت ہوا۔شری متی نہ صرف حسن ظاہری میں بے نظیر تھی بلکہ زیور علم و ادب اور فہم و فراست میں بھی اس سے بڑھ کر آراستہ پیراستہ یگانۂ دہر خیال کی جاتی تھی۔ وہ بڑی حکمت عملی سے بے سمجھ راجہ کو راہ راست پر لائی اور وہ بھی خواب خرگوش سے جاگ کر عدل و انصاف اور رعیت پروری کی طرف متوجہ ہوا۔''[3]

ابھینو گپت کے اس شاگرد نے جو دولت کشمیری ادبیات کو عطا کی وہ عدیم المثال ہے۔ دیگر فنون لطیفہ کے علاوہ کھیمیندر سماجی طنز و مزاح کا موجد بن گیا۔ اس لحاظ سے آٹھ ابواب پر مشتمل اس کی تخلیق 'سے ماتر کا' روزمرہ کے گھومتے پھرتے حکیموں، بھکاریوں، دکاندار لڑکیوں، سادھوؤں، چوروں اور سماج کے دیگر نچلے پائے کے طبقات کی زندگی کے دلچسپ اور ظریفانہ بیانیہ کی ایک نادر مثال ہے۔

کھیمیندر کی تخلیقات میں رامائن منجری، بھارت منجری، برہت کتھا منجری، نرم مالا اور سے ماتر کا خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔اس کی ایک اور قابل ذکر تخلیق 'اوچتیہ وچار چرچا' کو ادبی تنقید کی دنیا میں ایک بے بدل کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔ کھیمیندر کے تخلیقی کارناموں کی تعداد چالیس کے قریب بتائی جاتی ہے۔کچھ تحقیق کاروں نے یہ تعداد چونتیس بتائی ہے۔ اس پر مہا ریشی ویاس کا اثر نمایاں ہے جسے وہ اپنا استاد مانتا تھا۔اس نے جس صنف ادب میں کمال حاصل کیا تھا وہ ہے طنز و مزاح جو بظاہر اس کا محبوب موضوع رہا ہے۔شار یکا منشی نے ان الفاظ میں کھیمیندر کے فن اور علمیت پر روشنی ڈالی ہے: ''وہ اننت راجہ کے دور میں ادبیات کا نابغہ روزگار تھا۔اس کی تخلیقات کا تعلق مختلف موضوعات سے ہے جن میں اوتاروں کی زندگی کا حسن سلوک، فن خطابت اور اس کے دور کے سماجی اور اقتصادی مسائل شامل ہیں۔اس نے کلاسیکی مسوادات کی تلخیص کی، سنسکرت کے حروف تہجی، وزن اور اعراب پر مفصل بحث کا آغاز کیا اور نئے شاعروں کی سرپرستی کرتے ہوئے کھیمیندر نے انھیں ایک ضابطہ عمل دیا جسے سارے ملک کے نوآموز شاعروں نے بہ سروچشم قبول کیا۔''[4]

تجزیہ کاروں کے بقول کھیمیندر پر گوتم بدھ کا گہرا اثر تھا جس سے متاثر ہو کر اس نے بدھ کی مختلف زندگیوں کے حالات قلم بند کیے۔ کھیمیندر کا یہ قول بہت حد تک گوتم بدھ ہی کے فلسفے کی عکاسی کرتا ہے: ''کچھ لوگ مال و دولت کی وجہ سے مغرور ہیں لیکن انھیں اچھی صفات کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ ایک برتن اگرچہ پانی سے لبا لب بھرا ہوتا ہے لیکن جب اس کی رسی ٹوٹ جاتی ہے تو وہ دھم سے کنویں میں گر جاتا ہے۔''

کشمیر میں تقریباً چودھویں صدی تک، جب یہاں اسلام متعارف ہوا، بودھوں اور ہندوؤں کے ادوار اقتدار میں سنسکرت کا اثر زندگی کے کئی شعبوں پر کسی نہ کسی طرح حاوی رہا ہے۔اس دوران فنون لطیفہ کے مختلف فلسفیانہ نکتوں کا احاطہ کرنے کی غرض سے اسی کلاسیکی زبان کا سہارا لیا جاتا رہا۔ادبیات، فلسفہ، گرامر، تحقیق و تنقید، دینیات، شعریات اور دیگر علوم کے حوالے سے کشمیری سنسکرت دانش وروں نے دنیا کے فکر و ذہن کو مالا مال کیا۔کلہن پنڈت کی اولین تاریخ کشمیر ''راج ترنگنی'' اس سلسلے کا سنگ میل کہلائی جائے گی۔

کلہن پنڈت کی طرح کھیمیندر نے بھی اپنی تخلیقات میں وطن مالوف کے بارے میں کچھ دلچسپ باتیں قلم بند کی ہیں۔مثلاً یہ کہ کشمیر کو پونچھ، راجوری وغیرہ سے ملانے والے مغل روڈ کو کھیمیندر نے نمک کی سڑک کا نام دیا ہے کیونکہ صدیوں تک اسی راستے سے پنجاب کی کانوں سے نمک کشمیر میں لایا جاتا تھا۔اس عہد ساز دانشور کے زمانے میں کشمیر اون کا بہت بڑا تجارتی مرکز تھا جب شمالی کشمیر کا قصبہ پٹن اس تجارت کے فروغ کی خاطر بھیڑوں اور مویشیوں کی بہت بڑی منڈی بن چکا تھا، کھیمیندر نے اس صنعت کا تفصیلی ذکر 'نرمالا' اور 'سے ماتر کا' میں کیا ہے۔[5]

کھیمیندر کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔اس کی یہ بھی وجہ ہے کہ اس نے خاص کر جو مزاحیہ اور طنزیہ کتابیں لکھیں ان میں اس نے سہل اسلوب میں اپنے تیکھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے ڈراموں کی تعداد تین بتائی جاتی ہے۔ للت رتن مالا برہت کتھا سے لی گئی ایک کہانی پر مبنی ہے۔کنک جانکی کا پس منظر رامائن کا ایک باب ہے اور چترا بھارت بھی مہابھارت کے ایک قصے سے ماخوذ ہے۔

کھیمیندر کی ادبی فن کاری اور علمی مہارت کے بارے میں انیسویں صدی تک بہت کم معلومات مہیا تھیں۔ 1871 میں اس کی گم شدہ کتابوں میں سے پہلی

کھیمیندر کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کی یہ بھی وجہ ہے کہ اس نے خاص کر جو مزاحیہ اور طنزیہ کتابیں لکھیں ان میں اس نے سہل اسلوب میں اپنے تیکھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے ڈراموں کی تعداد تین بتائی جاتی ہے۔ للت رتن مالا برہت کتھا سے لی گئی ایک کہانی پر مبنی ہے۔کنک جانکی کا پس منظر رامائن کا ایک باب ہے اور چترا بھارت بھی مہابھارت کے ایک قصے سے ماخوذ ہے۔

وہ سری نگر میں جھیل ڈل کے کنارے اس جگہ پیدا ہوا جہاں آج نشاط باغ ہے۔اس کا باپ پرکاشیندر ایک امیر اور پڑھا لکھا شخص تھا جو شیومت کا زبردست پیرو کار اور ابھینو گپت کا شاگرد تھا جس نے کشمیر میں شیوازم کی بنیاد کو استوار کیا کھیمیندر اپنے باپ کے تین بیٹوں میں سے ایک تھا۔اس نے کئی اساتذہ کے ہاں شیومت کا علم حاصل کیا جن میں گنگاک سب سے قابل تھا۔پچیس سال کی عمر میں کھیمیندر نے شادی کی۔ اس کے یہاں سومیندر نام کا بیٹا پیدا ہوا۔ راجہ اننت نے کھیمیندر کو شہزادے کلاج کی تربیت کرنے پر مامور کیا۔

کھیمیندر نے اپنی 'نرما ما لا' میں، جو راجہ اننت کے عہد میں لکھی گئی،انھی کائستھوں کے بارے میں لکھا ھے کہ وہ اپنے سرکاری عہدوں کا ناجائز استعمال کر کے عوام کی نجی زندگی میں دخل اندازی کرتے ھیں اور ان کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھتے ھیں۔اس نا قابل قبول طریق کار نے کائستھوں کو لوگوں کی نظروں میں قابل نفریں بنایا ھے۔ اُکالا نام کے بادشاہ نے تو ان کے اقتدار کو کچلنے کی غرض سے کئی اقدام کیے لیکن اس کے بعد اس طبقے نے پھر سر اٹھایا اور اپنی طاقت کو مجتمع کر کے از سر نو عام انسانوں کو ستانا شروع کیا۔

تخلیق کا پتہ چلا۔ پھر کم از کم اٹھارہ دیگر تخلیقات بھی دریافت ہوئیں۔

کھیمیندر اور کلہن دونوں نے ہندوؤں کی کائستھ ذات کا بھرپور مذاق اڑایا ہے کیونکہ یہ طبقہ عوام دشمن تھا اور محض اپنے مفادات کا نگہبان تھا۔لوگوں سے جو جزیہ وہ وصول کرتے تھے اس کا بیشتر حصہ ان کی جیبوں میں جاتا تھا۔ان دونوں مصنفین نے اسی لیے انھیں لالچی، بے ایمان، اخلاق باختہ اور مغرور کے خطابات سے نوازا ہے۔

کھیمیندر نے اپنی 'نرمالا' میں، جو راجہ اننت کے عہد میں لکھی گئی، انھی کائستھوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے سرکاری عہدوں کا ناجائز استعمال کر کے عوام کی نجی زندگی میں دخل اندازی کرتے ہیں اور ان کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔اس نا قابل قبول طریق کار نے کائستھوں کو لوگوں کی نظروں میں قابل نفریں بنایا ہے۔ اُکالا نام کے بادشاہ نے تو ان کے اقتدار کو کچلنے کی غرض سے کئی اقدام کیے لیکن اس کے بعد اس طبقے نے پھر سر اٹھایا اور اپنی طاقت کو مجتمع کر کے از سر نو عام انسانوں کو ستانا شروع کیا۔

کشمیر میں بودھ مت کو اشوک اعظم (304-232 BC) نے متعارف کیا جو کشان راجوں کے عہد تک پھلتا پھولتا رہا۔ یہ اس زمانے میں عام لوگوں کا پسندیدہ مذہب بن گیا تھا۔اس کی بدولت ذات پات کی بدعت ختم ہو چکی تھی، صرف برہمن لوگ اپنی بڑائی کو کسی حد تک قائم رکھے ہوئے تھے۔ بودھ دھرم چونکہ ذات پات کی فرقہ بندی کو تسلیم نہیں کرتا لہٰذا نچلے طبقے کے لوگ حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔اس کے برعکس اس دور میں ڈوم اور ڈومنیا اعلیٰ عہدوں پر فائز تھیں۔ راجہ چکرورمان کے دور میں تمام درباری عہدے ڈوموں ہی کے قبضے میں تھے اور ڈومنیاں راجہ کی منظور نظر رانیاں بنائی جاتی تھیں۔[6]

چودھویں صدی عیسوی میں سلطان زین العابدین المعروف بڈشاہ کے دور بادشاہی میں سنسکرت اور فارسی کا چلن رہا اور بڈشاہ نے کشمیری سنسکرت ادیبوں، فلسفیوں، شاعروں، تحقیق کاروں اور مورخوں کے کارناموں میں سے کئی ایک کو فارسی میں منتقل کروایا جن میں مہابھارت بھی شامل ہیں۔ بدقسمتی سے یہ بیش بہا علمی خزانے وقت کے ہاتھوں لٹ چکے ہیں۔ دراصل بڈشاہ نے اپنے متقدمین سنسکرت ادبا اور شعرا کے عدیم المثال تخلیقی سرمائے کا قصہ سنا تھا اور اس نے خود بھی ان میں سے کئی ایک کا بغور مطالعہ کیا تھا۔اس ضمن میں ابوالفیض فیضی کی بھگوت گیتا کے فارسی ترجمے کا علامہ اقبال نے بھی ذکر کیا ہے اگرچہ علامہ کو یہ ترجمہ پسند نہیں آیا تھا۔ 11 اکتوبر 1921 کو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ایک خط میں انھوں نے اس حوالے سے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے: ''اگر وقت نے اجازت دی تو میں نے گیتا کا اردو ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ نے فیضی کے ذریعہ کیا ہوا گیتا کا فارسی ترجمہ دیکھا ہوگا۔کوئی شخص ان کی تحریر کی عظمت سے انکار نہیں کرسکتا۔لیکن میرا خیال ہے کہ انھوں نے گیتا کا ترجمہ کرتے وقت اس کے متن اور طرز نگارش کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔میرے ذہن میں یہ بات واضح ہے کہ فیضی گیتا کی روح کو سمجھ نہیں پائے۔''[7]

بڈشاہ کی علم دوستی کے پیش نظر یہ قیاس بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس کے عہد میں کشمیر کے بلند مرتبہ سنسکرت عالموں اور قلم کاروں کی تحریروں سے بھی چیدہ چیدہ فن پارے فارسی میں منتقل کیے گئے ہوں کیونکہ اُس وقت فارسی دربای زبان تھی اور ہر سطح پر اس کی آبیاری بھی کی جاتی تھی۔ اگر ایسا ہے تو زمانے کی دست برد نے ہم سے یہ عظیم سرمایہ بھی چھین لیا ہے۔

بڈشاہ کی علم دوستی کے پیش نظریہ قیاس بھی کیا جاسکتا ھے کہ اس کے عہد میں کشمیر کے بلند مرتبہ سنسکرت عالموں اور قلم کاروں کی تحریروں سے بھی چیدہ چیدہ فن پارے فارسی میں منتقل کیے گئے ھوں کیونکہ اُس وقت فارسی دربای زبان تھی اور ہر سطح پر اس کی آبیاری بھی کی جاتی تھی۔ اگر ایسا ھے تو زمانے کی دست برد نے ھم سے یہ عظیم سرمایہ بھی چھین لیا ھے۔

کھیمیندر کی اصناف سخن میں طنز و مزاح کو زیادہ فوقیت حاصل ہے کیونکہ وہ اس فن کی تخلیق میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔لیکن اس نے اپنے دور کی خاص کر طوائفوں اور بدقماش عورتوں کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر اسے نقادوں نے آڑے ہاتھوں لیا ہے کیونکہ ایسی تحریروں میں فحش نگاری کا عنصر نمایاں ہے اور وہ بھی کھیمیندر بازاری زبان کا استعمال کر کے ورطۂ تحریر میں لایا ہے۔

کھیمندر نے اپنے ارد گرد رہنے والے عام انسانوں کو اپنے موضوعات میں ترجیح دی ہے جن کی خامیوں اور خوبیوں کو اس نے بعینہٖ اپنی تحریروں میں مقید کرلیا ہے۔ان خامیوں کی نشان دہی بجائے خود ان دنوں ایک انقلابی قدم تھا جب تقریر بازوں نے ہر شعبۂ حیات کے لیے خود ساختہ معیار قائم کیے تھے۔ کھیمیندر نے نہ صرف ایسی اجارہ داری کے خلاف بغاوت کی بلکہ اس نے خود سماج کے لیے ایسے اقدار متعین کیے جو عوام پرور تھے۔ ''اس نے ادب میں ترقی پسند خیالات کو اُس وقت پوری طرح ابھارا جب زندگی کی قدریں آمرانہ احکام کے تحت کچلی جارہی تھیں۔اس طرح کھیمیندر کی شخصیت میں قاری کو پیغمبر اور شاعر کا امتزاج صاف نظر آتا ہے۔''[8]

مجموعی طور پر کھیمیندر کو مورخوں اور تجزیہ کاروں نے کشمیر میں فنون لطیفہ کی دنیا میں طنز و مزاح کا بے مثال خالق اور بے تاج شہنشاہ مانا ہے۔

حواشی

(1) کھیمیندر، برج موہن چترویدی، ترجمہ چمن لال رینہ، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1989، ص 44-45

(2) کشمیر، کیپٹل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1996، جلد اول، ص 60

(3) تاریخ کشمیر، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، 2011 ص 260-261

(4) آن دی امپارٹنس آف کلچرل ہیری ٹیج، وِتستا۔

(5) اے ہسٹری آف کشمیر، پرتھوی ناتھ کول بامزئی، میٹرو پالٹن بک کمپنی، نئی دہلی، 1962، ص 226

(6) ایضاً، ص 18

(7) بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ، صلو چودھری، ملینیم آفس، 67، تھیز روڈ، کلکتہ، 2013، ص 14

(8) کے، این، دھر، گلمپسز آف کشمیری کلچر، وویکانند کیندر، کنیا کماری، جون 1984

Ghulam Nabi Khayal
15-Rawalpora Housing Colony
Srinagar-190005, Kashmir
Email:gulkhayal@gmail.com
Cell:0-9419005909

نسیم احمد نسیم

اردو میں طنز و مزاح کے ابتدائی نمونے

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس زبان میں ادب کی تخلیق کا آغاز دنیا کی بڑی زبانوں کی طرح شاعری سے ہوا۔ اس لیے اردو میں طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش شاعری میں پہلے پہل نظر آئے۔ امیر خسرو کے یہاں طنزیہ و ظریفانہ شاعری کا اکثر ذکر ہوتا ہے لیکن ایسا کوئی نمونہ کلام دستیاب نہیں جس سے یہ بات پائے استناد تک پہنچے۔ اس لیے یہ قیاس یا دعویٰ غیر معتبر ہے اور امیر خسرو اس کے بنیاد گزار نہیں ٹھہرتے۔ تاریخ ادب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو نثر و نظم میں طنز و مزاح کے اولین نقوش ہمیں میر جعفر زٹلی (1659-1713) کے یہاں ملتے ہیں جعفر زٹلی پہلا باضابطہ مزاح نگار ہے۔ اور اس نے اردو نثر و نظم میں اپنی ہزل، ہجو اور پوچ گوئی کے ذریعے اس رنگ سخن کو مستحکم کیا۔ یہ شاعر اور نثار گرچہ پھکڑ پن اور فحش گوئی کے معاملے میں بدنام اور مطعون تھا لیکن سچ ہے کہ اس رنگ سخن میں اولیت کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے۔ اگر جعفر کے یہاں فحش گوئی کو منہا کر دیا جائے تو طنز و ظرافت کی بہت سی ایسی مثالیں مل جائیں گی جسے کسی طور نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس کے یہاں نثر و نظم میں ان عناصر کے جو نمونے دستیاب ہیں ان کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے لکھا ہے کہ:

''جعفر زٹلی کے ہاں ملنے والے نثری نمونوں میں بعض ایسے ہیں جو بالکل ہی فارسی نثر کے قریب ہیں۔ بعض نثر پاروں میں فارسی اور اردو کا ملا جلا اسلوب ہے اور کچھ نمونے ان کی نثر میں ایسے بھی مل جاتے ہیں جو موجودہ اردو زبان کے بالکل قریب محسوس ہوتے ہیں مثال کے طور پر ان کا مزاحیہ انداز میں لکھا ہوا طبی نسخہ 'چورن امساک و ہاضمہ طعام' ہے۔ جعفر کی تحریروں میں اگرچہ ابتذال، فحاشی، پھکڑ پن، اکھڑ پن اور گالی گلوچ، سب کچھ ملتا ہے لیکن ظاہر ہے یہ تمام غیر اخلاقی رویے اردو مزاحیہ نثر میں ان کی اولیت پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔''

(اردو نثر میں طنز و مزاح۔ اشفاق احمد ورک۔ ص 84-83)

یہ امر مسلم ہے کہ جعفر سے قبل اردو نثر و نظم میں طنز و ظرافت کی کچھ مثالیں تو ملتی ہیں لیکن یہ اتنی غیر واضح اور دھندلی ہیں کہ ان کو باضابطہ اور وثوق کے ساتھ بطور سند نہیں پیش کیا جا سکتا۔ جعفر کے یہاں جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ باضابطگی کے ساتھ طنز و مزاح کا التزام نظر آتا ہے۔ ایک عرصے تک اس کو صرف اس لیے نظر انداز کیا جاتا رہا کہ وہ فحش گو ہے اور پوچ گوئی اس کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ جبکہ اس کے یہاں خالص اور سنجیدہ طنز و مزاح کے نمونے بھی کم نہیں ملتے۔ اس کا دوٹوک اور جارحانہ انداز نہ صرف حقیقت پسندی کا عکاس ہے بلکہ اس کے عہد کا شہر آشوب بھی ہے۔ اس نے اپنی حق گوئی اور بے باکی کے ذریعے اپنے گرد و پیش کی ناہمواریوں اور سیہ کاریوں کو اجاگر کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی اسی حق گوئی نے بالآخر اس کی جان بھی لے لی۔ یہ واقعہ فرخ سیر کے ابتدائی دور کا ہے۔ فرخ سیر جب تخت شاہی پر متمکن ہوا تو سابقہ رواج کے مطابق اس نے بھی اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ اس کے سکے پر یہ شعر درج تھا۔

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر
بادشاہ بحر و بر فرخ سیر

فرخ سیر چونکہ ایک خود پرست ظالم حکمراں تھا اور کئی اہم اور اہل علم اشخاص کو قتل کروا چکا تھا۔ اس لیے جعفر زٹلی کو اس کی خودستائی کا یہ انداز نہیں بھایا۔ اس نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر سکے کے شعر کی تحریف کر دی اور اس کی تسمہ کشی کو براہ راست اپنا نشانہ بنایا۔

سکہ زدہ بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ تسمہ کش فرخ سیر

فرخ سیر نے جب یہ شعر سنا تو حد درجہ غضب ناک ہوا اور اس نے فوری طور پر جعفر زٹلی کو قتل کروا دیا۔ جعفر کے اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تحریف کے ساتھ تصحیف کے فن میں بھی طاق تھا۔ اس کے ذریعے اکثر مقامات پر اس نے طنز و مزاح کے موتی بکھیرے ہیں۔ نثر و نظم میں ان اوصاف کی نشاندہی کرتے ہوئے سید عبداللہ نے تحریر کیا ہے:

'' اردو فارسی ادب میں تحریف و تصحیف کی بھی

مثالیں موجود ہیں۔ ان میں بیشتر کو ہزل میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں حکایت، لطیفہ، ہزل، استہزا، نکتہ نجی، معما، چیستاں، یعنی ظرافت کی ہر صورت سے فائدے اٹھائے جاتے ہیں۔''

(مسلمانوں کے ادب میں مزاح کے تنوعات۔ سید عبداللہ، مطبوعہ نقوش لاہور، دسمبر 1959، ص 238)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اگرچہ یہاں جعفرزٹلی کو راست طور پر موضوع نہیں بنایا ہے لیکن وہ جن طنزیہ و مزاحیہ حربوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں وہ سب کے سب اولاً جعفر کے یہاں ہی پائے جاتے ہیں۔ اس نے مذکورہ تمام حربوں اور طریقوں کو اپنی نثر و نظم میں کمال خوبی کے ساتھ برتنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے یہاں تحریفات کی بہتات ہے۔ وہ چونکہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کو اکثر ایک ساتھ لے کر چلتا تھا اس لیے تحریف کی گنجائش وافر تھی اور اس سے پیدا شدہ لطف اور حظ کی بات بھی کچھ اور ہی تھی۔ اس فن میں اس کے بہت سے تلخ و شیریں نمونے موجود ہیں۔ جعفر کی تحریف نگاری کی بابت بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ظفر کمالی کا ایک اقتباس یہاں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کے مطابق:

''...... ان کے (جعفر زٹلی) یہاں جو رجحان اہم ہے وہ تحریف نگاری کی غیر معمولی قوت ہے۔ رقعہ نویسی اور قدیم مضمون نویسی کے نمونوں میں، جو انھوں نے گفتگو نامہ کی شکل میں پیش کیے ہیں یا ''درحسب حال زمانہ می گوید'' کے عنوان سے پیش کردہ رقعے میں یہ صورت دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے علاوہ ضمانت نامہ، شرح مضامین، شرح نکاح نامہ، نسخہ چورن امساک و ہاضمہ طعام، در بار شرارت اور شرح بعض اصلاح احوال می گوید''۔

وغیرہ میں ان کی تحریفات کے بہترین نمونے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیں:

''بعد دعائے گوش وہوش، منہتیان خدا پہچان و خداوندان کہ کھپریل و چھپر و چھاون پوشیدہ و مخفی نماند...... مثل لکھنؤ بندریا چابے پان اڑگئی، چھپارہ گئے کان۔''

(اردو نثر میں ظرافت کے مختلف رجحانات۔ ظفر کمالی، مطبوعہ زبان و ادب پٹنہ مئی جون 1991، ص 17)

جعفر کے یہاں جیسا کہ عرض کیا گیا کہ طنزیہ و مزاحیہ عناصر نثر و نظم دونوں میں بکثرت ملتے ہیں اس نے آشوب ذات، آشوب زمانہ، اختلال تہذیب، فالنامے، تہذیب ذات اور متفرقات کے تحت 50 سے بھی زیادہ نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان نظموں کی تخلیق کا مقصد ہی طنز و مزاح اور نوک جھونک کا ماحول سازگار کرنا ہے۔ جعفر کی بے باکی اور بے خوفی کا عالم یہ ہے کہ وہ معاشرے کی بڑی سے بڑی اور اہم سے اہم شخصیات کے عیوب کو بھی ظاہر کرنے سے نہیں چوکتا۔ اس کے اس نوعیت کے حملوں کی زد میں ثقہ اور پارسا لوگ بھی آنے سے نہیں بچتے۔ بعض مقامات پر وہ اس طرح کھلتا ہوا نظر آتا ہے کہ طبع نازک پر بہت گراں گزرتا ہے۔ حصہ نظم سے بطور مثال ایک نظم 'درصفت تنزل حسن و جوبن' کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں جہاں اس نے بے ثباتی حسن کو ظاہر کیا ہے وہیں درمیان میں لفظوں کی بازیگری سے مزاح کی کیفیت بھی پیدا کرنے کی خوب کوشش کی ہے۔

مراعشق والسبیل پن از تو بود
شب و روز انکھیل پن از تو بود
طفیل تو بود ایں کلیل و پھلنگ
بسیل تو بود اسیں الول وترنگ
بوڑھاپا بود مغفرت خواہ تو
رود قالب گور ہمراہ تو
جوانی و جوبن پڑو بھاڑ میں
کہ آخر ٹھکانہ اسی غبار میں

جعفر کا ایک بڑا خاصہ یہ تھا کہ وہ اپنے عہد کے رواج کے مطابق قصیدہ گوئی اور بیجا مدح سرائی سے بچتا تھا۔ اس کے کلام کے غائر مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے سے حد درجہ کبیدہ خاطر اور نالاں تھا۔ وہ زچ آکر کبھی کبھی اپنے جذبات و احساسات کو اس طرح پیش کرتا تھا کہ لوگ برافروختہ ہوجاتے تھے۔ خاص طور سے سفید پوش اشخاص اس سے حد درجہ خفا رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے شہر کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جانے کا قصد بھی کرلیتا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نعیم احمد اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سیاسی ادبار، نظم و نسق کی خرابی، معاشرتی انتشار اور اخلاقی پستی کے یہی رنگ جعفر کی شاعری میں بھی اپنی تمام تیزی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اسے اپنے دور کی خامیوں اور خرابیوں کا شدت سے احساس تھا۔ بعض وقت وہ اکتا کر یہ سوچنے لگتا کہ ایسے معاشرے سے راہ فرار اختیار کرلے۔ چنانچہ ایک قصیدے میں کہتا ہے۔

جس شہر میں دلبر نہیں اشراف کا آدر نہیں
قاضی شرع کا ڈر نہیں اوس شہر سے کہسار بہ

(کلیات جعفر زٹلی، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، ص 25)

لیکن جعفر زٹلی نے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنا شہر نہیں چھوڑا، قریہ نہیں چھوڑا، وہ اسی معاشرے میں رہ کر اس کے کریہہ مناظر کو پیش کرتا رہا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا یہ انداز اس کے عہد اور اس کے معاشرے کے لیے ایک عجوبہ ہی تھا کیونکہ اس وقت کے ماحول میں سرکشی اور امرا و روسا سے اختلاف ایک طرح سے بغاوت کے مترادف تھا۔ ایسی صورت حال میں جعفر کی صداقت پسندی، اس کی صفائی اور اس کی پیش قدمی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے یہاں دردمندی، آپسی ہم آہنگی اور بھائی چارہ کے ماحول کو پھلتا پھولتا ہوا دیکھنے کی شدید تمنا اور خواہش نظر آتی ہے۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جب اس کی ہزلیات میں طنز و مزاح کے مہذب اور شائستہ عکس جھلملاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جعفر زٹلی کے بعد اردو کی قدیم نثر میں مذکورہ عناصر کا سراغ ہمیں حاتم (1699-1773) کے یہاں بھی ملتا ہے۔ حاتم خالصتاً شاعر تھے، نثر سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ لیکن شاہ محمد کمال کے تذکرے 'مجمع الانتخاب' میں ان کا ایک نثر پارہ موجود ہے۔ وہ نثر پارہ نہ صرف پر لطف اور پر مزاح ہے بلکہ شستہ اور شگفتہ ظرافت کا عمدہ نمونہ بھی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اپنی تصنیف 'اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر' میں ذکر کیا ہے۔ حاتم کا مذکورہ نثر پارہ جعفر زٹلی سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ یہ ایک طبی نسخہ ہے، جس کا بڑا سا عنوان یہ ہے ''نسخہ مفرح الضحک معتدل من طب الظرافت وجنسے بھلا چنگا کھائے سو بیمار ہوجائے''

اس طول و طویل عنوان والے نثر پارے کا پس منظر محققین نے یہ بتایا ہے کہ جب حاتم نواب عمدۃ الملک امیر خاں کی ملازمت میں آگئے تو نواب کی طبیعت اور جولانی پر آگئی۔ وہ پہلے سے ہی طبعاً ظریف تھے۔ اس لیے ایک دن انھوں نے حاتم کو اس نسخے کی تخلیق پر آمادہ کرلیا اور حاتم نے نہایت ہی خوبصورت، مسجع اور مقفی اسلوب میں یہ نسخہ ترتیب دے دیا۔ اس نسخے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زبان کی شگفتگی اور ستھرائی جعفر سے زیادہ ہے۔ فارسیت کا غلبہ یا فارسی آمیز اور اردو کا چلن بھی کم ہے۔ اس میں فحش گوئی کے بجائے ستھرا ہوا مزاح دیکھنے کو ملتا ہے۔ ذیل میں یہی نسخہ نقل کیا جاتا ہے:

''چاندنی کا روپ، دوپہر کی دھوپ، چڑیل کی روٹی، بھتنے کی لنگوٹی، پریوں کی گزر، دیو کی نظر تیں تیں ٹکے بھر، کبوتر کی غٹرغوں، مرغی کی کٹکوں، چیل کی چل چل، کیڑوں کی کلبل، جگائی شتر، بکرے کی میں میں، کوے کی ٹیں ٹیں، آٹھ آٹھ رتی، اوس میں سکھا کر، گالے کی سل پر، ممی کی پٹی سے پیس کر، پھر مکڑی کے جالے کی صافی میں چھان کر، فرشتے کی موت میں تشخش کے ساتویں حصے برابر

گولی باندھے، وقت نزع کے بچّے کے دودھ سے ایک کف پا پھانکے، کھانے، پینے، سونے، بیٹھنے، دیکھنے، بولنے، سننے، سونگھنے سے پرہیز کرے۔ خوب بھوک لگے تو اسے نوے پیزاروں سے زیادہ نہ کھائے۔ حاتم کہے ایک روگ سے ستر روگ پیدا کرے۔''

حاتم کے اس پر لطف اور پر مزاح نثر پارے کے علاوہ بھی نثر میں بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ اب طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش کی تلاش کے لیے قدیم داستانوں کی طرف توجہ لازمی ہے۔ اردو کی قدیم داستانوں کے ہزاروں صفحات پر اس کے بے شمار نقوش ملتے ہیں۔ طلسم ہوش ربا، داستان امیر حمزہ، ہزار داستان اور بوستان خیال وغیرہ میں ہنسنے ہنسانے کے بجائے غیر متوازن اور مضحکہ خیز صورت وشبیہ ابھارنے پر زیادہ زور نظر آتا ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ داستانوں میں مزاحیہ حصے زیادہ تر پست اور سوقیانہ قسم کے ہیں۔ یہ اپنے دور اور ماحول سے مناسبت رکھتے ہیں۔ چونکہ داستانیں تفریح طبع اور دل بستگی کا ذریعہ تھیں اس لیے ان میں فطری طور پر طنز و ظرافت کا ہونا لازمی تھا۔ داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال میں عیاروں کے ذریعے جو تفریحی فضا ہموار کی گئی ہے، وہ پر کشش ہی نہیں تحیر خیز بھی ہے۔ عمرو عیار کی چالاکی اور عیاری کے متعلق ''فن داستان گوئی'' میں کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ یہ پیشہ ور ظریف ہوتے تھے اور ان کی زندگی کا مقصد ہی ہنسنا ہنسانا تھا، لوگوں پر پھبتیاں کسنا اور انھیں بے وقوف بنانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس خیال کی روشنی میں اس بات کی توثیق ہوجاتی ہے کہ عمرو عیار کے جسمانی نقائص، رنگ ڈھنگ، بخالت اور ہر دم پینترے بدلتے رہنے جیسے طور اطوار واضح طور پر داستانوں میں جا بہ جا موجود ہیں۔ اس قبیل کی داستانوں کا جائزہ لیتے ہوئے وزیر آغا کچھ اور ہی نظریہ رکھتے ہیں۔ ملاحظہ کریں:

''داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال کی ظرافت زیادہ تر طفلانہ مذاق کو تسکین پہنچاتی ہے۔ یوں بھی ان داستانوں کے پلاٹ ایک بہت بڑے پیانے میں آنکھ مچولی کا پس منظر پیش کرتے ہیں اور ان کے مطالعے سے جو ہنسی بیدار ہوتی ہے وہ زیادہ تر ہیرو کی لحاتی فتح یا عیاروں کی مخصوص چالاکی سے تحریک لیتی ہے۔''

درج بالا اقتباس میں وزیر آغا نے مذکورہ بالا داستانوں میں موجود مزاحیہ عناصر کو گرچہ بہت کم تر اور نا قابل ذکر تصور کیا ہے لیکن عیاروں کے کردار کو بہر حال تسلیم کرلیا ہے۔ مزاح کی سطح خواہ جو بھی ہو لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ ابتدائی داستانوں میں عیاروں یا دوسرے بہت سے مضحک کرداروں کی حرکات وسکنات سے ہنسنے ہنسانے کا ماحول تیار کیا جاتا تھا۔ یہ کردار زیادہ تر بادشاہوں اور امرا کے اردگرد موجود رہتے تھے اور ان کی ذہنی آسودگی کا سامان مہیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ چہل بازی، الھڑ پن، فقرے بازی اور پھکڑ پن کے بہتیرے نمونے ان داستانوں کا دلچسپ اور ضروری حصہ ہوتے تھے۔

'بوستان خیال' کے مطالعے کے دوران بھی یہ احساس شدت سے جاگزیں ہوتا ہے کہ اس میں عمداً مزاح پیدا کرنے کی کوشش ہوئی ہے۔ ہر قدم پر ایسے حالات وواقعات سامنے آتے ہیں جو نہ صرف تجسس پیدا کرتے ہیں بلکہ ظرافت کے مختلف رنگ بھی بکھیرتے ہیں۔ اس داستان میں طلسمی اور ما فوق فطری کردار بھی ہمیں متحیر کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ ہنسنے ہنسانے کا ماحول بھی سازگار کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بوستان خیال ہو یا داستان امیر حمزہ، ان میں طنز و مزاح کا معیار اور انداز پیش کش اکثر پست اور کم تر ہے۔ اس طرز کے رواج کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان اذہان کے لیے فرط وانبساط کا سامان ہوتے تھے جو یا تو کم عقل ہوتے تھے یا بچکانہ اور سستی ظرافت کے دل دادہ ہوتے تھے۔ ان میں جہاں ایک طرف عمرو عیار ہیں تو دوسری جانب سلطان ابوالحسن جوہزان کے دوست احباب ہیں۔ وہ اپنی عیاریوں اور مضحکہ خیزیوں کے ذریعے ابتدا تا آخر مزاحیہ صورت حال بنائے رکھتے ہیں۔ معیار مزاح جو ہو لیکن یہی صورتِ حال اور ماحول ان طول طویل داستانوں کو گوارا کرنے اور انھیں پڑھوانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ عناصر داستانوں کے واقعات میں توازن اور اعتدال پیدا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں داستان گو کی فن کاری اور دور اندیشی کی داد دینی پڑتی ہے۔ اسے احساس ہے کہ صرف قصوں، فتوحات، مہمات اور ضمنی وذیلی واقعات ان طویل ترین داستانوں کو نہیں پڑھوا سکتے۔ اس لیے ان میں ہنسی ٹھٹھول اور چہل بازیوں کو شامل کرنا ضروری ہے تاکہ ان کا لطف شروع سے اخیر تک قائم رہے اور قاری یا سامع اس کے سحر میں اس طرح آجائے کہ اسے اختتام کی خبر ہی نہیں لگے۔

'داستان امیر حمزہ' اور 'بوستان خیال' جیسی بزرگ داستانوں کے علاوہ، طوطا کہانی، حاتم طائی، اور 'الف لیلیٰ' میں بھی طنزیہ ومزاحیہ عناصر موجود ہیں لیکن ان کا رنگ مذکورہ داستانوں کی طرح گہرا نہیں ہے۔ یہی حال سید انشا کی 'رانی کیتکی کی کہانی' کا بھی ہے۔ مگر مہجور کی داستان 'نورتن' ظرافت سے معمور ہے۔ اس میں نسوانی کردار، لطائف، احمقوں کی نقالی، افیومیوں کی کارستانی اور منحوسوں کی عکاسی کی بھرمار ہے۔ لیکن یہاں بھی وہی مسئلہ ہے کہ پھکڑ پن اور ابتذال گوئی اس کی اہمیت اور افادیت کو زائل کرتے ہیں— ان داستانوں کے علاوہ غلام علی آزاد امروہوی کا قصہ، 'بلی نامہ'، میر امن کا 'باغ وبہار'، رجب علی بیگ سرور کا 'فسانۂ عجائب'' اور رتن ناتھ سرشار کا قصہ 'فسانۂ آزاد' بھی طنز وظرافت کے بہترین نقش ثبت کرتے ہیں۔ ان داستانوں میں فسانۂ عجائب اس لیے زیادہ اہم ہے کہ اس میں طنز وظرافت کا باضابطہ اہتمام نظر آتا ہے۔ اکثر مقامات پر چست مکالمے، فقرے اور شوخی وشرارت کے گل بوٹے اپنی بہاریں دکھاتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں ایک اقتباس دیکھیں:

''ایک خواص.......... بہ اشارۂ ملکہ آگے بڑھ، پوچھا ''کہو جی! مسافر تمہارا کدھر سے آنا ہوا؟ اور کیا مصیبت پڑی ہے جو اکیلے......کوئی سنگ نہ ساتھ۔ شہزادے نے مسکرا کر کہا ''مصیبت تجھ پر پڑی ہوگی۔ کہو تو تم سب کی کم بختی......نصیبوں کی تختی ہے جو خاک پھانکتی، مسافروں کو جھانکتی تاکتی، چڑیوں کی طرح سر شام پھرتی ہو۔ مسافروں پر پھسل پھسل کر گرتی ہو۔ ملکہ یہ کلمہ سن کر پھڑک اٹھی......ہنس کر کہا: خوب! ایک نہ شد دو شد! صاحب چونچ سنبھالو! ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالو...... بھلا وہ تو وہ کہہ کے سن چکی ہوں میں آپ سے پوچھتی ہوں حضور والا کس سمت سے رونق افروز ہوئے؟ جان عالم نے کہا: چہ خوش! ہم حضور کا ہے کو، مزدور ہیں، آپ اپنے نزدیک نہیں بہت دور ہیں۔ جیتے جی چار کے کاندھے چڑھی کھڑی ہو؟ بے شک حضور ہو، عارضی جاہ وحشم پر مغرور ہو۔''

(فسانۂ عجائب: رجب علی بیگ سرور)

'فسانۂ عجائب' میں اس طرح کی مکالمہ نگاری اور حاضر جوابی دوسری جگہوں پر بھی موجود ہے۔ اس داستان میں 'بندر کی تقریر' کے بھی بعض حصے خاصے دلچسپ اور مزیدار ہیں۔ جن کے ذریعے پر خلوص طریقے سے زندگی کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کو منعکس کرنے کی سعی ہوئی ہے۔ داستانوں کے طنز، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی کو ذلیل ورسوا کرنے کے لیے نہیں بلکہ محض تفنن اور شگفتہ ماحول کی سازگاری کے لیے ہوتے تھے۔ مذکورہ بالا داستانوں کے علاوہ بعد کی بہت سی داستانوں میں بھی طنزیہ وظریفانہ عناصر کی کمی نہیں لیکن یہاں صرف ابتدائی نقوش کو ہی ظاہر کرنا مقصود تھا۔

جہاں تک اردو شاعری میں طنز ومزاح کے ابتدائی نمونوں کی بات ہے تو اس کا پہلا مرکز ہمیں دکن میں نظر

آتا ہے۔ دکنی شاعروں کے یہاں روایتی رنگ شاعری کے علاوہ اکثر معاصرانہ چشمک، نوک جھونک، اور فقرے بازیوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ یہ چشمکیں اکثر کھینچا تانی کی صورتیں بھی اختیار کرلیتی ہیں جیسے دکن میں ملاوجہی اور غواصی اور پھر سیوک اور لطیف کی چشمکیں بہت تذکرے میں رہی ہیں۔ ملاوجہی بلند رتبہ شاعر تھا اور بادشاہ قلی قطب شاہ کا درباری تھا۔ وہ اس لیے حد درجہ بے باک تھا۔ وہ اپنے معاصر غواصی کو زیر کرنے کے لیے بادشاہ کے طرح طرح کان بھرتا رہتا تھا۔ غواصی کے خلاف اکثر طنزیہ واستہزائیہ انداز اپناتا تھا۔ ولی بھی اپنے ہم عصر شعرا سے دست وگریباں تھے۔ شاہ ناصر علی اور غواصی وغیرہ سے چشمک کی ایک مثال یہ ہے۔

ترے شعر ایسے نہیں ہیں فراقی
کہ جس پہ رشک آوے گا ولی کوں

ولی کے علاوہ سراج اورنگ آبادی بھی اس سلسلے کا ایک اہم اور سرگرم نام ہے۔ سراج کی نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ، اپنے معاصرین میں بالخصوص عاجز اور غواصی سے رہی ہے۔ اس باہمی نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ کے علاوہ اردو کی ابتدائی شاعری میں اکثر واعظین اور ثقہ وپارسا حضرات بھی ہدف بنتے رہے ہیں اور بیشتر شعرانے ان کے ذکر و اذکار سے مزاح کے پہلو اجاگر کیے ہیں۔ اس چھیڑ چھاڑ کے اسباب وعلل اور پس منظر کو بیان کرتے ہوئے وزیر آغا رقم طراز ہیں:

''اردو شاعری میں زاہد سے چھیڑ چھاڑ کی روایت اس نفسیاتی وجہ کے علاوہ اپنے زمانے کی سماجی بدنظمی، قنوطیت اور ماحول کے تحت نت نئے قواعد اور ضوابط کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر بھی نمودار ہوئی۔ دراصل اس طویل زمانے میں جمہوریت کے تصور کی عدم موجودگی اور قومی کردار کے باعث ملک کے ایک طبقے نے سیاسی و سماجی مسائل پر براہ راست نکتہ چینی کی بجائے مقاومت اور کمترین کا راستہ اختیار کیا اور اپنے جذبات کی تند وتیز ہوا کو ایک حد تک زاہد اور محتسب کی طرف بھی موڑ دیا۔ نتیجتاً ولی کے زمانے سے ریاض کے زمانے تک یہ طریق کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے''

(اردو ادب میں طنز ومزاح: وزیر آغا ص 75)

مذکورہ چھیڑ چھاڑ کی ابتدا جو باضابطہ طور پر ولی دکنی کے یہاں ہوئی تھی وہ آگے چل کر بہتوں کے یہاں خاص وسیلہ بن گئی۔ ولی کے یہاں جہاں متصوفانہ اور سنجیدہ رنگ وآہنگ کی کثرت ہے وہیں زاہد ومحتسب سے چھیڑ چھاڑ کی مثالیں بھی کم نہیں ہیں۔

آسماں اوپر نہ بوجھو چادر ابر سفید
جا نماز زاہد عزلت نشیں برباد ہے
زاہد کو مشل دانۂ تسبیح ایک آن
کوچے ستی رہا سوں نکلنا محال
شیخ مت گھر سے نکل آج کہ خوباں کے حضور
گول دستار تیری باعث رسوائی ہے

مندرجہ بالا اشعار میں مزاح کا عنصر کم اور طنزیہ لب ولہجہ غالب ہے۔ مضمون کے آغاز میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ دنیا کی بیشتر زبانوں کی ادبیات میں طنز ومزاح کے آثار روز اول سے نظر آتے ہیں۔ ذرا سا زمانی فرق کے ساتھ امیر خسرو کی کہہ مکرنیاں، ان کے دو سخنے اور انمل بھی طنز و ظرافت کے بہترین نمونے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ معروف انمل دیکھیں، کس قدر پر مزاح ہے۔

کھیر پکائی جتن سے
چرخا دیا چلا
آیا کتا کھا گیا
تو بیٹھی ڈھول بجا
لا پانی لا

اس انمل سے وہ لوگ اور بھی لطف حاصل کرسکتے ہیں جو اس کے پس منظر یعنی خسرو اور پنہارن کے قصے سے واقف ہیں۔ اردو طنز ومزاح کے ابتدائی دنوں میں ایسے بے جوڑ، انمل اور بے ربط الفاظ سے بہتیرے مقامات پر بامعنی مزاح کی تخلیق ظاہر ہوتی ہے۔ شمالی ہند کے ابتدائی شاعروں میں فائز بہت معروف رہا ہے۔ فائز نے بھی فارسی شعرا کی طرح اپنے غزلیہ اشعار میں چھیڑ چھاڑ اور طنز ومزاح کو خوب برتا ہے۔ تین اشعار ملاحظہ کریں:

رات دن تو رہے رقیباں سنگ
دیکھنا تیرا مجھ محال ہوا
سخت کافر ہے وہ ادھری، آہ!
جن سکھایا تجھ، کرم مت کر
تجھ بینے بیچ مہ رووفا کوں اثر نہیں
کچھ قتل بے گناہ سوں تجھ کوں حذر نہیں

فائز کے یہاں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی طنزیہ واستہزائیہ عناصر کی کمی نہیں۔ فائز کے بعد حاتم کے یہاں بھی اپنے معاشرے پر طنز کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ پچھلے صفحات میں حاتم کا ذکر بطور شاکر کیا گیا ہے۔ یہاں حاتم کے کچھ اشعار دیکھیں۔ یہ اشعار گرچہ اپنے عہد سے نالاں ہوکر حاتم نے کہے تھے لیکن آج کے دور میں بھی ان کی معنویت برقرار ہے۔

حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے
جو چور تھے وہ ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے
جو زیر دست تھے ان دنوں میں زور ہوئے
جنھوں کو زور تھا سو اب مثال مور ہوئے
جو خاک چھانتے پھرتے تھے، سو ہوئے زردار
ہمارے دیکھتے ہی کچھ زمانہ اور آیا
دلوں سے مہر گئی اب جفا و جور آیا
نجیب کیا کریں دنیا کا اور طور آیا
کمینے پھیل گئے پاجیوں کا دور آیا
گلی وکوچوں میں بن کے سجیں دکھاتے ہیں

مندرجہ بالا شعری نمونوں میں جیسا کہ ظاہر ہے، طنز کی کارفرمائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اگر مزاح کی کیفیت گہری نہیں تو ابتذال اور پھکڑ پن بھی زیادہ نہیں ہے۔ اخیر میں چند اشعار اور ملاحظہ کریں:

حقیقت سوں تیری مدت ستی واقف ہیں اے زاہد
عبث ہم پختہ مغزاں سوں نہ کر اظہار خامی کا

شاعری میں ولی کے اس انداز سے متاثر ہوکر بہت سے شعرانے اشعار کہے اور اپنے اپنے طور پر ندرت وجدت کے گل بوٹے کھلائے۔ اس ضمن میں ولی کے بعد کے شعرا کے اشعار بھی جڑتے ہیں۔

میر سنگ مزار پہ فریاد
رکھ کے تیشہ کہے یا استاد

میر تقی میر

تقوی کا اس کے موسم گل نے کیا یہ رنگ
زاہد کو خانقاہ سے مے خانہ لے گیا

سودا

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پہ
اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پہ

انشاء

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

شیفتہ

مختصر یہ کہ اردو کی قدیم نثر ہو یا قدیم شاعری ایک مخصوص قسم کا طنزیہ وظریفانہ ماحول آغاز سے ہی سازگار دکھائی دیتا ہے۔ جعفر زٹلی سے ہوتے ہوئے سودا، انشاء اور شیفتہ تک کے نثری اور شعری نمونے جن کے متعلق مختصراً اشارہ کیا گیا، ان کے علاوہ طنزیہ ومزاحیہ تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ جن پر بالتفصیل اور صراحت کے ساتھ لکھنے کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔

■

Dr. Naseem Ahmad Naseem
Near Mirshikar Toli Masjid, Kali Bagh
Bettiah-845438 (Bihar)

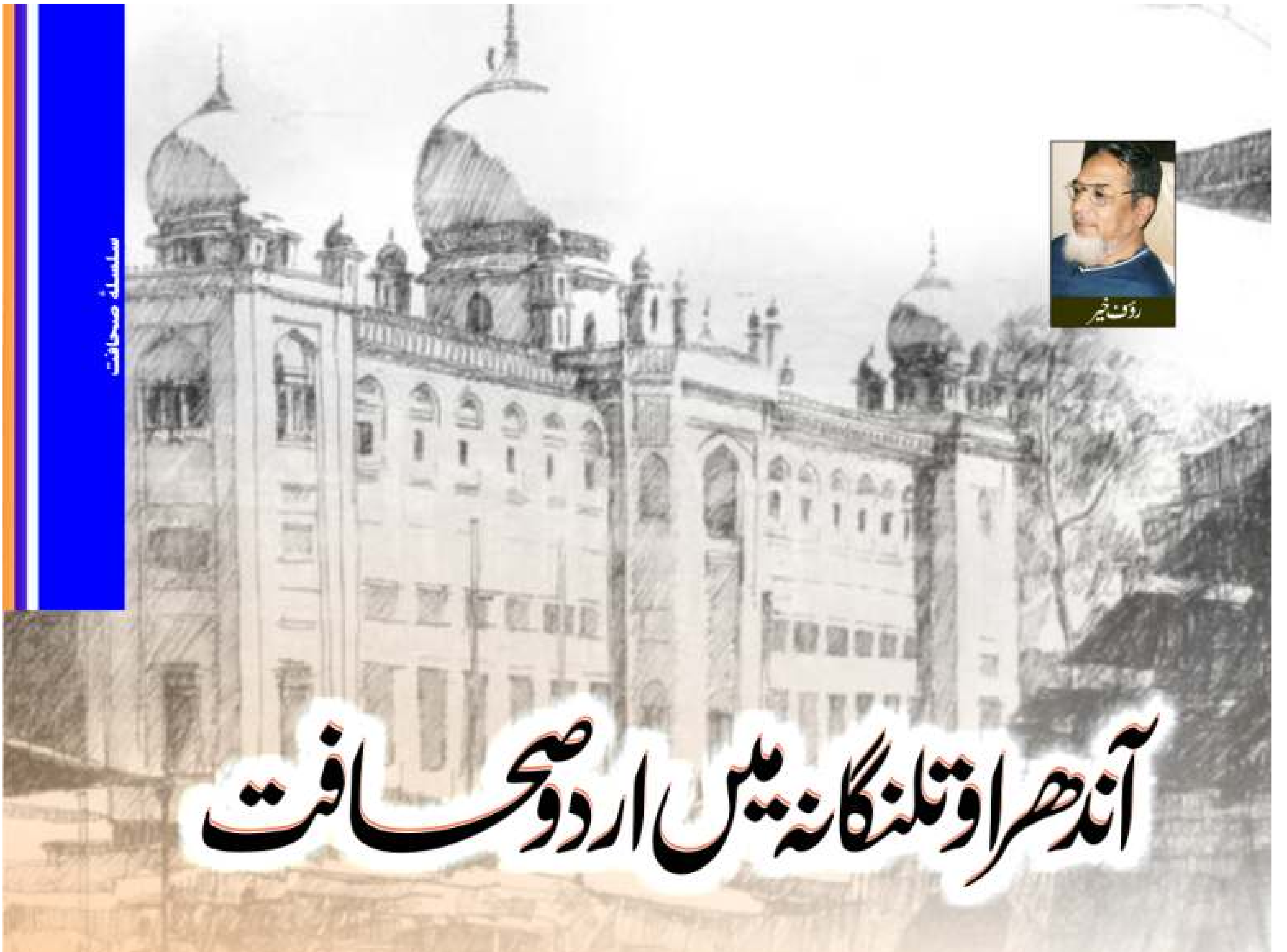

رؤف خیر

آندھرا و تلنگانہ میں اردو صحافت

ادب وصحافت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اچھا ادیب اچھا صحافی ہوسکتا ہے۔ جیسے مولانا ابوالکلام آزاد (مدیر الہلال والبلاغ)، مولانا ظفر علی خان (مدیر زمیندار)، مولانا محمد علی جوہر (مدیر ہمدرد و کامریڈ)، شاہد احمد دہلوی (مدیر ساقی)، احمد ندیم قاسمی (مدیر فنون) وغیرہ وغیرہ۔

ایک اچھا صحافی ایک اچھا ادیب بھی ہو جاتا ہے جیسے محمد طفیل نے اپنے رسالے 'نقوش' کی ادارت سنبھالنے کے بعد کئی بے مثال خاکے لکھے جو ادبی شاہ کار ٹھہرے۔ ان کے خاکوں پر مشتمل کتابیں ہیں جناب، صاحب، محترمی، مکرمی، وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے رسالے 'اوراق' کے نکالنے کے بعد کئی تجربے کیے۔ تنقید اور انشائیے کی ترویج واشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایسی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔

صحافی ایک باوقار منصب ہے۔ ایماندار اور بے باک صحافی سے بے ایمان عہدہ دار اور سیاست داں بہت گھبراتے ہیں اسی وجہ سے بیشتر صحافی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں یعنی اپنی زبان اور اپنے قلم کا سودا کر کے ایسے عہدیداروں اور سیاست دانوں سے بڑا فیض پاتے ہیں جس میں مالی فائدہ اہم ہے۔

سرکاری ملازم کی طرح صحافی کو باضابطہ تنخواہ یا وظیفہ Pension ملنے والا نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنی صحافتی زندگی ہی کو غنیمت جان کر زیادہ سے زیادہ کما لینا چاہتا ہے تا کہ خوش حال زندگی گزار سکے۔ ایک صحافی کو بڑی 'سیاست' سے ایک 'منصف' مزاج مالک نے اپنے اخبار میں کام کرنے کے لیے دگنی تنخواہ کی پیش کش پر حاصل کرلیا۔ پھر اس صحافی کی خدمات کے عوض مزید بہتر سہولیات فراہم کرتے ہوئے ایک اور پارٹی نے اسے اپنے 'اعتماد' میں لے لیا۔ ہم اس صحافی کی 'عارفانہ' دوراندیشی کی داد دیتے ہیں۔

بعض سربراہان مملکت اخبارات کی سرپرستی بھی کرتے رہے ہیں۔ سکھ دیو مرزاپوری کی ادارت میں اردو کا پہلا اخبار 'جامِ جہاں نما' 1822 میں کلکتے سے نکلتا تھا جس پر باضابطہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مہر ثبت ہوتی تھی۔ اس کے برخلاف حکومتِ وقت کے خلاف آواز اٹھانے والے اخبار بھی ہمیشہ نکلتے رہے ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا اخبار 'دہلی اخبار' 1836 میں شاہجہاں آباد دہلی سے محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نکالتے تھے جنھیں حق گوئی و بے باکی کے نتیجے میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا گویا صحافی محمد باقر پہلے 'شہید صحافت' ہیں۔

حیدرآباد سے ایک روزنامہ 'نظام گزٹ' والیِ سلطنت حضور نظام سابع میر عثمان علی خاں بہادر کے نام پر 1927 سے نکلا کرتا تھا جس میں نظام دکن کے فرمان اور تخلیقات بڑے اہتمام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ مذکورہ نظام گزٹ نے میر عثمان علی خان کا سالگرہ نمبر بھی شائع کیا تھا۔ 3 رجب 1350 ھ مطابق 14 نومبر 1931 کو اس اخبار نے جلی حروف میں یہ خبر بھی شائع کی تھی:

''شہزادہ اعظم جاہ بہادر کا عقد ترکی کے خلیفہ عبدالمجید خان کی صاحب زادی در شہوار سے اور معظم جاہ کا عقد

مذکورہ خلیفہ کی بھانجی نیلوفر سے یکم رجب 1350ھ کو ہوگیا۔''

یہ دونوں شادیاں آخر کار ناکام ٹھہریں۔ دونوں خوب صورت شہزادیاں حیدرآباد چھوڑ کر چلی گئیں۔

یہ 'نظام گزٹ' پولیس ایکشن کے ہاتھوں نظام کی حکومت کے خاتمے کے باوجود جاری رہا اور نظام دکن میر عثمان علی خاں بہادر کے انتقال پر ملال 24 فروری 1967 کے بعد یہ اخبار بھی بند ہوگیا۔

'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' کے شہرت یافتہ ممتاز ادیب قاضی عبدالغفار نے 1935 میں روزنامہ 'پیام' جاری کیا۔ بعد میں اسے اختر حسن کو سونپ دیا جو حسرت موہانی کے بھتیجے ہوا کرتے تھے۔ اختر حسن کمیونسٹ تھے اور انڈین نیشنل کانگریس کے ہم نوا تھے۔ وہ چونکہ نظام سابع کی حکومت کی برقراری کے خلاف تھے اس لیے انھیں رضاکاروں کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ قاضی عبدالغفار بھی ترقی پسند تھے۔ اختر حسن کے احباب مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، راج بہادر گوڑ تھے۔ ادبی حلقوں میں 'پیام' کافی مقبول تھا۔ نظام دکن کے خلاف پولیس ایکشن، کے بعد کئی اخبار بند ہوگئے ان میں پیام بھی تھا۔ اختر حسن نے عملاً سیاست میں قدم رکھا۔ اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا مگر جیت نہ سکے۔ آخری زمانے میں اختر حسن اردو اکادمی آندھراپردیش کے چیئرمین بھی کچھ دن رہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے غالب کی فارسی مثنوی 'چراغ دیر' کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔

آزادی کے بعد حیدرآباد سے 1949 میں دو روزنامے نکلے۔ رہنمائے دکن (جولائی 1949) اور سیاست (15 اگست 1949)

روزنامہ رہنمائے دکن اپنے اسلامی مزاج کی وجہ سے مسلمانوں میں خوب چلتا تھا۔ ہر سال میلادالنبی نمبر، شب برات نمبر، شب معراج نمبر، یوم عاشورہ نمبر وغیرہ وغیرہ کے ذریعے وہ سنیوں اور شیعوں میں کافی مقبول تھا۔ فسادات کے موقعوں پر بھی لوگ اس کی خبروں پر زیادہ یقین کرتے تھے اس لیے اخبار ہاتھوں ہاتھ بک جایا کرتا تھا۔ پہلے اس کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر محمود وحیدالدین تھے پھر لطیف الدین اور وقارالدین ہوئے۔ آج بھی یہ وقارالدین صاحب ہی کی سرپرستی میں نکل رہا ہے۔ اب حیدرآباد سے زیادہ اضلاع میں مقبول ہے۔ رہنمائے دکن شروع میں روزنامہ 'رہبر دکن' تھا۔ اس میں شعر و ادب کا خاص خیال رکھا جاتا رہا ہے۔ خاص طور پر اس نے اپنے اخبار کے ذریعے بچوں کو ادب سے جوڑا۔ یہ واحد اخبار تھا جس میں بچوں کا صفحہ ہر ہفتہ شائع ہوا کرتا تھا جس میں بچوں کے لکھے ہوئے مختصر مضامین اور کہانیاں شائع ہوا کرتی تھیں۔ بچوں کے لیے لکھنے والے آگے چل کر بڑوں میں بھی پہچانے جانے لگے ان میں ایک خاکسار رؤف خیر بھی ہے جس نے اپنے طالب علمی کے دور میں 64-1963 میں بچوں کے لیے جو کہانیاں لکھیں وہ رہنمائے دکن میں اکثر شائع ہوتی تھیں۔ پھر رؤف خیر کی نظمیں ماہ نامہ 'کھلونا' اور 'پیام تعلیم' دہلی میں بھی شائع ہونے لگیں۔

روزنامہ 'رہنمائے دکن' میں ہر جمعرات شعری صفحہ شائع ہوتا تھا جس میں کسی ایک عنوان کے تحت مشہور اشعار کے علاوہ مختلف نئے پرانے شاعروں کی غزلیں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ خاکسار رؤف خیر کی بے شمار ابتدائی غزلیں بھی اسی اخبار میں چھپتی رہیں اس طرح رؤف خیر کی ادبی تربیت میں روزنامہ 'رہنمائے دکن' کا غالب حصہ ہے۔

15 اگست 1949 کو محبوب حسین جگر اور عابد علی خان صاحبان کی مشترکہ کوششوں سے روزنامہ 'سیاست' جاری ہوا۔ یہ ایک سیکولر مزاج کا اخبار رہا۔ ترقی پسند نظریات کے حامل محبوب حسین جگر کے دوستوں میں ہندو مسلم سب شامل تھے۔ مسلمانوں کے تمام فرقے سنی، شیعہ، مہدوی، پارسی وغیرہ سب 'سیاست' میں لکھا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ کمیونسٹ فکر کے ادیب مخدوم، سلیمان اریب، راج بہادر گوڑ، امجد باقی، منوہر راج سکسینہ، زینت ساجدہ، شاہد صدیقی، شہریار کاؤس جی، ہرمز، ظفر الحسن جیسے لکھنے والوں کا تعاون سیاست کو حاصل رہا۔ یہ اخبار ہندو مسلم یکجہتی کا علم بردار تھا اس لیے ہر مذہب و ہر مسلک کا آدمی اس کا قاری تھا۔ یوں سیاست نے گنگا جمنی تہذیب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ محبوب حسین جگر اسے صرف مسلمانوں میں محدود کرکے نہیں رکھنا چاہتے تھے چنانچہ اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوئی۔ سرکاری خبریں سرکاری اشتہارات سے بھی یہ بہرہ یاب ہونے لگا۔ اس کے قارئین جناب شاہد صدیقی کا کالم شیشہ و تیشہ بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ شاہد صدیقی کے بعد اس کالم کی ذمے داری مجتبیٰ حسین پر ڈالی گئی جو بحسن و خوبی انجام دی گئی۔

سیاست اپنے لکھنے والوں کی تخلیقات کا معاوضہ بھی ادا کرتا تھا۔ ہر اتوار اوج یعقوبی صاحب 'شاعر سیاست' کے فرضی نام سے ایک نظم لکھا کرتے تھے جس کا معاوضہ پندرہ روپے انھیں ملا کرتا تھا۔ جب بھی خاکسار رؤف خیر کی غزل شائع ہوتی تھی بطور معاوضہ تیس روپے کا منی

> ”
> **سیاست میں کیریئر گائیڈنس کا سلسلہ نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے شروع کیا گیا، اور انہیں اپن مستقبل سنوارنے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ اردو دانی کی کلاسس چلائی جاتی ہیں اور اردو سکھانے کے لیے سلسلہ وار کتابیں چھاپ کر طلبہ و طالبات کو مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ امتحانات کامیاب کرنے والوں کو اسناد کے ساتھ ترغیبی انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔**
> “

آرڈر گھر کے پتے پر پہنچ جایا کرتا تھا یا پھر دفتر سیاست سے یہ معاوضہ حاصل کرلیا جاتا تھا۔ روزنامہ منصف جب شائع ہونا شروع ہوا تو اس نے ہر جمعہ مذہبی ایڈیشن، ہر جمعرات ادبی صفحہ، ہر چہارشنبہ خواتین کا صفحہ وغیرہ شائع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ روزنامہ سیاست کو بھی 'مسابقت' میں اپنا سیکولر رویہ بدل کر مذہبی صفحہ شائع کرنا پڑا۔ اب تو جشن میلادالنبی کے موقعے پر سیاست میں بے شمار مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ رمضان کے زمانے میں بلکہ ہر جمعہ قرآن و حدیث کے وسیلے سے علمی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ حمد و نعت بھی اب شائع ہوتی ہیں۔ خواتین کے لیے بھی مفید مضامین سیاست کی زینت بنتے ہیں۔ ہر ہفتے سیاست کا ادبی صفحہ بھی مرکز نگاہ بنتا ہے۔ ہر اتوار سیاسی و سماجی مسائل پر لمحۂ فکر دینے والے مضامین اور تراجم بھی قارئین کی فکر کو جھنجھوڑتے ہیں۔ سرکاری سرپرستی سیاست کو اب بھی حاصل ہے، سرکاری اشتہارات بھی اسے ملتے ہیں۔ ضرورت رشتہ کے بے شمار اشتہارات کے علاوہ خرید و فروخت کے کلاسفائیڈ اشتہارات سے اخبار بھرا رہتا ہے مگر بقول خیر:

کوئی بھی زور خریدار پر نہیں چلتا
کہ کاروبار تو اخبار پر نہیں چلتا

سیاست میں کیریئر گائیڈنس کا سلسلہ نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے شروع کیا گیا، اور انھیں اپنا مستقبل سنوارنے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ اردو دانی کی کلاسس چلائی جاتی ہیں اور اردو سکھانے کے لیے سلسلہ وار کتابیں چھاپ کر طلبہ و طالبات کو مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ امتحانات کامیاب کرنے والوں کو اسناد کے ساتھ ترغیبی انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔

یوں تو روزنامہ 'ملاپ' بھی 1949 ہی میں جاری ہوا

مگر جب یہ دہلی سے نکلتا تھا تو سہ روزہ تھا مگر 1951 میں حیدرآباد منتقل ہوا تو روزنامہ ہوگیا۔ ملاپ بھی سیکولر اخبار تھا۔ یدھ ویر جی اس کے مدیر تھے۔ اس میں ہندی الفاظ بہ کثرت استعمال ہوا کرتے تھے۔ اس کا خاص کالم 'پیاز کے چھلکے' فکر تونسوی لکھا کرتے تھے۔ اس کا ادبی صفحہ علاء الدین حبیب ترتیب دیا کرتے تھے۔ مشہور و ممتاز ادیبوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی خوب پذیرائی کی جاتی تھی۔ خاکسار رؤف خیر کی تخلیقات بھی 1970 کے آس پاس ملاپ میں خوب چھپتی رہی ہیں۔

حیدرآباد کا یہ واحد اخبار تھا جس میں شاعری ادیبوں کی تخلیقات چھٹی ساتویں دہائی ہی سے ان کی تصویروں کے ساتھ بڑے اہتمام سے ہر چہارشنبہ کو شائع کی جاتی تھیں علمی ادبی مسائل بھی موضوع بحث آتے تھے۔ ادبی حلقوں میں روزنامہ 'ملاپ' کافی مقبول رہا۔ ہر سال دیوالی نمبر، جشن آزادی نمبر، سری کرشن نمبر، یوم جمہوریہ نمبر بھی نکلا کرتا تھا اور بے حد معلوماتی ہوا کرتا تھا۔ 1984 میں اردو روزنامہ ملاپ بند کر دیا گیا مگر ہندی ملاپ آج تک جاری ہے اور کافی پڑھا جاتا ہے۔

نواب محبوب عالم خان صاحب کو بھی اخبار نکالنے کا شوق چرایا چنانچہ 1976 میں انھوں نے روزنامہ 'نوید دکن' نکالا۔ یہ جماعت اسلامی فکر سے قریب تھا۔ اس میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے ایک مرشد نے امام ابن تیمیہ جیسے مفکر و عالم بے بدل کو چپل سینڈ (کانٹے دار پودہ کیکٹس) لکھ دیا تھا جس پر طرفین سے کافی گرما گرم بحث اس اخبار میں چلی تھی۔ نوید دکن میں عالمی خبریں تو ذیلی حیثیت رکھتی تھیں اسلامی فکر کا غلبہ تھا۔ ایسا اخبار جو بدعات وخرافات کا رد کرے، شیعہ، مہدوی، پارسی، سکھ، عیسائی اور دیگر غیر مسلموں کو خوش نہ کر سکے وہ بھلا کیسے پنپ سکتا ہے چنانچہ دو ہی سال میں یعنی 1978 میں یہ روزنامہ بند ہوگیا۔

1977 میں روزنامہ 'منصف' کے منظر عام پر آنے کی روداد بڑی دلچسپ ہے۔ جناب محمود انصاری روزنامہ سیاست میں سب ایڈیٹر تھے مگر وہ خود اپنا اخبار نکالنا چاہتے تھے ان کی ایک بہن ڈاکٹر عطیہ انصاری سعودی عرب کی شاہی معالج تھیں۔ محمود انصاری نے مالکان سیاست سے کہا کہ انھیں ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی بہن کے پاس سعودی عرب چلے جائیں۔ چنانچہ روزنامہ 'سیاست' سے انھیں سبکدوش کر کے ان کے تمام بقایا جاتا ادا کر دیے گئے۔ ایک وداعی جلسہ بھی رکھا گیا جس میں سیاست کے ذمے دار اور صحافی برادری کے

ہمدردوں نے تقاریر کیں اور ایک اچھے صحافی سے جدا ہونے کو صحافت کا بہت بڑا نقصان قرار دیا۔ بس کیا تھا۔ محمود انصاری کو موقع ہی مل گیا۔ انصاری نے بہی خواہوں کے جذبات کے احترام میں کہا کہ سعودی عرب جانے کا اپنا ارادہ انھوں نے بدل دیا ہے اور اخبار نکالنے کی کوئی سبیل نکالیں گے۔ اسی دوران یہ منصف کا ڈیکلریشن لے چکے تھے۔ ظاہر ہے تجربہ کار صحافی محمود انصاری کسی اخبار کے کل پرزے ہوکر رہ جانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے روزنامہ سیاست میں ان کے جو بقایا جاتا تھے بڑی مصلحت سے وصول کر لیے اور فوراً اپنا اخبار منصف نکالنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے شہر حیدرآباد میں 1977 میں فسادات پھوٹ پڑے اور منصف کے نمائندے شہر بھر میں گھوم پھر کے خوب خبریں جمع کرنے لگے اور بڑی تفصیلی خبریں اس میں چھپنے لگیں چنانچہ منصف کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ ادیبوں اشاعروں کے جامع تعارف کے ساتھ ان کے بڑے فوٹو بھی (شاہ علی فوٹو گرافر کے ذریعے) شائع کرنے کا اہتمام بھی منصف میں ہونے لگا۔ محمود انصاری حیدرآباد کے ادیبوں شاعروں کو دوست رکھتے تھے۔ اور ادیب شاعر محمود انصاری کو دوست رکھتے تھے۔ یوں ادبی جلسوں کی تفصیلی رپورٹ تصویر کے ساتھ منصف میں شائع ہونے لگی۔ محمود انصاری کے اچانک انتقال کے بعد ان کے بھائی مسعود انصاری نے اسے کچھ دن سنبھالا۔ منصف

کو عطا محمد خان جیسے بے باک صحافی کا بھرپور تعاون شروع ہی سے حاصل رہا ان کا کالم طرفہ تماشہ بہت مقبول تھا۔ عطا محمد خان اور منصف لازم وملزوم تھے۔ بہت ہی کم عمری میں عطا محمد خان کا انتقال بھی اچانک ہوگیا۔ پھر مسعود انصاری سے جناب خان لطیف خان صاحب نے روزنامہ منصف حاصل کر لیا اور اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔ ABC کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان کا سب سے زیادہ چھپنے والا روزنامہ منصف کئی سال سے سرفہرست ہے۔ اس کے ہفتہ واری ضمیمے (سپلمنٹ) بھی بڑے شوق سے پڑے جاتے ہیں جیسے گھر آنگن، آئینۂ ادب، آئینۂ شہر، مینارۂ نور اس کے علاوہ سائنس اور ٹکنالوجی پر کافی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ منصف کے ادبی ایڈیشن میں ہند و پاک کے مشاہیر ادیبوں، شاعروں پر تصویروں کے ساتھ بھرپور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شاعر و مضمون نگار کی تصویر بھی شائع کی جاتی ہے۔ دیگر لکھنے والوں کی تخلیقات بھلے ہی ردی کی ٹوکری کی نذر بھی کر دی جائیں مگر ادبی صفحے کے مرتب مظفر مجاز صاحب کے کیے ہوئے اقبال کی فارسی تخلیقات وقطعات کے منظوم اردو تراجم بلاناغہ ہر ہفتے ضرور شائع ہوتے ہیں۔ بہرحال ادبی صفحہ بہت اچھا نکلتا ہے۔

کے ایم عارف الدین نے مدینہ ایجوکیشن سنٹر نام پلی حیدرآباد سے اپنا اخبار ہمارا عوام 1995 میں جاری کیا مگر یہ چل نہیں سکا۔ چند ہی سال میں بند ہوگیا۔

مسلمانوں کی ہر دل عزیز جماعت مجلس اتحادالمسلمین کا نمائندہ روزنامہ 'اعتماد' نئی جاپانی مشنری پر 2005 سے بڑا خوبصورت شائع ہونے لگا۔ عالمی خبروں کے ساتھ شہر اور اضلاع کی خبریں بھی تفصیل سے شائع کی جاتی ہیں اس کے علاوہ کئی ادبی، سائنسی، علمی ضمیمے بھی شائع کیے جاتے ہیں جو کافی معلوماتی ہوتے ہیں۔ شہر بھر میں مجلس اتحادالمسلمین کا بول بالا ہے۔ سلطان صلاح الدین اویسی ہی کی طرح ان کے دونوں بیٹے بیرسٹر اسدالدین اویسی ایم پی اور اکبرالدین اویسی ایم ایل اے اپنی حق گوئی و بے باکی کی وجہ سے عوام میں کافی مقبول ہیں ان کے بے شمار چاہنے والوں کی وجہ سے اعتماد کافی پڑھا جاتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں سے جاری کیا گیا ہے جیسے دہلی، کلکتہ، پٹنہ، رانچی، بنگلور، گورکھپور وغیرہ اسی طرح 2006 میں حیدرآباد سے بھی جاری کیا گیا۔ اس اخبار میں شمالی ہند و جنوبی ہند کی خبروں کے ساتھ ساتھ حیدرآباد و اضلاع کی تفصیلی خبریں تصویروں کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں اس لیے اس کے قارئین کی تعداد بھی قابل لحاظ ہے۔

یہ اخبار چونکہ بہ یک وقت سات آٹھ جگہوں سے شائع ہوتا ہے اس لیے نیشنل اور انٹرنیشنل ہر اہم خبر اس میں پائی جاتی ہے۔ بعض اہم کالم بھی تمام جگہوں سے نکلنے والے روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' میں مشترک رہتے ہیں۔ اس ادارے سے ہفتے وار عالمی سہارا اور ماہ نامہ 'بزم سہارا' بھی بڑے خوب صورت انداز میں شائع ہوتے ہیں۔ (کچھ دن ہوئے بزم سہارا بند ہوگیا)

پانچویں دہائی سے معین فاروقی کی ادارت میں روزنامہ 'انگارے' بھی نکلا کرتا تھا مگر عوام میں یہ مقبولیت حاصل نہ کرسکا۔ لگتا تھا بعض ہفتہ واروں کی طرح سرکاری مسل کی تکمیل کے لیے نکالا جاتا تھا۔ معین فاروقی کے انتقال کے بعد 1990 کے آس پاس انگارے پر بھی اوس پڑ گئی۔

حیدرآباد اور اطراف و اکناف سے کئی ہفتہ وار اور پندرہ روزہ اخبارات نکلے اور نکلتے رہتے ہیں جن میں سے بہت سارے ایسے ہیں جو سرکاری خانہ پری اور سرکاری اشتہارات کے حصول کے لیے نہایت ہی محدود تعداد میں شائع ہوتے ہیں جو سرکاری فائل میں جگہ پاتے ہیں تا کہ ان کی سرکاری مراعات برقرار رہیں۔ اردو اکادمی بھی ایسے ہفتے وار اور پندرہ روزہ رسائل و جرائد کو ہر ماہ ایک مقررہ رقم بطور امداد دیتی ہے یوں ان غریب صحافیوں کی روزی روٹی کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہوجاتا

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں سے جاری کیا گیا ہے جیسے دہلی، کلکتہ، پٹنہ، رانچی، بنگلور، گورکھپور وغیرہ اسی طرح 2006 میں حیدرآباد سے بھی جاری کیا گیا۔ اس اخبار میں شمالی ہندو جنوبی ہند کی خبروں کے ساتھ ساتھ حیدرآباد و اضلاع کی تفصیلی خبریں تصویروں کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں اس لیے اس کے قارئین کی تعداد بھی قابل لحاظ ہے۔

ہے۔ ایسے اخباروں میں البتہ کچھ ایسے ضرور رہے ہیں جنھوں نے اپنی پہچان بنائی ہے جن کا ذکر آگے آئے گا۔

مشہور و ممتاز ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین نے 1951 میں اپنا ہفت روزہ 'نیا دور' نکالا جو کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان تھا مگر یہ اخبار بے ضابطہ بھی تھا اور عوام سے اس کا رابطہ کم کم ہی تھا۔ یہ کب نکلتا تھا کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا ڈاکٹر محبوب فرید کی تحقیق سے خود ہمیں پتہ چلا کہ اس نام کا کوئی ہفتہ وار مخدوم بھی نکالا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے بہت کم لوگ اس کے بارے میں جانتے ہوں گے۔ مخدوم کی حیات ہی میں یہ چپکے سے بند بھی ہوگیا۔

مشہور و ممتاز سماجی و سیاسی رہنما جناب غوث خاموشی نے 1954 میں اپنا ہفت روزہ 'معمار' جاری کیا جس میں قرآن و حدیث، سیاست، ادب سے متعلق سب کچھ ہوتا تھا مگر اس کے بارے میں عوام الناس کو کم کم ہی خبر ہوتی تھی ایک دن خاموشی کے ساتھ یہ بھی بند ہوگیا۔

ترقی پسند ادیب نجم الثاقب شحنہ رہتے تو یادگیر (کرناٹک) میں تھے لیکن 1955 میں حیدرآباد سے ادبی رسالہ 'گجر' جاری کیا جو ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا۔ چند سال بعد ہی اس کی شام ہوگئی۔

1956 میں شیعیت کی ترجمانی کے لیے انور ہاشمی نے 'شاہکار' اور کرار کاظمی نے 'بانگِ درا' جاری کیا۔ ان کے مدیروں کی وفات کے ساتھ ہی یہ پرچے بھی بے نام و نشان ہوگئے۔

کمیونسٹ پارٹی کے وفادار اور مخدوم کے قریبی دوست امجد باغی نے 1960 سے ماہنامہ 'نیا آدم' جاری کیا۔ مخدوم کی وفات کے فوری بعد 1970 میں نیا آدم کا مخدوم نمبر جناب امجد باغی نے نکالا جو دستاویزی حیثیت کا حامل تھا۔ امجد باغی کے ساتھ ہی 1980 میں نیا آدم بھی ختم ہوگیا۔

مسلمانوں کے ہمدرد رہنما، مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن رکین جناب عبدالرحیم قریشی نے 1964 میں اپنا ہفتہ وار 'شعور' جاری کیا اور مسلمانوں کے مسائل پر خود بھی کھل کر لکھا اور دیگر دانشوروں سے لکھوایا۔ قریشی صاحب ادارہ تعمیر ملت سے بھی وابستہ تھے۔ اللہ عبدالرحیم قریشی کو سلامت رکھے مگر 'شعور' سلامت نہیں رہا۔ عبدالرحیم قریشی بھی سلامت نہیں رہے۔

شفیع اقبال نے پنڈت نہرو کی پہلی برسی کے موقع پر اپنا ہفتہ وار 'ہماری منزل' جاری کیا۔ ابھی پچھلے سال مئی 2015 میں اس کی پچاسویں سالگرہ کا جشن منایا گیا تھا۔ ہماری منزل میں نئے ادیبوں شاعروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی چنانچہ خود خاکسار رؤف خیر اس کی زندہ مثال ہے۔ یہ پرچہ اب بھی نکلا کرتا ہے۔ شفیع صاحب ماہنامہ 'پروانۂ دکن' بھی نکالتے ہیں۔

حیدرآباد کے نئے لب و لہجے کے مقبول و ممتاز شاعر خورشید احمد جامی کی یاد میں ان کے چہیتے شاگرد محمود خاور نے 1970 میں ہفت روزہ 'برگِ آوارہ' جاری کیا جس کے سرنامے کے طور پر ان کے مربی جامی صاحب کا شعر درج رہتا تھا

لے کے پھرتی ہیں آندھیاں جس کو
زندگی ہے وہ برگِ آوارہ

'برگِ آوارہ' جامی صاحب کے شعری مجموعے کا نام بھی ہے۔ ویسے 1966 میں پاکستان کے باغی شاعر حبیب جالب کا مجموعہ اسی نام سے شائع ہوچکا تھا۔

محمود خاور نے 'برگِ آوارہ' میں اس دور کے نئے پرانے تمام قلم کاروں کو جمع کر رکھا تھا۔ ہر ہفتے اس ہفتہ وار کا قاری کو انتظار رہتا تھا۔ ان کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد ان کے بھائی انور مسعود نے اسے کچھ دن سنبھالا۔ آخر کار وہ بے ادب آندھی کی نذر ہوگیا۔

حیدرآباد کے استاد شاعر اوج یعقوبی صاحب ایک ادبی ہفتہ وار 'رابطہ' ساتویں دہائی میں حیدرآباد سے نکالا کرتے تھے جس میں رؤف خیر نے مختلف کتابوں پر تبصرے کیے۔ اس طرح رؤف خیر میں تنقیدی بصیرت پیدا کرنے میں اوج صاحب کے رابطے کا دخل ہے۔ ایک آدھ سال سے زیادہ یہ برقرار نہیں رہا۔

ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز پہلے روزنامہ 'رہنمائے دکن' سے وابستہ تھے۔ انھوں نے خود اپنا پرچہ نکالنا طے کیا اور 1999 میں ہفت روزہ 'گواہ' جاری کیا جو ہر ہفتہ پابندی

سے آج بھی شائع ہوتا ہے اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے کی وجہ سے امریکہ، یورپ، سعودی عرب اور پاکستان وغیرہ میں شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اس میں فاضل کا بے باک اداریہ شمارے کی جان ہوا کرتا ہے۔ گواہ میں ہر موضوع پر کھل کر لکھا جاتا ہے۔ مذہب، ادب، سیاست، اور کھیل وغیرہ پر کافی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ شہر میں ہونے والے اہم جلسوں کی تفصیلی رپورٹ بھی شائع کی جاتی ہے۔ یہ ایسا ہفتہ وار ہے جس میں ہر مکتب فکر کی پذیرائی کی جاتی ہے۔

ساتویں دہائی میں فارسی و اردو کے استاد شاعر برق موسوی اپنا ایک پندرہ روزہ 'آب وتاب' نکالا کرتے تھے جس میں وہ مختلف شاعروں کے کلام کا سخت تنقیدی جائزہ لے کر عروض و زبان و بیان کی غلطیوں کی نشاندہی کیا کرتے تھے۔ ایک آدھ سال کے اندر ہی یہ پرچہ ان کی شدت پسندی کا شکار ہو کر اپنی آب وتاب کھو چکا۔

حیدرآباد تو ہر اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ آس پاس کے علاقوں سے بھی کچھ پرچے نکلے۔ جیسے کرنول سے کٹر اہل حدیث عالم مولانا عبدالعزیز رحمانی چھٹی ساتویں دہائی میں 'العزیز' ہفتہ وار نکالا کرتے تھے۔ کاتبوں کے ہاتھوں پریشان ہو کر بعض اوقات وہ اپنے پرچے کی کتابت بھی خود ہی کر لیا کرتے تھے۔ اس لیے پرچہ کبھی وقت پر نہیں نکلتا تھا۔ پرچہ خالص قرآن وسنت کا ترجمان تھا۔ مولانا عبدالعزیز رحمانی نے منکر حدیث غلام جیلانی برق کی کتاب دو قرآن و دو اسلام کا دندان شکن جواب 'صحیح اسلام بجواب دو اسلام' کتابی صورت میں دیا۔ ان کی وفات کے ساتھ یہ پرچہ بھی ختم ہو گیا۔

لیسر کرنولی بھی اپنا ہفتہ وار نکالا کرتے تھے اور غالب کی زمینوں میں غزلیں کہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر قیسی قمر نگری نے 2001 میں ماہ نامہ 'بزم آئینہ' جاری کیا جس میں عرسوں میلوں کے ساتھ ادب سے متعلق تخلیقات بھی شائع ہوا کرتی ہیں۔ علمی و مذہبی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ یہ پرچہ اب ڈاکٹر وحید کوثر کی ادارت میں نکل رہا ہے۔

2010 میں ورنگل سے جاری کردہ ہفتہ وار 'اردو ہماری زبان' وحید گلشن کی ادارت میں پابندی سے نکل رہا ہے اس میں بھی عرسوں میلوں اور ادبی محفلوں کی تفصیلی روداد شائع ہوتی رہتی ہے۔ تجارتی نوعیت کا یہ ہفتہ وار ورنگل سے باہر بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ وحید گلشن نے اسے اپنا آرگن بنالیا ہے۔

ساتویں دہائی میں ہنمکنڈہ (ورنگل) سے پندرہ روزہ 'شرارے' جلیل صاحب نکالا کرتے تھے۔ آٹھویں دہائی میں وہ کچھ دن اردو اکادمی اے پی کے چیئر مین بھی رہے۔ ان کی وفات کے ساتھ 'شرارے' بھی بجھ گیا۔

کڑپہ (رائل سیما- آندھرا) سے ڈاکٹر خسرو قادری نے ایک سہ ماہی ادبی رسالہ 'دبستان' 2009 میں جاری کیا جو جدید مکتب فکر کا نمائندہ رسالہ ہے۔

نظام آباد سے جمیل نظام آبادی نے ساتویں دہائی میں ماہ نامہ گونج جاری کیا جو آج بھی نکل رہا ہے اور اضلاع میں خوب پڑھا جاتا ہے۔ اضلاع کے ادیبوں شاعروں کی گونج میں خوب پذیرائی ہوتی ہے اسی طرح وہ لوگ بھی گونج کی مدارات میں تن من دھن سے کام لیتے ہیں۔

نظام آباد ہی سے ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر نے ماہ نامہ 'تمہید' 2010 میں جاری کیا جس میں ادب کے ساتھ ساتھ مذہبی معلومات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ راجہ مہدی علی خان کی کلیات شائع کر کے ادب میں ان کو زندہ رکھنے کے جتن کرنے والے ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر ہند و پاک میں اپنی تحقیقی صلاحیتوں کی وجہ سے پسند کیے جاتے ہیں۔ ماہ نامہ تمہید آج بھی پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ حال ہی میں اس کا اقبال نمبر نکلا۔

مشہور و ممتاز افسانہ نگار و ناول نویس بدنام رفیعی، شاعر مسعود جاوید ہاشمی اور ماہر اقبالیات جناب مصلح الدین سعدی جیسے ارباب قلم کی مشترکہ ادارت میں ماہ نامہ 'افق' حیدرآباد سے چھٹی دہائی میں نکلا کرتا تھا۔ یہ رسالہ ترقی پسندوں، دہریوں اور جدیدیوں کے جواب میں اسلامی ادب پیش کیا کرتا تھا کہ اسلامی اقدار ہی عالمی اقدار ہیں۔ افسوس کہ یہ جلد ہی بند ہو گیا۔

چھٹی دہائی میں اردو کے مجاہد کمال کریم نگری، کریم نگر سے گزرنے والی ندی 'مانیر' کے نام پر اردو ماہ نامہ نکالا کرتے تھے جس میں آس پاس کے اضلاع کے تخلیق کاروں کا کلام شائع ہوتا تھا۔ کریم نگر کے تجارتی مرکزی مقام پر عدالت کے قریب بہت بڑی جائیداد کسی اردو نواز نے اردو کے لیے وقت کی تھی جس میں ایک بہت بڑی لائبریری قائم کی گئی تھی۔ اس جائیداد کی رکھوالی کمال صاحب نے اپنی زندگی میں تو کی اب پتہ نہیں اس کا کیا حشر ہوا۔ 'مانیر' تو چند ہی سال میں بند ہو گیا۔

ماہ نامہ 'معمار' ساتویں دہائی میں آرمور (نظام آباد، اے پی) سے عبدالحمید کی ادارت میں بڑی پابندی سے نکلا کرتا تھا جس میں سارے ملک کے ادیبوں شاعروں کی تخلیقات بڑے اہتمام سے شائع کی جاتی تھیں تقریباً دس سال تک اس کا شہرہ تھا۔ مدیر معمار کے انتقال کے بعد یہ بھی بند ہو گیا۔

جماعت اسلامی سے وابستہ دینی فکر کے مدیر جناب یعقوب سروش اپنے گاؤں آرمور سے ایک رسالہ 'بساط ذکر وفکر' نکالا کرتے تھے جس میں ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ اسلامی فکر پر مشتمل مضامین کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ان کے انتقال کے ساتھ یہ بساط بھی الٹ گئی۔

ادارۂ ادبیات اردو کے بانی مشہور ماہر دکنیات محقق و ناقد و شاعر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ایوان اردو حیدرآباد سے جنوری 1938 میں ماہ نامہ 'سب رس' جاری کیا جس میں تحقیقی وتنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ شعر و ادب پیش کیا جاتا تھا۔ ہر دور کے تمام اچھے لکھنے والوں کا تعاون سب رس کو حاصل رہا ہے۔ صاحب زادہ محمد علی

> ”
> **چھٹی دھائی میں اردو کے مجاهد کمال کریم نگری، کریم نگر سے گزرنے والی ندی 'مانیر' کے نام پر اردو ماہ نامہ نکالا کرتے تھے جس میں آس پاس کے اضلاع کے تخلیق کاروں کا کلام شائع ہوتا تھا. کریم نگر کے تجارتی مرکزی مقام پر عدالت کے قریب بہت بڑی جائیداد کسی اردو نواز نے اردو کے لیے وقت کی تھی جس میں ایک بہت بڑی لائبریری قائم کی گئی تھی. اس جائیداد کی رکھوالی کمال صاحب نے اپنی زندگی میں تو کی اب پتہ نہیں اس کا کیا حشر ہوا. 'مانیر' تو چند ہی سال میں بند ہو گیا.**
> “

میکش، سلیمان اریب، خواجہ حمیدالدین شاہد، اکبرالدین صدیقی، غلام جیلانی نے بھی اس کی ادارت کی مگر پروفیسر مغنی تبسم نے سب رس کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی۔ آج کل پروفیسر بیگ احساس اس کے مدیر ہیں اور اس کا رنگ روپ نکھر کر ادبی دنیا کو چکا چوند کر رہا ہے۔

ڈاکٹر زور کے شاگرد رشید اور عقیدت مند خواجہ حمیدالدین شاہد کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں سے بھی وہ ہر ماہ سب رس نکالا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے ساتھ یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ حیدرآباد کے خاموش طبع شاعر وقار خلیل نے بھی سب رس کے لیے بڑی خدمات انجام دی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ زندگی بھر ادارۂ ادبیات اردو سے وابستہ رہے۔

سلیمان اریب اور ماہ نامہ 'صبا' ایک دوسرے سے پہچانے جاتے تھے۔ 1955 میں سلیمان اریب نے صبا کی بنیاد ڈالی۔ ہند و پاک کے تقریباً تمام اچھے تخلیق کار و تنقید نگار صبا میں شائع ہونا اعزاز سمجھتے تھے۔ اس کے کئی دستاویزی حیثیت کے نمبر بھی نکلے جیسے مخدوم نمبر وغیرہ۔ صبا شروع ہی سے مالی پریشانیوں کا شکار رہا۔ آخرکار 1970 میں کینسر کے شکار اریب کی موت کے ساتھ ہی یہ بھی زندگی و موت کی کشمکش میں رہا۔ کچھ دن مغنی تبسم نے اسے زندگی بخشنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہاتھ لگی۔

لسانی بنیادوں پر 1956 میں آندھرا پردیش کی تشکیل کے بعد محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ (Dept of Information & Public Relations) کے تحت ماہ نامہ 'آندھرا پردیش' سرکاری ترجمان کی صورت منظرِ عام پر آیا جس میں شائع ہونے والی تخلیقات کا معاوضہ بھی ادا کیا جاتا تھا۔ ابتدا میں اس کے ایڈیٹر کنول پرشاد کنول رہے۔ کچھ دن اختر حسن بھی تھے۔ سید شاہ حبیب الدین قادری بھی اس کے مدیر رہے ہیں۔ تلنگانہ اسٹیٹ (2014) کے قیام کے بعد اس کا نام ماہ نامہ 'تلنگانہ' ہو گیا ہے اور مدیر حبیب صاحب ہی ہیں۔

مارچ 1958 میں اعظم راہی نے ماہ نامہ 'پیکر' جاری کیا جس میں شامل جدید تخلیق کاروں کی تخلیقات نے اردو ادب کو نئی زندگی بخشی۔ ترقی پسندوں کے چل چلاؤ کے دن تھے۔ پیکر میں ہر مکتبِ فکر کے لکھنے والوں کی پذیرائی کی جاتی تھی۔ چنانچہ مجروح، اختر الایمان، جاں نثار اختر، ندا فاضلی، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد علوی، کمار پاشی، جوگندر پال، جگدیش بمل، مخدوم، جامی، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، اقبال متین وغیرہ کے ساتھ ساتھ تاج مہجور، رؤف خلش، مجتبیٰ حسین، حسن فرخ، رؤف خیر، علی الدین نوید، غیاث متین اسلم عمادی وغیرہ کی پذیرائی ہوئی تھی۔ اعظم راہی اور پیکر ایک ہی سکے کے دو رخ شمار ہوا کرتے تھے۔ پیکر جیسا رسالہ بھی افسوس کہ بند ہو گیا۔ الحمدللہ اعظم راہی سلامت ہیں اور ان دنوں امریکہ میں اپنے بیٹے کے پاس ہیں۔

1965 میں ناصر کرنولی نے ماہ نامہ 'پونم' جاری کیا۔ یہ رسالہ بھی ہندوستان بھر میں شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ناصر صاحب کو خیر بہوروی اور جرم محمد آبادی سے خاص عقیدت تھی وہ ان کی تخلیقات بڑے اہتمام سے بلا ناغہ شائع کیا کرتے تھے۔ راقم الحروف رؤف خیر کی نظمیں غزلیں بھی پونم میں چھپتی رہی ہیں۔ ناصر کرنولی اردو کے لکچرر تھے۔ وظیفے کے بعد وہ اپنے آبائی مقام کرنول منتقل ہو گئے اور 'پونم' اماوس کا شکار ہو گیا۔

حیدرآباد میں طوائفوں کے علاقے محبوب کی مہندی سے ایک پردہ نشین شریف خاتون احمدی بیگم 1963 سے رسالہ 'قلم کار' نکالا کرتی تھیں جس کے خاص نمبر دستاویزی حیثیت کے حامل ہوا کرتے تھے۔ یہ رسالہ شروع ہی سے بے ضابطگی کا شکار رہا اور تین سال سے زیادہ جی نہ سکا۔

1968 میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے ترجمان کے طور پر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی زیرِ ادارت 'شگوفہ' منظرِ عام پر آیا۔ پہلے یہ ڈیڑھ ماہی ہوا کرتا تھا۔ پھر ماہنامہ ہو گیا۔ طنز و مزاح کے تمام لکھنے والوں کے لیے یہ ایک خوانِ یغما ثابت ہوا۔ ہند و پاک میں اس کی دھوم مچی اور سب کا تعاون اسے حاصل ہوا۔ اس کے کئی خاص نمبر نکلے جیسے ڈرامہ نمبر — اہم مزاح نگاروں پر خاص گوشے بھی مرتب ہوئے جیسے گوشۂ مجتبیٰ حسین، طالب خوندمیری، پرویز یداللہ مہدی، خواجہ عبدالغفور، برق آشیانوی وغیرہ۔ مصطفیٰ کمال بڑی سنجیدگی سے طنز و مزاح کے اس رسالہ 'شگوفہ' کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ آج بھی یہ خاصی تعداد میں چھپتا ہے۔ انھوں نے اوور سیز مدیر بھی شگوفہ کے بنا رکھے ہیں جو رسالے کے لیے بیرونی ممالک سے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ تلنگانہ اردو اکادمی نے انھیں 2015 میں ایک لاکھ روپے اور سند پر مشتمل مخدوم ایوارڈ سے سرفراز فرمایا۔

ساتویں دہائی میں 1970 کے آس پاس انور نظامی ادبی ماہ نامہ 'گل نو' چھتہ بازار حیدرآباد سے نکالتے تھے جس کا شعری حصہ خاکسار رؤف خیر دیکھا کرتا تھا۔ شمع معمے کے حل بھی اس میں بھجائے جاتے تھے۔ اس طرح سارے ہندوستان میں گل نو اپنی بہار دکھا کر مرجھا گیا۔ انور نظامی بجائے خود بڑے اچھے خوش نویس تھے۔ رؤف خیر کے ابتدائی دو شعری مجموعے اقرا (1977) اور ایلاف (1982) انور نظامی کی خوش نویسی کی یادگار ہیں۔

1943 سے اردو املا کو آسان بنانے کی مہم چلانے والے جی۔ ایم۔ خان کا رسالہ 'ہندوستانی ادب' ساتویں دہائی سے نکلا کرتا تھا مگر ان کے تجویز کردہ املے کی طرح ان کا رسالہ بھی ناکام ثابت ہوا۔

اسی سلسلے کے ایک اور مبلغ املا جعفر حسن بھی تھے جو رسالے میں اپنا نام 'جافرسن' لکھا کرتے تھے۔ یہ بھی بے نام و نشان ٹھہرے۔

1977 میں نظام اردو ٹرسٹ لائبریری کے زیرِ اہتمام 'مبصر' جاری کیا گیا۔ نظام ٹرسٹ میں حلقۂ اربابِ ذوق کے تحت اردو کی معیاری کتابوں پر تبصروں کی محفل سجائی جاتی تھی۔ بعد میں یہی تبصرے 'مبصر' کی زینت بن کر دستاویزی حیثیت اختیار کر جاتے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل میں رؤف خیر کے ترائیلوں کے مجموعے 'ایلاف' پر جناب مظفر مجاز نے مدلل تبصرہ کیا تھا جو بعد میں 'مبصر' میں شائع بھی ہوا۔ مبصر کے مدیر مشہور شاعر منظور احمد منظور تھے۔

1980 ہی کے آس پاس انکم ٹیکس کنسلٹنٹ Income Tax Consultant جناب بشیر وارثی چھتہ بازار حیدرآباد میں واقع اپنے آفس سے ایک ادبی رسالہ 'ذوق نظر' نکالا کرتے تھے جس کے پس منظر میں دراصل ڈاکٹر یعقوب عمر تھے جو عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر یعقوب عمر نے پروفیسر گیان چند جین کی زعفرانی فکر کو نشانہ بناتے ہوئے سخت تنقیدی کتاب لکھی۔ این میری شمیل کی صلاحیتوں کا بھی حق گوئی و بے باکی سے جائزہ لیا۔ ڈاکٹر یعقوب عمر نے بے شمار مضامین تو لکھے مگر ان کو چھپواتے ہوئے انھیں تامل ہوا کرتا تھا۔ خاکسار راقم الحروف انھیں چھپوانے پر اکساتا تھا مگر انھیں یہ وہم تھا کہ ان کی تحقیقی و تنقیدی کاوشیں کہیں ایڈیٹر اپنے نام سے نہ چھاپ لے یا ضائع نہ کر دے۔ اس زمانے میں زیراکس کا چلن اتنا عام نہیں تھا وہ بہت کاہل بھی واقع ہوئے تھے اسی لیے انھوں نے بشیر وارثی کو پرچہ جاری کرنے پر آمادہ کیا ان کے بیشتر مضامین اسی ماہ نامہ 'ذوق نظر' میں بلا ناغہ شائع ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر یعقوب عمر بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ غزل نظم کے علاوہ انھوں نے ہجویں بھی لکھیں جو بہت دل چسپ ہوا کرتی تھیں۔ بشیر وارثی بھی شاعر تھے۔ ان کا شعری مجموعہ 'بصارت و بصیرت' (تاریخی نام جس سے 1401ھ برآمد ہوتا ہے) آج تک شائع نہ ہو سکا جس کی کتابت انور نظامی نے کی تھی۔ اسی زمانے میں ترائیلوں پر مشتمل میرے مجموعے 'ایلاف' کی بھی کتابت انور نظامی ہی نے کی تھی جو 1982 میں (مطابق 1401ھ) شائع ہوا۔ بشیر وارثی کو اللہ نے دولت اور دل دونوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ وہ ضرورت مندوں، شاعروں ادیبوں کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کی وفات کے ساتھ 'ذوق نظر' بھی ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر یعقوب عمر بھی بے نام و نشان ٹھہرے۔

ادارہ ادب اسلامی کے دیرینہ رکن جناب مسعود جاوید ہاشمی امریکہ میں مقیم رفیقِ دیرینہ مقبول رضوی کے اشتراک سے دینی فکر پر مشتمل بچوں کا ماہ نامہ 'فن کار' 2000 سے نکال رہے ہیں جو آدھا اردو اور آدھا انگریزی میں ہوتا ہے۔ اس سے پہلے آٹھویں دہائی میں وہ ادبی ماہ نامہ 'فن کار' نکالا کرتے تھے جو چند ہی سال میں دم توڑ گیا۔

ڈاکٹر م۔ق۔ سلیم شروع ہی سے ادب سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے مضامین اور مراسلے ان کی خوش ذوقی

کے مظہر ہوا کرتے ہیں۔ آج کل وہ روزنامہ 'صحافی دکن' کا ادبی ایڈیشن ترتیب دے رہے ہیں اور کتابوں پر تبصرے کر رہے ہیں۔

انھوں نے 1987 میں بچوں کا رسالہ 'شعاع اردو' جاری کیا جس میں بچوں کی ذہنی تربیت سے متعلق تخلیقات ہوا کرتی ہیں جن میں ان کے دین و دنیا کا خیال رکھا جاتا ہے۔

حیدرآباد سے آندھراپردیش اردو اکادمی کا ترجمان ماہ نامہ 'قومی زبان' 1981 سے شائع ہونے لگا۔ یہ چونکہ سرکاری نوعیت کا رسالہ ہے اس لیے اس میں شائع ہونے والی ادبی تخلیقات کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر سکریٹری اردو اکادمی کی نگرانی میں یہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

1983 میں جناب قمرالدین صابری ایڈووکیٹ نے ڈیمائی سائز پر ادبی ماہ نامہ 'شاداب' جاری کیا۔ اس کے تحت کئی خاص نمبر بھی شائع کیے گئے جیسے آصف جاہی عہد نمبر، حیدرآباد کے اردو شعرا نمبر وغیرہ۔ قمرالدین صابری صاحب نے مکتبۂ شاداب کی بنیاد بھی رکھی تھی اور ادبی کتابیں پچاس فی صد ڈسکاؤنٹ پر نقد خریدا کرتے تھے۔ ان کے انتقال سے نہ صرف حیدرآباد کی ادبی صورت حال متاثر ہوئی بلکہ 'شاداب' پر بھی برے دن آئے۔ ان دنوں ڈاکٹر محبوب فرید اسے 'شاداب انڈیا' کے نام سے زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اس میں اردو انگریزی ادبی تخلیقات جمع کر کے اسے اپنے عصر سے ہم آہنگ کر دیا۔

مشہور شاعر میر محمد علی خاں میکش کے صاحب زادے مجتبیٰ فہیم نے اپنے والد کی یادگار قائم رکھنے کے لیے ماہ نامہ 'رنگ و بو' 1994 میں جاری کیا جس میں ہند و پاک کے لکھنے والوں کی تخلیقات شائع ہوا کرتی ہیں۔ آج بھی رنگ و بو ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

1996 میں جناب سعادت احمد نے ماہ نامہ 'پیام اردو' جاری کیا۔ وہ مخلص اردو نواز تھے۔ وہ نہ شاعر تھے نہ افسانہ نگار۔ ہر ماہ پابندی سے شائع ہونے والا 'پیام اردو' اچانک منظر عام سے ہٹ گیا۔ مدیر کی بھی کوئی خبر نہیں۔

1996 ہی میں حیدرآباد کے مشہور شاعر جناب صلاح الدین نیر نے ماہ نامہ 'خوشبو کا سفر' جاری کیا۔ مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والی بے بحر تخلیقات پر سخت تنقید بھی کیا کرتے ہیں۔ یوں وہ اصلاح کا فریضہ انجام دیتے ہیں تاکہ نئی نسل کی رہنمائی ہو۔

میر فاروق علی محکمۂ آب کاری (اکسائیز ڈیپارٹمنٹ) میں بڑے عہدے پر تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اپنا رسالہ ماہنامہ 'عدسہ' 2006 میں جاری کیا اور کئی خاص نمبر شائع

”

حیدرآباد سے آندھراپردیش اردو اکادمی کا ترجمان ماہ نامہ 'قومی زبان' 1981 سے شائع ہونے لگا۔ یہ چونکہ سرکاری نوعیت کا رسالہ ہے اس لیے اس میں شائع ہونے والی ادبی تخلیقات کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر سکریٹری اردو اکادمی کی نگرانی میں یہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

“

کیے جو دستاویزی نوعیت کے ہیں جیسے علامہ اقبال نمبر، عزیز احمد نمبر، میلاد نمبر، مصطفیٰ رسا نمبر، قرۃ العین حیدر نمبر، اقبال سہیل نمبر، مظفر مجاز نمبر وغیرہ اس کے علاوہ کچھ انوکھے نمبر نکال کر ادبی دنیا کو چونکایا جیسے بکری نمبر، کتا نمبر جوتا نمبر وغیرہ۔

بیشتر ہفتہ وار، پندرہ روزہ، ماہ نامے وغیرہ ملی جلی نوعیت کے نکلتے ہیں یعنی ادب کے ساتھ ساتھ کھیل، سیاست، سماجی مسائل وغیرہ پر معلومات بہم پہنچاتے ہیں مگر بعض پرچے صرف مذہب سے سروکار رکھتے ہیں جیسے حیدرآباد میں مسلک اہل حدیث کے بے غرض بے لوث مبلغ مولانا ابوتمیم محمدی کی ادارت میں 1960 کے آس پاس ماہ نامہ 'البیان' نکلتا تھا جس میں شرک و بدعات کے خلاف لکھا جاتا تھا۔ مولانا کی وفات (1973) کے بعد ان کے دستِ راست مولوی محمد مشیر الدین (ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب (لندن) کے والد) نے البیان جاری رکھا۔ یہ رسالہ عموماً پابندی سے شائع نہیں ہوتا تھا۔ آخرکار بند ہی ہو گیا۔

مولوی صفوۃ الرحمٰن صابر صاحب سلطان شاہی حیدرآباد سے پانچویں دہائی سے ماہ نامہ 'الحق' نکالا کرتے تھے جس میں مذہب اسلام کی جدید توضیح و تعبیر کی جاتی تھی جو مسلمات سے ٹکراتی تھی۔ 'الحق' ہی کے نام سے ان کے بعد ان کے شاگرد مولوی حبیب الرحمٰن پان منڈی سے یہ رسالہ نکالتے تھے جس میں بعض صحیح احادیث پر اعتراض کیے جاتے تھے۔ شب قدر اور عذاب قبر کا انکار کیا جاتا تھا۔ راسخ العقیدہ اصحاب الحدیث اسے 'الحق' کو باطل کا ترجمان سمجھتے رہے ہیں۔

ان دنوں سابق صوبائی امیر جمعیت اہل حدیث مولانا صفی احمد مدنی کی زیر ادارت ماہ نامہ 'گلستان حدیث' اور مولانا ساجد اُسید ندوی کی کوششوں سے ماہ نامہ 'صدائے سلف' نکل رہا ہے۔ مگر یہ رسالے وقت پر نہیں نکلتے۔

جماعتِ اسلامی کا ترجمان ہفتہ وار 'گیلو رائی' تلگو زبان میں دین اسلام کی ترویج و اشاعت میں ساتویں دہائی سے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے ہے۔ اس کے مدیر ایس ایم ملک تلگو زبان پر عبور رکھتے ہیں اور تلگو داں لوگوں سے دین اسلام کا تعارف کرانے میں کئی کتابچے چھاپتے رہتے ہیں۔

دارالسلام سبیل السلام حیدرآباد کا ترجمان 'صفا' 2004 سے نکل رہا ہے جس میں دینی مضامین چھپتے ہیں مولوی حمیدالدین عاقل کے قائم کردہ دارالعلوم حیدرآباد سے 2005 سے حسامی نکل کر دین و اخلاق پھیلا رہا ہے۔

1977 سے اقبال اکادمی حیدرآباد سے ششماہی 'اقبال ریویو' نکلتا ہے جس میں مختلف ماہرین اقبالیات کے اقبال سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔

قاضی اسد ثنائی 'الانصار' نکالتے ہیں جس میں ہند و پاک کے لکھنے والوں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم کا رسالہ شعر و حکمت کافی ضخیم نکلتا تھا اور چونکہ یہ رجسٹرڈ نہیں تھا اس لیے شعر و حکمت کتاب نمبر 1، شعر و حکمت نمبر 2، 3، 4 جیسے نام سے نکلا کرتا تھا۔ اس کے کئی خاص نمبر نکلے جیسے ن م راشد، میراجی نمبر وغیرہ اور کئی ادیبوں شاعروں کے بھرپور گوشے بھی نکلے جو الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع کیے گئے۔ کئی تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ضخیم شعر و حکمت ادبی دنیا میں اپنی انفرادیت کے لیے پہچانا جاتا تھا۔ پروفیسر مغنی تبسم کے گزر جانے کے ساتھ ہی یہ بھی دم توڑ گیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا مجلّہ عثمانیہ 1927 سے نکلتا رہا جس میں تحقیقی و تنقیدی مضامین بار پاتے تھے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے بعد یہ بھی ختم ہو گیا۔ مشہور ناول نگار عزیز احمد ان کے معاون تھے۔

بیشتر کالجوں سے سالانہ مجلّے نکلتے رہے ہیں مگر ان کی ادبی حیثیت غیر مسلمہ ہوا کرتی تھی۔ اب کسی کالج میں اردو دوسری زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے تو یہ بھی غنیمت ہے۔ لہٰذا اب کسی کالج کے اردو مجلّے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

■

Dr. Raoof Khair
9-11-137/1, Moti Mahal, Golconda
Hyderabad - 500008 (Telangana)
Mob.:09440945645
Email.: raoofkhair@gmail.com

محمد اسلم وکیل

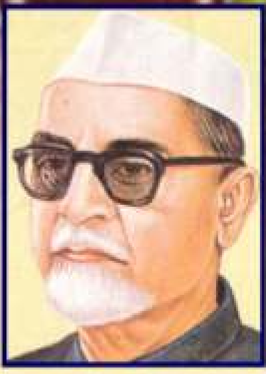

جامعہ کے جواہر

جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستان کا ایک عظیم تعلیمی ادارہ ہے۔ اس کی تاسیس 1920 عیسوی میں عمل میں آئی۔ یہاں سے ہندوستان اور بیرون ہند کی عظیم ترین شخصیات نے تعلیم حاصل کی اور اپنے اپنے میدان عمل میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ عظیم سیاست داں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ ہند، عظیم سپاہی اور سیاست داں رحیم الدین خاں، محترم اخلاق الرحمان قدوائی، ایران کے عظیم سفارتکار، سیاست داں، ماہر معاشیات محمد حسین اڈیلی، ہندوستان کی عظیم صحافی اور نیوز اینکر برکھادت، معروف فلم ایکٹر شاہ رخ خان، مشہور کرکٹر وریندر سہواگ، چینئی کی مشہور شخصیت ڈاکٹر زیندر جنارودھن، فعال جرنلسٹ محترمہ نہارکا اچاریہ، گگن اجیت سنگھ، حشمت احسان مند، مظفر عالم اور ہرش چھایا وغیرہ جیسی کئی شخصیات ہیں جنھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے کسب فیض کیا اور کامرانی کی نئی عبارتیں لکھیں۔

ان کے علاوہ جامعہ کے شعبۂ تدریس سے وابستہ افراد نے بھی جامعہ کی عظمتوں کے پرچم لہرائے اور اس کاشانۂ علم و ادب کو ایک یادگار علمی و تاریخی درسگاہ میں تبدیل کردیا۔

ان میں ایک اہم شخصیت ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہے۔ ان کا تعلق زندگی بھر تعلیم و تعلم سے رہا۔ انھوں نے تعلیم کے فروغ اور اس کی اشاعت کے لیے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ وقف کر دیا۔ ذاکر حسین صاحب ایک مفکر اور مصنف تھے۔ جن کے علمی اور ادبی کارناموں کو کسی طرح بھلایا نہیں جاسکتا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا تعلق بنیادی طور پر دکن، حیدر آباد سے تھا۔ وہ 1889 میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام فدا حسین تھا جو اس زمانے میں دکن میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ حالاں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے جد اعلی حسین خان، محمد شاہ کے زمانہ حکومت میں افغانستان سے روہیل کھنڈ، قصبہ قائم جان میں آکر آباد ہوئے تھے لیکن زمانے کی گردش نے ان کے والد کو دکن لے جا کر بسایا۔ ذاکر صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم بھی دکن میں ہی پوری کی اور پھر وہاں سے تعلیم کے سلسلے میں دہلی اور دہلی سے علی گڑھ کا سفر طے کیا۔ جس زمانے میں جامعہ دہلی میں ایک مستقل تعلیمی ادارے کی صورت میں اپنے قدم جمانے لگا اس عہد میں ذاکر صاحب کی تدریسی صلاحیتوں نے اپنے بل پر اس کی جڑیں مضبوط کیں۔ حالانکہ ہم اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات جیسی عظیم ہندوستانی تحریکوں میں ذاکر صاحب ہمیشہ متحرک رہے لیکن اس سے ان کی علمی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ذاکر صاحب کی زندگی کے تین پہلو ایسے ہیں جو ہندوستانی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، پہلا ان کا سیاستداں ہونا، دوسرا علی گڑھ کا وائس چانسلر ہونا اور تیسرا جامعہ کا پرنسپل ہونا، لیکن ان کی شخصیت کا چوتھا سب سے زیادہ متاثر کن پہلو ہے اور وہ ہے بچوں کے لیے کتابوں کی تصنیف و تالیف۔ ذاکر صاحب نے داستانی انداز میں 'ابوخان کی بکری'، 'گل عباس'، 'مرغی کا نرالا بچہ'، 'پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی'، 'سعیدہ کی اماں' اور 'اسی سے ٹھنڈا اسی سے گرم' جیسی ناقابل فراموش کہانیاں لکھیں۔ جس میں زندگی کو سمجھنے کے اور اس کو بہتر انداز میں گزارنے کے مفید نسخے موجود ہیں۔ ان کی تمام کہانیاں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ ذاکر صاحب کو حالاں کہ بحیثیت مصنف آج اتنی شہرت حاصل نہیں جس کی شاید وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے زندگی کے اتنے مختلف شعبوں میں کام کیا ہے کہ صرف تصنیف و تالیف تک ہی خود کو محدود نہ رکھتے ہوئے عملی میدان میں ان کے جوہر زیادہ نظر آتے ہیں، لیکن ان کی شخصیت کا علمی اور ادبی پہلو ایسا نہیں کہ جو کسی طرح بھی کمزور کہلائے۔ آل احمد سرور نے اس حوالے سے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے، سرور صاحب اپنے مضمون 'ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات' میں رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں ایک مفکر کی تابانی فکر، ایک معلم کی شفقت و مرحمت، ایک عاشق کا سوز و گداز، ایک مدبر کا وزن و وقار، ایک صوفی کی درویشانہ شان، اور ایک مہاتما کی سی معصومیت، سب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ علوم میں ان کی نظر ہمہ گیر اور ان کی معلومات ہمہ رنگ تھی۔ فلسفہ، اقتصادیات، ادب، سائنس، تعلیم، تصوف، مذہبیات ہر موضوع پر ان کا مطالعہ گہرا اور ان کا علم حاضر ہے۔ ان کے یہاں علم صرف معلومات کا خزانہ ہی نہیں، انسانیت کی اعلی اقدار کی خدمت کا وسیلہ بھی ہے۔ وہ صرف اگر مصنف یا معلم ہوتے تو بھی ان کا درجہ بہت بڑا ہوتا، مگر ان کی سیمابی فطرت نے کبھی تصنیف و تالیف کے گوشۂ عافیت پر قناعت نہیں کی۔''

(ڈاکٹر ذاکر حسین، سیرت و شخصیت، ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات،

آل احمد سرور، ص 117)

جامعہ ایک ایسا ادارہ ہے جس کو ہر عہد میں ایسی ہی نابغہ روزگار ہستیاں نصیب ہوتی رہی ہیں جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں کو اپنے کارہائے نمایاں سے روشن کیا۔

جن کی تعلیمی اور ادبی صلاحیتوں نے اس یونیورسٹی اور خاص کر اس کے شعبہ اردو کے وقار کو بلند کیا، ان شخصیات میں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، محمد اسلم جیراجپوری، حسن سبحانی، بشیر احمد انصاری، سید محمد حسنین، سید نذیر نیازی، پروفیسر مسعود حسین خاں، گوپی چند نارنگ، ضیاء الحسن فاروقی، انور صدیقی، ڈاکٹر عنوان چشتی، شمیم حنفی، قاضی عبیدالرحمان ہاشمی، سید فرحت حسین، جمیل احمد اور عبداللطیف اعظمی کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

طلسم خیال، محراب بین المشرقین، زندہ ادب اور محبت نامے وغیرہ کے خالق ڈاکٹر عابد حسین جس زمانے میں جرمنی سے اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس لوٹے تو پروفیسر محمد مجیب اور محترم ڈاکٹر ذاکر حسین بھی ان کے ہمراہ تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب جامعہ اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا اور اس کی سانسیں کبھی سنبھلتی تھیں اور کبھی حالات کے تھپیڑوں سے اکھڑنے لگتی تھیں، اس عہد میں اشخاص نے کس طرح جامعہ کو تازہ دم کیا اور اس ادارے کو حیات نو بخشی اس کا بیان اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ڈاکٹر عابد حسین کا لہو کس طرح جامعہ کی بنیادوں میں شامل ہے۔ اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس کو ان حالات کے چشم دیدہ گواہ محترم معین الدین حارث نے رقم کیا ہے۔

''تاریخ تو اب یاد نہیں، مگر فروری کا مہینہ اور جاڑوں کے وہ دن ضرور یاد ہیں جن میں جامعہ کی بستی میں یہ خبر پھیلی کہ وہ تین نوجوان جو جرمنی میں اعلا تعلیم سے فراغت حاصل کر چکے ہیں اور جنھوں نے جامعہ کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے کا فیصلہ کیا ہے، بہت جلد دہلی آ رہے ہیں۔ جامعہ کے ابتدائی دور میں اس کے اخراجات کا بار مرکزی خلافت کمیٹی اٹھایا کرتی تھی، مگر جب تحریک خلافت سرد پڑنے لگی اور خلافت کمیٹی نے اس بار کے برداشت کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تو جامعہ کے اخراجات کا بار اٹھانے کی ذمے داری قبول کرنے والے حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کو ان کے سفر یورپ میں انھی نوجوانوں نے اس بات کا یقین دلایا کہ اپنی تعلیم کے خاتمے پر وطن واپس آ کر وہ اپنے آپ کو جامعہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے۔''

(جامعہ ملیہ اور عابد حسین، از معین الدین حارث، کتاب نما عابد حسین نمبر اگست 1981، ص 27)

اور ایسا ہوا بھی، ان تینوں نے اپنے آپ کو وقف کیا اور اس طرح وقف کیا کہ یہ لوگ جامعہ کے معماروں میں شامل ہو گئے، ڈاکٹر ذاکر حسین اور محمد مجیب سے قطع نظر ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی صلاحیتوں کے میدان کو مزید وسیع کیا جس کی وجہ سے وہ جامعہ کے اشاعتی پروگراموں میں بھی شامل ہو گئے، معین الدین حارث لکھتے ہیں:

''جہاں تک ڈاکٹر عابد حسین کا تعلق ہے، وہ علاوہ اپنے حصے کے تدریسی کام کے، جامعہ کی ان کارگزاریوں میں نمایاں حصہ لینے لگے جو کسی جامعہ یا یونیورسٹی کی ترقی میں اہم ہوتے ہیں۔ جامعہ کے ابتدائی دور ہی میں، اس میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آ گیا تھا اور اس کام کی نگرانی کے لیے اور اسے آگے بڑھانے کے لیے ڈاکٹر عابد حسین سے بہتر شخصیت کون ہو سکتی تھی! انھوں نے اس کام پر اور رسالہ جامعہ کی ادارت پر خصوصی توجہ کی۔ اسی کے ساتھ جامعہ کا اپنا پبلشنگ ہاؤس، مکتبہ جامعہ کی شکل میں موجود تھا۔ مکتبہ کو رہنمائی کی قدم قدم پر ضرورت پڑتی تھی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے میں بھی ڈاکٹر عابد حسین کا حصہ نمایاں رہا اور یہ مکتبہ جامعہ کی خوش نصیبی رہی کہ جب عمر کے تقاضے سے عابد صاحب جامعہ کے رسمی کاموں سے سبکدوش ہو گئے، اس دور میں بھی مکتبہ جامعہ کو ان کی رہنمائی برابر حاصل رہی۔''

(جامعہ ملیہ اور عابد حسین، از معین الدین حارث، کتاب نما عابد حسین نمبر اگست 1981، ص 29)

عابد صاحب نے رسالہ جامعہ کی ادارت کے علاوہ الگ سے 'نئی روشنی' بھی جاری کیا تھا لیکن وہ زیادہ دنوں نہ چل سکا، ان کی ایک کتاب جو انھوں نے 'ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں' کے نام سے تحریر کی تھی ان کا سب سے اہم تحریری سرمایہ قرار دی جاسکتی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان رقم کی ہے جو بقول حارث صاحب اسی نوعیت کی کتاب ہے جس نوعیت کی کتاب مولانا طفیل احمد کی 'مسلمانان ہند کا روشن مستقبل' ہے۔

محمد مجیب بھی ان ارباب ثلاثہ میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی قلبی وابستگی جامعہ سے تھی۔ محمد مجیب ایک بڑے ادیب اور بڑے تخلیق کار تھے۔ ان کا شمار اردو کی صف اول کے ڈرامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ تعلیم و تعلم ان کا پیشہ تھا اور تخلیقیت ان کا اثاثہ۔ قوم سے ہمدردی، تعلیم سے محبت اور تخلیق کا عمل ان تینوں عناصر سے اگر کوئی شخصیت تشکیل پاسکتی ہے تو وہ محمد مجیب ہی کی شخصیت بنے گی۔ محمد مجیب کی ذات ایک انجمن تھی جس نے اپنے اطراف و جوانب کو علم کی روشنی سے پرنور کر دیا۔ ان کی شخصیت کے تعلق سے ان کے معاصرین کا خیال تھا کہ وہ اتنے علوم میں ماہر ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ان کا علم جتنا وسیع تھا ان کی شخصیت بھی اتنی ہی پر اسرار تھی۔ میں یہاں مجیب رضوی کا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں جس میں ان کی بے چارگی اور محمد مجیب کی کشش جہتی شخصیت کا ہمیں احساس ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہمارے اس معلم کی شخصیت بہت ہی طرح دار ہے یا بڑی تہہ دار ہے اور میں نہیں جانتا کہ اس کی کتنی تہیں میری نظروں سے اوجھل ہیں۔ مجھے تو اس کا ایک جملہ ہی اس کی شخصیت کا جام جمشید معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر مجیب نے برسوں پہلے ایک بیاض پر انگریزی میں ایک جملہ لکھا تھا: 'جب واقعی میں مر گیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں زندہ ہوں۔' جی چاہے فنا کے بعد بقا کا تصور اس میں ڈھونڈ لیجیے، جی چاہے گوتم بدھ کا نروان، ایک شمع بجھتے بجھتے دوسری شمع روشن کر جاتی ہے کا فلسفہ تلاش کر لیجیے سن سکیں تو وحدت الوجود کی آہٹ اس میں سن لیجیے، توفیق ہو تو سائنس کے اعلان پر کان دھریے، کوئی مادہ مٹتا نہیں، اس کی صرف شکل بدل جاتی ہے۔ اس ایک جملے میں معنویت کی جو گہرائی، گیرائی اور وسعت ہے اسی کا پیکر ہے معلم محمد مجیب۔

(ایک معلم کی کہانی، از مجیب رضوی، محمد مجیب احوال و افکار، مطبوعہ مکتبہ جامعہ، ص 70-71)

یہ باتیں ایسی نہیں جو ہر کسی کے لیے کہہ دی جائیں، ہم جانتے ہیں کہ ایسی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں جس میں گردش زمانہ بھانت بھانت کی صلاحیتیں پیوست کر کے انھیں انسانیت کے حوالے کرتا ہے۔ محمد مجیب نے اپنی فکر اور اپنے مطالعے سے وہ مقام حاصل کیا تھا جس پر پہنچ کر ہر چیز بے معنی اور ہر شے بامعنی ہو جاتی ہے۔ انھوں نے جو ادبی خدمات انجام دی ہیں ان سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اور ان کا تذکرہ آئے دن ہوتا رہتا ہے، لیکن جامعہ کے لیے جو کارہائے نمایاں مجیب صاحب نے انجام دیے ہم اس کو فراموش کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا اعادہ ہو اور محمد مجیب کو بحیثیت ادیب کے ساتھ ساتھ بحیثیت معمار جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی یاد کیا جاتا رہے۔

■

Mohd Aslam Wakeel
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

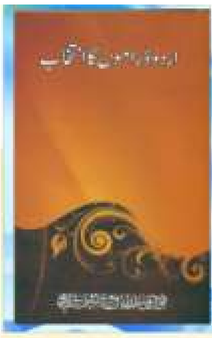

انتخابات (نظم ونثر)

اردو ڈراموں کا انتخاب

مرتب: پروفیسر محمد حسن

پروفیسر محمد حسن ترقی پسند تحریک کے نہایت فعال اور نمائندہ ادیب تھے۔ ڈرامہ ان کی اولین ترجیحات میں سے تھا۔

مذکورہ کتاب اردو کے ان اٹھارہ ڈراموں کا مجموعہ ہے جن کی تخلیق آزادی کے بعد کھلی فضا میں ہوئی اور اس میں شامل تمام ڈرامہ نگار اس صنف میں اپنا اہم مقام رکھتے ہیں۔ کتاب میں شامل سبھی ڈرامے میں کسی نہ کسی ہندوستانی مسئلے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ان میں بعض ڈرامے تو ایسے ہیں جنھیں آج بھی کافی مقبولیت حاصل ہے اور اس کے اسٹیج ہونے کی خبر ملتے ہی شائقین کی بھیڑ اُمڈ پڑتی ہے جیسے آگرہ بازار، بلہ بول اور ضحاک وغیرہ۔ ان میں بعض ڈراموں کو ریڈیائی شکل میں بھی پیش کیا گیا ہے جیسے شمیم حنفی کا مٹی کا بلاوا اور ضحاک کو آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے پیش کیا گیا اور سامعین نے اس ڈرامے کو پسند کیا۔

اس انتخاب کا پہلا ڈرامہ 'آگرہ بازار' ہے یہ ڈرامہ بیسویں صدی کے مشہور ڈرامہ نویس اور اداکار حبیب تنویر نے لکھا تھا جس میں 19 ویں صدی کے آگرے کو پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ 'آگرہ بازار' میں نظیر کے دور کی سماجی عکاسی کی گئی ہے لیکن نظیر دور دور تک ڈرامے میں نظر نہیں آتے۔ حالانکہ ذکر آگرہ ہو اور نظیر کا ذکر خیر نہ ہو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے جس نے اردو میں پہلی بار بازار، میلوں اور عام سماجی رویے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا۔

دوسرا ڈرامہ ریوتی سرن شرما کا 'انسان' ہے جس میں زندگی اور موت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

زاہدہ زیدی کا ڈرامہ 'وہ صبح کبھی تو آئے گی' اس مجموعے میں شامل ہے جس میں عورت کے ایک روپ کو دکھایا گیا ہے۔ ایک ایسا روپ جو بالخصوص ہندوستان اور بالعموم ایشیا کی عورتوں کا مقدر بن چکا ہے۔

مرتب کا ڈرامہ ضحاک کے متعلق خود ڈرامہ نگار محمد حسن کی رائے دیکھیے کہ ''کس طرح اقتدار کے آگے انسانی تہذیب کے مقدس ترین اداروں کے سربراہ جھک جاتے ہیں اور اس کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ ضحاک ضمیروں کی اسی خریداری اور سوداگری کی کہانی ہے۔''

ڈرامے کے اس انتخاب میں ایک اہم نام ابراہیم یوسف کا ہے اور ان کے ڈرامے 'روبینہ' کا انتخاب کیا گیا ہے۔

اردو میں تنقید سے ڈرامے کی طرف سفر کرنے والوں میں ایک سرفہرست نام شمیم حنفی کا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو کئی بہترین ڈرامے دیے۔ ان کا تحریر کردہ ڈرامہ 'مٹی کا بلاوا' ہے۔ یہ ڈرامہ بھی ریڈیو سے کئی بار نشر ہو چکا ہے جب کہ رفعت سروش کا ڈرامہ 'عورت' بہت ہی خوبصورت ڈرامہ ہے۔

مشہور تھیٹر آرٹسٹ صفدر ہاشمی کے دو ڈرامے 'ہلہ بول' اور عورت مذکورہ کتاب میں شامل ہے۔ اس میں عورت کے ایک مخصوص کردار کو پیش کیا گیا ہے جب کہ دوسرا ڈرامہ ہلہ بول کا موضوع ہڑتال ہے۔ صفدر ہاشمی کے ڈرامے دراصل نکڑ ناٹک ہوتے ہیں جنھیں کسی مخصوص اسٹیج کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہلہ بول ڈرامے کے اندر ڈرامہ ہے۔ یہ صفدر ہاشمی کے کامیاب ترین ڈراموں میں سے ایک ہے۔

ساگر سرحدی کا تحریر کردہ ڈرامہ 'مسیحا' اس انتخاب کا سب سے آخری ڈرامہ ہے اور یہ منٹو کی کہانی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے کافی مشابہ ہے۔ ساگر سرحدی نے اس ڈرامے کو نہایت سادگی اور بے ساختگی سے پیش کیا ہے۔

کتاب میں محمد حسن نے پیرایۂ اظہار اور تعارف کے عنوان سے بائیس صفحات قلمبند کیے ہیں۔ اول الذکر کے تحت ڈرامے کی تاریخ اور اس کے اجزائے ترکیبی کو نہایت بسیط انداز میں پیش کیا گیا ہے جو کتاب کا حاصل مطالعہ بھی ہے اور ڈرامے کی تفہیم میں معاون و مددگار بھی۔

—— ریحانہ فاطمہ

آزادی کے بعد اردو غزل

مرتب: شمس الرحمٰن فاروقی / مظہر مہدی

کہتے ہیں کہ شاعری بیج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر اسے محفوظ کر لیا جائے تو پچھلے تمام تاریخی و ثقافتی اور ادبی واقعات وفضا کی از سر نو بازیافت کی جا سکتی ہے۔ آزادی کے بعد اردو غزل کی ترتیب و تدوین کا مقصد بھی غالباً یہی ہے کہ آزادی کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو صنف غزل سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں مختلف دور کے شعرا کے قلبی واقعات و واردات کی تحصیل ان کے شعری متن سے ہو سکتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کی ترتیب و تدوین شمس الرحمٰن فاروقی اور معاونت مظہر مہدی نے کی ہے۔ کتاب کی ضخامت 842 صفحات کو محیط ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اردو رسم خط میں مرقوم سارا مواد ہندی رسم خط میں بھی متوازی درج ہے۔ تاکہ آزادی کے بعد کی غزلیہ شاعری ہندی داں طبقے کو بھی میسر آئیں۔ چہ جائیکہ اردو داں تک محدود رہیں۔ مذکورہ کتاب اردو قومی کونسل کے اہم کارناموں میں سے ایک ہے۔ پہلی اشاعت 2009 میں ہوئی۔

قومی کونسل کے ڈائرکٹر ایک صفحے کے پیش لفظ جو کہ ہندی میں بھی درج ہے، کے بعد ڈھائی صفحے کا مقدمہ ہندی، اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہوا درج ہے۔ مقدمہ شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے۔ بعد ازاں اردو ہندی رسم خط میں متوازی 8 صفحات کو محیط آزادی کے بعد کے شعرا کی فہرست ہے جس میں 85 شاعروں کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ شعرا کے درمیان بہ فرق مراتب چار سے لے کر دس غزلوں تک کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یگانہ چنگیزی، فیض، فراق، شہریار کی دس دس غزلوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں درج انتخاب کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ در آئے مشکل الفاظ و استعارات، ہندی کے متن میں معنی کے ساتھ تحریر کر دیے گئے ہیں تاکہ ہندی والوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہو سکے۔ ہر شاعر کے کلام کے آغاز میں سن پیدائش و وفات درج ہے۔

—— انوار الحق

یک بابی اردو ڈرامے (انتخاب)

ترتیب و انتخاب: زبیر رضوی

زیر تبصرہ کتاب ''یک بابی اردو ڈرامے'' زبیر رضوی کا انتخاب ہے۔ اردو یک بابی ڈراموں کا یہ انتخاب ڈرامے سے ان کی گہری دلچسپی اور شغف کو اجاگر کرنے کے ساتھ

ساتھ ان کے پختہ شعور اور بالیدہ فکر کا بھی بین ثبوت ہے۔ 29 طبع زاد ڈراموں پر مشتمل اس انتخاب سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ اردو ڈراما خواہ فل لینتھ ہو یا پھر یک بابی، وقت اور حالات کے تقاضوں سے ہمیشہ ہم آہنگ رہا ہے۔ مزید برآں اردو ڈراما مسلسل نئے موضوعات اور نئے فنی لوازم و تکنیک کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

انتھالوجی میں شامل یک بابی اردو ڈراموں کا زمانہ سات دہائیوں کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ انتھالوجی کی ابتدا، کرشن چندر کے ڈرامے ''کتاب کا کفن'' سے ہوتی ہے اور سعادت حسن منٹو کے یک بابی ڈرامے ''اس منجدھار میں'' پر اس ترتیب کا اختتام ہوتا ہے۔

اردو ڈرامے کی تاریخ وتنقید اور ارتقا پر تو کتابیں بآسانی دستیاب ہیں لیکن ان کتابوں میں یک بابی ڈراموں کے ذکر کو خلط ملط کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ ایک ایسا انتخاب ہو جس میں اردو کے نمائندہ یک بابی ڈرامے ترتیب دیے جائیں جن سے اس کمی کی تلافی ہو سکے۔ زبیر رضوی صاحب کا یک بابی اردو ڈراموں کا یہ انتخاب وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

زبیر رضوی نے یک بابی اردو ڈراموں کی ترقی و رفتار کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ایک مختصر مگر جامع اور پر مغز دیباچہ بھی تحریر کیا ہے۔ انھوں نے دیباچے میں نئے تھیٹر کی شناخت کے حوالے سے بھی اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

—نوشاد عالم

آزادی کے بعد اردو افسانہ

مصنف: گوپی چند نارنگ/ ارتضیٰ کریم/ اسلم جمشید پوری

'آزادی کے بعد اردو افسانہ' افسانوں کا ایک انتخاب ہے جس میں کرشن چندر، بیدی سے لے کر بعد کی نسلوں سے تعلق رکھنے والے ان افسانہ نگاروں کے نمائندہ افسانے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مرتبین میں گوپی چند نارنگ، ارتضیٰ کریم اور اسلم جمشید پوری جیسے اہم نام شامل ہیں۔ اس کی اشاعت 2003 میں عمل میں آئی۔ اس انتخاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ ذولسانی (Bilingual) ہے۔ دائیں طرف اردو متن اور بائیں طرف ہندی متن ہے۔ مشکل اردو الفاظ کے معنی بھی ہر صفحے کے حاشیے پر درج کردیے گئے ہیں تاکہ ہندی داں طبقے کو کسی قسم کی دقت نہ ہو۔

اس انتخاب میں پریم چند کے بعد کی نسل کے جن افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے ان میں قرۃ العین حیدر اور جوگندر پال اہم ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا افسانہ 'جلاوطن' اس انتخاب میں شامل ہے جو تقسیم ملک کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فساد، ہجرت اور نقل مکانی کے علاوہ خارجی و داخلی جلاوطنی کے موضوع پر لکھا گیا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ اس انتخاب میں جوگندر پال کا افسانہ 'کھودو بابا کا مقبرہ' شامل کیا گیا ہے۔ کھودو بابا اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جس کی بنیاد پر جوگندر پال نے سیدھے سادے اسلوب میں آزادی کے بعد ہندوستان کی اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی کشمکش اور تصادم کو پیش کیا ہے۔ اس انتخاب میں اقبال مجید، سریندر پرکاش، بلراج مین را، غیاث احمد گدی، کلام حیدری اور جیلانی بانو کے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے 70 کی دہائی سے لکھنا شروع کیا تھا۔ جبکہ اردو میں جدیدیت کا غلغلہ تھا۔ سریندر پرکاش کا افسانوی مجموعہ 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم' بلراج مین را کا 'ماچس' اقبال مجید کا 'دو بھیگے ہوئے لوگ' جیلانی بانو کا 'موم کی مریم' وغیرہ افسانوی مجموعے اردو میں جدیدیت کا شناخت نامہ مانے جاتے ہیں ان میں سریندر پرکاش اور بلراج مین را نے علامتی اور تجریدی افسانے زیادہ لکھے ہیں۔

یہ انتخاب 'آزادی کے بعد اردو افسانہ' اردو فکشن کے خصوصاً افسانے کے سو سالہ سفر کی روداد ہے۔ ان افسانوں میں ایک رنگ نہیں مختلف رنگ ہیں اس لیے اس انتخاب کو اس اعتبار سے اردو افسانے کا دھنک رنگ بھی کہا جاسکتا ہے یہ جیسا کہ اس کے مقدمے میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ افسانوی تجربوں کا ایک نگارخانہ ہے یا پکچر گیلری جس میں آزادی کے بعد بدلتی ہوئی تہذیبی وتمدنی صورت حال ملک کا بدلتا ہوا سماجی و سیاسی منظرنامہ اور بدلتی معاشرت اور طرز سیاست کے زیر اثر تخلیق کاروں کے بدلتے ہوئے ذہنی رویے اور اسالیب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس انتخاب سے یہ بھی اندازہ لگانے میں آسانی ہوتی ہے کہ بدلتے وقت کے ساتھ اردو افسانے میں ہیئت کی سطح پر کس طرح کے تغیرات و تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور اردو افسانے نے استعاراتی علامتی اظہار سے کس طرح حقیقت پسندانہ رویہ یا اس کے علاوہ اور بھی دیگر تبدیلیوں کو قبول کیا ہے۔ اس انتخاب میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد یا مابعد جدیدیت کی نئی ثقافتی صورت حال سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔

—شبیر عالم

آزادی کے بعد اردو اسٹیج ڈرامے

مرتبہ: زبیر رضوی

ڈراما دیگر فنون ادب کی طرح ایک مستقل فن ہے۔ لیکن ڈراما اور دیگر فنون میں اشتراک کے باوجود بڑا فرق بھی ہے۔ یہ ایسی صنف ادب ہے جس کا تعلق قارئین سے کہیں زیادہ ناظرین سے ہے۔ ڈراما میں بیانیہ اظہار کی گنجائش کم ہی رہتی ہے اس لیے کردار کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کردار ہی افراد کے احساسات وجذبات اور تجربات ومشاہدات کو اپنے اوپر طاری کر کے اسٹیج پر ظاہر کرتے ہیں۔ اسٹیج ڈرامے کی ایک شاندار روایت رہی ہے جو آج بھی قائم ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 'آزادی کے بعد اردو اسٹیج ڈرامے' بارہ ایسے اسٹیج ڈراموں کا انتخاب ہے جسے زبیر رضوی نے ترتیب دیا ہے۔ ڈراموں کے تعلق سے زبیر رضوی کا مطالعہ گہرا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں زبیر رضوی نے آغاز سے لے کر اب تک عہد بہ عہد اردو ڈرامے کے بدلتے منظرنامے کی معروضی اور غیر جانبدار اجمالی تاریخ پیش کی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مذکورہ کتاب کے ڈرامے فیشن کے طور پر نہیں بلکہ قومی تھیٹر کے بدلتے منظرنامے کے علاوہ سماجی، سیاسی اہمیت کے حامل ہیں اور جن میں تکنیک اور اسلوب کے نئے زاویے بھی در آئے ہیں۔

پہلا ڈراما 'شطرنج کے مہرے' معروف ڈراما نویس اور اداکار حبیب تنویر کا تحریر کردہ ہے۔ یہ پریم چند کا افسانہ 'شطرنج کی بازی' کا ڈرامائی روپ ہے۔

ڈراما 'رات' میں جاوید صدیقی نے پولس انتظامیہ کے ظالمانہ اور نفرت انگیز سلوک کا پردہ فاش کیا ہے جہاں بغیر کسی تفتیش اور ٹھوس ثبوت کے شک وشبہ کی بنیاد پر بے قصور افراد کو ایذا پہنچائی جاتی ہے اور اسے بھوکے پیاسے رکھ کر اقبال جرم پر مجبور کیا جاتا ہے۔

ڈرامہ 'سنہ ستاون' کا قصہ میں ڈرامہ نگار نے کانپور کی معروف طوائف عزیز النسا کو 1857 کی جنگ میں حصے داری کو موضوع بنایا ہے جس کی پاداش میں انھیں پھانسی دی گئی تھی۔

'جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جنمیا نہیں' اصغر وجاہت کا مشہور ومعروف ماسٹر پیس ڈراما ہے۔ یہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ڈرامے کی سماجی معنویت شدت سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

'غیر ضروری لوگ' کی مقبولیت کے بعد شاہد انور کا مذکورہ ڈراما 'پی تھری' اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے کافی شہرت کا حامل رہا۔ ڈرامے میں Shadow enemy کی بات کی گئی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے کہا تھا کہ ہم Pure Blood ہیں اور اسی بنیاد پر یہودیوں کو گیس چیمبر میں ماردیا۔ مذکورہ ڈراما اسی پس منظر میں رقم کیا گیا ہے۔

نند کشور آچاریہ کا ڈراما 'غلل سبحانی' چودھویں صدی کے اس ہندوستان کو پیش کرتا ہے جب علا الدین خلجی کی حکمرانی تھی، اس وقت بادشاہ ہی سب کچھ تھا عوام کی کوئی حیثیت نہیں کے برابر تھی۔

اس مجموعے میں شامل تمام ڈرامے نمائندہ ڈراموں کے زمرے میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں۔ 'آزادی کے بعد اردو اسٹیج ڈرامے' کو منظر عام پر لانے کا مقصد شاید یہ ہے کہ ادیب و فنکار کے علاوہ عام قاری بھی اسٹیج ڈرامے کی طرف متوجہ ہوں اور اردو ادب میں اس کی اہمیت وافادیت کو محسوس کریں۔

—ابوظہیر ربانی

آزادی کے بعد اردو طنزومزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

اردو ادب میں طنزومزاح کی جلوہ فرمائیاں ہمیں اس کے آغاز ہی سے نظر آتی ہیں۔ ابتدا میں یہ تصویر نہ تو پوری طرح واضح تھی اور نہ ہی فنی اعتبار سے پختہ۔ لیکن جس طرح اردو ادب مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا ہر موڑ پر اپنے اندر نئے نئے رنگ سمیٹتا رہا اسی طرح طنزومزاح بھی نئی جہتوں سے روشناس ہوا۔ آزادی سے قبل طنزومزاح کے موضوعات کا زیادہ تر تعلق ہندوستان پر انگریز حکومت اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات سے تھا، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے نہیں گئے۔

زیر تبصرہ کتاب ''آزادی کے بعد اردو طنزومزاح'' کو پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کافی عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کو موصوف نے آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر ومعیاری طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سے اس خوبصورتی کے ساتھ مزیّن کیا ہے کہ اس میں مزاحیہ ادب کے ذیل میں آنے والی ان تمام چیزوں کا احاطہ بھی ہوگیا ہے کہ جن کو کبھی طنز کبھی ظرافت اور کبھی استہزا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جن کی حدیں انشائیہ نگاری اور خاکہ نگاری وغیرہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں پاکستان چلے جانے والے ان طنزومزاح نگاروں کے مضامین کو بھی جگہ دی گئی ہے، جنھوں نے آزادی یا ملک کی تقسیم تک مزاحیہ اور طنزیہ ادبی سرمایے کی تشکیل میں حصہ لیا اور جن کی تحریروں کو ملک کی تقسیم کے بعد بھی ہندوستان میں اس حد تک مقبولیت حاصل ہوئی کہ نصابی کتب اور تنقیدی تاریخ میں برابر کی جگہ ملی مثلاً ابراہیم جلیس اور پطرس بخاری وغیرہ۔

یہ انتخاب آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے کہ جس کے حوالے سے اس کے ارتقائی منازل کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک جامع کتاب ہے جو کم وبیش 25 مختلف نوع کے دلچسپ وخوش اسلوب مضامین سے مزین ہے امید کی جاسکتی ہے۔

—وسیم اقبال

پیروڈی :نقد و انتخاب (جلد اوّل ودوم)

مرتبہ: امتیاز وحید

زیر تبصرہ کتاب 'پیروڈی: نقد وانتخاب' دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول میں پیروڈی کے فکر وفن اور اس کے نظری مباحث پر تنقیدی مقالات شامل ہیں، جبکہ دوسرے حصے میں نثری پیروڈیوں کا جامع انتخاب ہے۔ اس انتخاب کو اس لحاظ سے اہمیت بلکہ اولیت کا درجہ حاصل ہے کہ اردو میں نثری پیروڈیوں کا یہ پہلا انتخاب ہے۔

تحقیق کے دوران ان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا انھی ساعتوں میں امتیاز وحید نے یہ طے کرلیا کہ اب اس راستے کو ایسا ہموار اور مسطح کردینا ہے کہ آئندہ کسی کو اس فن میں مواد کی تنگ دامانی کا شکوہ نہ کرنا پڑے اور نہ کوئی یہ کہہ سکے کہ اردو میں اس صنف سخن میں نقد وتنقیح کا قافیہ تنگ ہے۔

جلد اول چار مباحث 'نقد ونظر'، 'منظوم پیروڈیاں'، 'نثری پیروڈیاں' اور 'پیروڈی نگار' پر مشتمل ہے۔ نقد ونظر کے تحت پیروڈی کے فن، روایت اور معاصر تصورات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس حصے میں چودہ (14) مقالے شامل ہیں۔ ان کے مطالعے سے پیروڈی کے صنفی مباحث پوری طرح واضح ہوجاتے ہیں۔ اس حصے میں پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر مظہر احمد اور غلام احمد فرقت کاکوروی کے مضامین شامل ہیں۔ اپنی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضامین اور پس ساختیاتی تناظر میں، پروفیسر قاضی افضال حسین کا مضمون موجود متن کے بطن سے پیروڈی کی شکل میں ایک نئے متن کی بازیافت پر بحث وتمحیص کی دعوت دیتا ہے۔ صنفِ پیروڈی کی بازآوری میں بلاشبہ یہ مضمون اساسی کردار کا حامل ہے۔

'نثری پیروڈیوں' کے ضمن میں قطب الدین اشرف کا مقالہ 'اردو نثر میں پیروڈی کا فنی ارتقا' کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ پیروڈی نگار کے طور پر پطرس بخاری، شیخ نذیر، کنھیا لال کپور، شہباز امروہوی، راجہ مہدی علی خاں، ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، احمد جمال پاشا اور ظفر کمالی کے فکر وفن کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ اس زمرے میں مرتب نے شہباز امروہوی اور ظفر کمالی کی پیروڈیوں کا نہایت سلیقے سے تجزیہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ پیروڈی سے متعلق کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے۔

دوسری جلد میں 25 پیروڈی نگاروں کی نثری پیروڈیوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ باون صفحات پر مشتمل طویل مقدمہ بھی ہے جس میں پیروڈی کی ادبی تاریخ، صنفی حیثیت، انگریزی اور اردو میں اس کی روایت اور انتخاب میں شامل پیروڈیوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مقدمے میں فکر تونسوی، مشفق خواجہ اور ظفر کمالی کی پیروڈیوں کے تجزیے سے امتیاز وحید کے ادبی ذوق اور فن پیروڈی پر ان کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ امتیاز وحید نے ان جائزوں میں خود کو فکر کی آنچ پر کندن کیا ہے۔ فکر تونسوی کی پیروڈی کی تہہ میں تقسیم ہند کے المناک واقعے کی نشاندہی، مشفق خواجہ کو پیروڈی نگار کی حیثیت سے دیکھنا اور ظفر کمالی کی پیروڈیوں کی تفہیم فاضل مرتب کی شرح کو پڑھے بغیر ممکن نہیں اسی طرح جدیدیت پر اے رحمان کی پیروڈی کو ڈھونڈ نکالنا بھی محقق کا کارنامہ ہے۔

اس جلد میں فاضل مرتب کی وہ تحریر جو 'قصہ پیروڈی کے انتخاب کا' کے نام سے شامل کتاب ہے، پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ملک کے بیشتر اردو کے شعبوں میں طنزومزاح کا ایک پرچہ ہے جس میں پیروڈی بھی شامل ہے۔ اب تک طلبہ نے وزیر آغا، ڈاکٹر مظہر احمد اور بعض دوسری ضمنی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ اس کتاب کے آجانے کے بعد طلبہ براہ راست اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ بہتر ہوگا کہ دوسرے ایڈیشن میں کتاب کی دوسری جلد میں مختصراً ہی سہی پیروڈی نگاروں کا تعارف دے دیا جائے نیز جامعات کے نصابات کو سامنے رکھ کر اس انتخاب کو مزید بہتر کیا جائے۔

—عمیر منظر

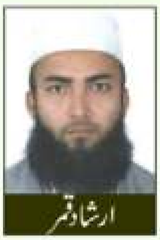

ارشاد قمر

فکر و تحقیق کا توضیحی اشاریہ

ششماہی 'فکر و تحقیق' ایک ایسا رسالہ ہے جو پوری تابانی کے ساتھ ادبی، تہذیبی اور علمی وقار کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اس کا مختصر پس منظر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے قیام، ترقی اردو بورڈ کے اختتام اور بیورو فار پروموشن آف اردو کے انضمام کے بعد شائع ہونا شروع ہوا۔

'فکر و تحقیق' کی اشاعت کا مقصد معاصر رسائل کے طرز پر ایک منفرد علمی اور تحقیقی رسالہ منظر عام پر لانا ہے جس کے ہر شمارے کو ارباب علم و ادب حرز جاں بنائیں۔ 1997 کا یہ شمارہ ساتواں شمارہ ہے اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے قیام کے بعد پہلا شمارہ ہے جس کا باضابطہ توضیحی اشاریہ اردو دنیا کے ہر شمارے میں شائع ہوگا تاکہ تشنگان ادب اس سے بہرہ ور ہوں۔ اس شمارے میں شامل ان تمام مضامین کا توضیحی اشاریہ ملاحظہ ہو:

(1) درمدح ٹیپو سلطان (سعادت یار خاں رنگین): پروفیسر محمد حسن، جنوری تا جون 1997، ص 7 تا 15

انگریزوں کو دندان شکن جواب دینے والے پہلے مجاہد ٹیپو سلطان کی مدح میں رنگین نے قصیدہ لکھا تھا جسے پروفیسر محمد حسن نے اسے انگریزوں کے خلاف نبرد آزما حکمراں کی مدح میں لکھا جانے والا پہلا قصیدہ قرار دیا ہے۔ یہ قصیدہ ہفت زبانی ہے یعنی سات زبانوں میں ٹیپو سلطان کی مدح کی گئی۔ اس طرز کو سعادت یار خاں رنگین اور انشاء اللہ خاں انشاء نے اپنے قصیدوں میں بخوبی برتا ہے۔ بہرکیف اس قصیدے کو ایک اہم اور منفرد تخلیق کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو محض رنگین کی قدرت کلام ہی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ جنگ آزادی میں اس سے اردو شاعروں کی شرکت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

(2) حکیم محمد احسن اللہ خاں: پروفیسر محمد انصاراللہ، جنوری تا جون 1997، ص 16 تا 89

اس مضمون میں پروفیسر محمد انصار اللہ نے اس وقت کی متنازعہ فیہ شخصیت مگر اہم اور مرکزی کردار کے حامل حکیم احسن اللہ خاں کی ذاتی زندگی کے مختلف گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور ان تمام تنازعات اور اختلافات کو تحقیقی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ حکیم صاحب پر ایک مکمل سوانحی کوائف بھی ہے۔

(3) اردو شاعری کو فراق کی دین: ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: جنوری تا جون 1997، ص 90 تا 111

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا یہ مضمون 'اردو شاعری کو فراق کی دین' فراق کی گوناگوں شخصیت اور فن کا بھرپور عکس ہے پیش کرتی ہے جسے مقالہ نگار نے پوری ذمے داری کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے اور ان تمام تنازعات اور اختلافات کو تحقیقی پیرائے میں پیش کیا ہے۔

(4) دکنی اردو میں تہذیبی یک جہتی: ڈاکٹر سیدہ جعفر، جنوری تا جون 1997، ص 112 تا 124

ڈاکٹر سیدہ جعفر کا یہ مضمون اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ یہ صرف ایک مقالہ ہی نہیں ہے بلکہ اس پر بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے اور محترمہ سیدہ جعفر نے اس موضوع کے ساتھ بہتر انصاف بھی کیا ہے چونکہ دکنیات ان کا میدان رہا ہے اور اس پر ان کی ایک تصنیف کے علاوہ دیگر مضامین بھی ہیں۔

(5) جدوجہد آزادی اور خواتین: خان عبدالودود جنوری تا جون 1997، ص 125 تا 183

خان عبدالودود کا یہ مضمون آزادی میں خواتین کی جو کارکردگی رہی ہے اس پر پرمغز اور معلومات افزا ہے۔ خان صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جدوجہد آزادی کے متوالوں کے کارناموں کے مطالعہ اور ان سے اردو قارئین کو روشناس کرانے پر صرف کی جس کا بین ثبوت یہ مضمون ہے اور خواتین کے کردار کا ایک ایسا اجمالی جائزہ ہے جس سے معاصر خواتین اپنے اندر وہ خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش کریں تاکہ موجودہ دور میں ملک کی بہتر نمائندگی ہو سکے۔

(6) عروض و معروض: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی جنوری تا جون 1997، ص 184 تا 218

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کا یہ مقالہ اپنے موضوع کے لحاظ سے اپنے اندر معلومات کا انبوہ لیے ہوئے ہے۔ سیاسی انقلابات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی زبانوں میں الٹ پھیر ہوتا رہا ہے اور شعر و ادب کے سانچے بدلتے رہے۔ اس بدلتے ہوئے پس منظر پر محیط یہ مضمون ہے۔

(7) حیات امیر مینائی — کچھ نئے ماخذ: ڈاکٹر شعائراللہ خاں وجیہی، جنوری تا جون 1997، ص 219 تا 242

اس مضمون میں ڈاکٹر شعائراللہ وجیہی نے امیر مینائی کی زندگی کے کچھ نئے گوشے اجاگر کرنے کی سعی کی ہے اور ساتھ ہی کچھ نئے عناوین بھی لگائے ہیں جس سے امیر مینائی کی شخصیت نمایاں ہوکر اردو داں حلقوں میں متعارف ہوتی رہے۔

(8) جادہ ملا: رفعت سروش جنوری تا جون 1997، ص 243 تا 258

مرحوم آنند نرائن ملا کی تصنیف 'جادہ ملا' پر رفعت سروش نے ایک عمدہ اور سنجیدہ مضمون لکھا ہے اس میں ان کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ پرانے قلم کاروں کے ساتھ نئے لکھنے والوں سے بھی اردو دنیا واقف ہو سکے۔

(9) جوش و فراق کی رباعیات — تجزیاتی مطالعہ: ڈاکٹر محمد یعقوب عامر، جنوری تا جون 1997، ص 259 تا 264

ڈاکٹر محمد یعقوب عامر کا یہ مضمون فراق اور جوش کی رباعیات کے تقابلی مطالعے اور تجزیے پر مشتمل ہے اور اس مضمون میں دونوں حضرات کے کلام کے حسن و قبح کی عکاسی کی گئی ہے اور اس طرح کے مضامین کی ضرورت آج بھی محسوس کی جارہی ہے تاکہ معاصرین اور غیر معاصرین کے کلام کی افضلیت اور معنویت واضح ہو سکے۔

(10) موازنہ سرور سلطان اور شاهنامہ اردو: بشیر احمد جنوری تا جون 1997، ص 265 تا 275

بشیر احمد نے اپنے اس مضمون میں مرزا رجب علی بیگ سرور کو اپنی کتاب فسانۂ عجائب کی وجہ سے مشہور بتایا ہے لیکن ان کا ایک معروف کام سرور سلطان ہے اور شاہنامہ اردو کے بیچ موازنہ کرکے دونوں کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

(1) چمنستان شعرا: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، جولائی تا دسمبر 1997، ص 9 تا 37

ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کا یہ مضمون اردو شعرا کے اہم دستاویز 'چمنستان شعرا' کی ان خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے جن کی وجہ سے مذکورہ تذکرہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام کا متحمل بن گیا۔ ساتھ ہی علوی صاحب نے مصنف کی شخصیت اور ان کے کام پر بھی حتی المقدور روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

(2) سید غلام محمد مست کلکتوی: جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ، جولائی تا دسمبر 1997، ص 38 تا 63

یہ مضمون جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی تخلیق ہے۔ غالباً یہ ان کا آخری مقالہ ہے جو انھوں نے انتقال سے پہلے لکھا۔ مذکورہ مقالہ سید غلام محمد مست کلکتوی کی شخصیت اور فن پر ایک مبسوط مضمون ہے جس سے ان کی گوناگوں شخصیت ہمارے سامنے واضح ہوکر آجاتی ہے۔

(3) اردو کا پہلا ادبی رسالہ (مخزن الفوائد): جناب اکبر حیدری کشمیری، جولائی تا دسمبر 1997، ص 64 تا 82

یہ مقالہ جناب اکبر حیدری کشمیری کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ آزادی کے بعد اردو تحقیق کی جو صورت حال تھی اس کو بارآور کرنے میں اکبر حیدری نے اہم رول ادا کیا جس کا نمونہ یہ تحقیقی مضمون ہے۔

(4) ایک آدمی نامہ — تین زاویے: پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، جولائی تا دسمبر 1997، ص 83 تا 104

ظہیر احمد صدیقی کا یہ مضمون بڑا ہی فلسفیانہ ہے اور اس سے انھوں نے انسانی زندگی کے پست و بلند اور دیگر مسائل کو اس طرح بیان کیا ہے کہ زندگی کے تمام امتحانوں کے باوجود انسانی عظمت کا اظہار ہوجائے۔ شاعر نے باریک بینی سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے یہ نظم انسانی شخصیت پر ایک سنجیدہ محاکمہ کہی جاسکتی ہے۔

(5) موریشس میں اردو: جناب معین الدین، جولائی تا دسمبر 1997، ص 105 تا 114

جناب معین الدین صاحب نے اپنے اس مضمون میں موریشس میں اردو کی صورت حال اور اس کے فروغ کی کیا کوششیں ہورہی ہیں ان تمام باتوں کو پورے شرح و بسط کے ساتھ پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور موریشس میں اردو مزید کس طرح پروان چڑھے اور کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے اس پر بھی انھوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔

(6) اردو کا اثر تیلگو پر: پروفیسر اشرف رفیع، جولائی تا دسمبر، ص 115 تا 125

پروفیسر اشرف رفیع کا یہ مضمون ایک عمدہ مطالعہ ہے اور انھوں نے اپنے اس مقالے میں اردو کے اثرات تیلگو پر کس طرح ہوئے اور تیلگو نے اردو کے الفاظ کو کس طرح اپنا کر اپنے اندر سمونے کی کوشش کی، ان تمام باتوں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

(7) جدوجہد آزادی اور تحریک ولی اللٰہی: جناب رتن لال بنسل، جناب عابد حسین، جولائی تا دسمبر، ص 126 تا 235

یہ مضمون اس شمارے کا سب سے طویل مقالہ ہے۔ دراصل یہ مضامین کا مجموعہ ہے لیکن تمام مضامین ان شخصیات سے متعلق ہیں جو تحریک ولی اللٰہی سے متاثر رہے ہیں۔

(8) خاندیش میں مرثیہ نگاری: جناب اکبر رحمانی، جولائی تا دسمبر ص 236 تا 263

خاندیش میں مرثیہ نگاری دراصل یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جسے اکبر رحمانی نے بڑی عرق ریزی سے جمع کرکے مقالے کی شکل میں پیش کیا ہے۔

(9) حالی اور شبلی کے سیاسی میلانات اور تصور تعلیم: ڈاکٹر مظہر مہدی، جولائی تا دسمبر، ص 264 تا 318

ڈاکٹر مظہر مہدی نے تحریک سرسید کے دو روشن مینار شبلی اور حالی کے سیاسی میلانات و رجحانات اور تصور قوم پر ایک معلوماتی مضمون لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب مقالہ نے اسے بڑی محنت و مشقت سے پیش کیا ہے۔

(10) اردو میں رسائل کی اشاریہ سازی: ڈاکٹر جمیل اختر، جولائی تا دسمبر، ص 319 تا 339

ڈاکٹر جمیل اختر کا یہ مضمون اشاریہ سازی پر مشتمل ہے اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اشاریہ سازی کی جاتی ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اشاریہ سازی کی روایت قدیم ہے۔ اس کام کو بڑے بڑے محققین اور نقاد نے کیا ہے۔

(5) محشر خیال: اکبر حیدرکشمیری، جولائی تا دسمبر، ص 340 تا 342

آخر میں ایک خط شامل ہے جس میں چند اختلافات جیسے الفاظ، جملے اور تواریخ کا ذکر بہ حسن و خوبی کیا گیا ہے۔

■

Mr. Irshad Qamar
AB 452, First Floor, Amarpuri
Ram Nagar, Nabi Karim, Pahar Ganj
New Delhi - 110055

ہارڈ ویئر اور سوفٹ ویئر
(Hardware and Software)

کمپیوٹر پر ہم مختلف قسم کے کام کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی کام کمپیوٹر سے کرانے کے لیے ہمیں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(1) ہارڈ ویئر

(2) سوفٹ ویئر

کمپیوٹر کے پرزوں، مشینوں وغیرہ کو 'ہارڈ ویئر' کہا جاتا ہے۔ ہارڈ ویئر کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور ہاتھوں سے چھو بھی سکتے ہیں ٹرمنل، سی پی یو، پرنٹر، ہارڈ ڈسک، ٹیپ ڈرائیو، پین ڈرائیو وغیرہ کمپیوٹر کے ہارڈ ویئر ہیں۔

سوفٹ ویئر ان پروگراموں کو کہا جاتا ہے جن کو ہم ہارڈ ویئر پر چلاتے ہیں اور جن کے ذریعے ہمارے سارے کام کرائے جاتے ہیں۔ سوفٹ ویئر کے بغیر کمپیوٹر سے کوئی کام کرپانا ناممکن ہے۔ سوفٹ ویئر بھی عام طور پر دو قسم کے ہوتے ہیں:

(1) سسٹم سوفٹ ویئر (System Software)

(2) ایپلی کیشن سوفٹ ویئر (Application Software)

'سسٹم سوفٹ ویئر' ایسے پروگرام کو کہا جاتا ہے، جن کا کام سسٹم، یعنی کمپیوٹر کو چلانا اور اسے کام کرنے کے لائق بنائے رکھنا۔ سسٹم سوفٹ ویئر ہی ہارڈ ویئر میں جان ڈالتا ہے۔ اس کے بغیر کمپیوٹر ایک بے جان مشین بن کر رہ جائے گا۔ آپریٹنگ سسٹم (Operating System)، کمپائیلر (Compilers)، یوٹی لٹی پروگرام (Utilities) وغیرہ سسٹم سوفٹ ویئر کے اہم حصے ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ آگے پڑھیں گے۔

'ایپلی کیشن سوفٹ ویئر' ایسے پروگرام کو کہا جاتا ہے، جو ہمارے اصلی کاموں کو کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ ضرورت کے مطابق الگ الگ کاموں کے کرنے کے لیے الگ الگ سوفٹ ویئر ہوتے ہیں۔ تنخواہوں کا شمار، لین دین کا حساب، اشیاء کا اسٹاک رکھنے، فروخت سے ہوئی آمدنی کا حساب لگانے، خط، مضامین وغیرہ تیار کرنے، تصویریں بنانے جیسے کاموں کے لیے لکھے گئے پروگرام ہی ایپلی کیشن سوفٹ ویئر ہوتے ہیں۔ یہ پروگرام یا تو ہم خود تیار کرتے ہیں یا بازار سے لکھے ہوئے خرید لیتے ہیں، جو انھیں کاموں کے لیے ہوتے ہیں۔ بازار سے خریدے جانے والے پروگراموں کو عموماً پیکیج یا سوفٹ ویئر پیکیج کہا جاتا ہے، جیسے ایم ایس-آفس، کورل ڈرا، فاکس پرو، ٹیلی وغیرہ۔

پروگرامنگ زبانیں (Programming Languages)

کسی کام کے کرنے کے طریقے کو پروگرام (Program) کہا جاتا ہے۔ پروگرام میں ہم کسی کام کے کرنے کے طریقے کو صحیح ڈھنگ سے سلسلہ وار ہدایتوں کی شکل میں لکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو عدد 'الف' اور 'ب' کے درمیان کے عدد، یعنی درمیانہ (Mean) یا اوسط (Average) نکالنے کے لیے ہمیں نیچے لکھی ہوئی ہدایتیں دینی ہوں گی۔

(1) عدد 'الف' کو پڑھیے۔

(2) عدد 'ب' کو پڑھیے۔

(3) 'الف' اور 'ب' کو جوڑیے اور جواب کو 'ج' مانیے۔

(4) 'ج' میں 2 سے تقسیم کیجیے اور نتیجہ کو 'ڈ' مانیے۔

(5) 'ڈ' کو پرنٹ کیجیے۔

'الف' اور 'ب' کی مقدار چاہے کچھ بھی ہو، ان کا درمیانہ یا اوسط نکالنے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ اگر کوئی بھی شخص ان

ہدایات پر ٹھیک طرح سے سلسلہ وار اسی طرح عمل کرے گا، تو وہ 'الف' اور 'ب' کا اوسط 'ج' حاصل کرلے گا۔ یہ ہدایتیں آپس میں مل کر ایک پروگرام بناتی ہیں۔

یہ پروگرام عام بول چال کی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس کو ہم اشاروں کی شکل میں مختصراً درج ذیل طریقے سے بھی لکھ سکتے ہیں:

(1) پڑھیے (الف)
(2) پڑھیے (ب)
(3) ج = الف + ب
(4) د = ج/2
(5) پرنٹ کیجیے (د)

کمپیوٹر میں کوئی بھی کام کرانے کے لیے ہمیں اسی طرح پروگرام لکھنے پڑتے ہیں۔ آپ کو یہ بات پہلے ہی بتائی جا چکی ہے کہ کمپیوٹر ایک ایسی مشین ہے، جو اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ اس سے کوئی بھی کام پروگرام کے ذریعے ہی کرایا جاتا ہے۔ ہر پروگرام ایک ایسی زبان میں ہونا چاہیے، جسے کمپیوٹر سمجھ سکے۔

اس کے بعد کمپیوٹر کا کام بس اتنا ہوتا ہے کہ ہم نے جو پروگرام لکھا ہے، اسے پڑھ کر اپنی میموری میں رکھ لیتا ہے اور اس کی ایک ایک ہدایت پر سلسلہ وار عمل کرتا ہے۔ جیسے جیسے پروگرام کی ہدایتوں پر عمل ہوتا ہے، ویسے ویسے کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچتا رہتا ہے۔ آخری ہدایت پر عمل ہوتے ہی وہ کام ختم ہوجاتا ہے۔

کمپیوٹر کے لیے پروگرام جن زبانوں میں لکھے جاتے ہیں انھیں پروگرام زبانیں (Programming Languages) کہتے ہیں۔ یہ زبانیں انگریزی کے کچھ چنندہ الفاظ اور علامتوں سے بنی ہوتی ہیں۔ ہر پروگرامنگ زبان کی اپنی الگ گرامر (Syntax) ہوتی ہے۔ ہمارے پروگرام کی ہر ہدایت یا بیان (Statement) اُس زبان کی گرامر کے مطابق ٹھیک ٹھیک لکھا جانا چاہیے۔

پروگرام کی بہت سی زبانیں رائج ہیں۔ ایسی کچھ زبانیں جو سب سے زیادہ استعمال کی جاتی ہیں، ان کے نام ذیل میں دیے گئے ہیں:

(1) بیسک (BASIC)
(2) سی (C)
(3) سی پلس پلس (C++)
(4) جاوا (JAVA)
(5) ڈاٹ نیٹ (.NET)

ان زبانوں کو اعلیٰ سطحی زبان (High Level Language) بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر زبان کی اپنی خاصیت ہوتی ہے اور وہ ایک خاص قسم کے کاموں کے لیے زیادہ اچھی رہتی ہیں لیکن کچھ زبانیں ایسی ہیں، جن کا استعمال ہر قسم کے کاموں میں کیا جاتا ہے، جیسے بیسک اور سی۔ آج کل زبانوں کے لیے سی پلس پلس (C++) اور جاوا (JAVA) کا استعمال سب سے زیادہ کیا جارہا ہے۔

کمپائلر (Compilers)

آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ کمپیوٹر کے لیے پروگرام ایسی زبان میں ہونا چاہیے، جس کو کمپیوٹر سمجھ سکے۔ لیکن آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کمپیوٹر کا سارا کام بائنری سسٹم (Binary System) میں ہوتا ہے، جو 0 اور 1 سے بنا ہوتا ہے۔ بائنری سسٹم کی زبان کو کمپیوٹر کی مشینی زبان (Machine Language) کہا جاتا ہے۔ کمپیوٹر سے کوئی بھی کام کرانے کے لیے ہمارا پروگرام اس کی مشینی زبان میں ہی ہونا چاہیے، یعنی ہمارا پروگرام 0 اور 1 کے روپ میں ہونا چاہیے۔ مشینی زبان کو عام طور پر ذیلی سطح کی زبان (Low Level Language) بھی کہا جاتا ہے۔

لیکن 0 اور 1 کی زبان میں پروگرام لکھنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ اس میں غلطی ہونے پر اسے ڈھونڈنا اور اس میں اصلاح کرنا تو لگ بھگ ناممکن ہی ہے۔ اس لیے ہم اپنا پروگرام کسی اعلیٰ سطحی پروگرامنگ زبان میں لکھتے ہیں اور اس کا ترجمہ کمپیوٹر کی مشینی زبان میں کرا لیتے ہیں۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ترجمہ کا یہ کام ہمیں خود نہیں کرنا پڑتا، بلکہ کمپیوٹر کے ذریعے ہی کرا لیا جاتا ہے۔ اس کے لیے بھی ہمیں ایک پروگرام لکھنا پڑتا ہے۔ اس پروگرام کو کمپائلر (Compiler) کہا جاتا ہے۔

اعلیٰ سطحی زبان پروگرام ← کمپائلر ← مشینی زبان پروگرام

تصویر C-3.1: کمپائلر کا کام

کمپائلر ایک ایسا پروگرام ہے جو کسی اعلیٰ سطحی زبان میں لکھے گئے پروگرام کا ترجمہ کسی کمپیوٹر کی مشینی زبان میں کردیتا ہے تصویر C-3.1 میں اس کام کو دکھایا گیا ہے۔ کمپائلر کسی کمپیوٹر کے سسٹم سوفٹ ویئر کا حصہ ہوتا ہے۔ یہ کمپیوٹر کے ساتھ ہی خریدا جاتا ہے۔ ہر پروگرامنگ زبان کے لیے الگ الگ کمپائلر ہوتا ہے۔ کسی کمپیوٹر میں ایک سے زیادہ کمپائلر بھی ہوسکتے ہیں۔

کمپائلر کا کام دو حصوں میں ہوتا ہے۔ پہلے وہ ہمارے پروگرام کے ہر بیان یا ہدایت کی جانچ کرتا ہے کہ وہ اُس پروگرامنگ زبان کی گرامر کے مطابق صحیح ہے یا نہیں۔ اگر کوئی غلطی ہوتی ہے، تو وہ بتا دیتا ہے کہ کس بیان میں کیا غلطی ہے۔ اگر پروگرام میں کوئی بڑی غلطی پائی جاتی ہے، تو کمپائلر وہیں رک جاتا ہے۔ تب ہم پروگرام کی غلطیاں ٹھیک کرکے اسے پھر سے کمپائلر کو دیتے ہیں۔

اگر پروگرام میں گرامر کی کوئی غلطی نہیں ہوتی، تو کمپائلر کے کام کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں وہ ہمارے پروگرام کی ہر ہدایت کو کمپیوٹر کی مشینی زبان کی ہدایتوں میں بدل دیتا ہے۔ ہماری ایک ہدایت کے بدلے مشینی زبان کی کئی ہدایتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ اس طرح پورا پروگرام مشینی زبان میں تیار ہوجاتا ہے۔ کمپیوٹر مشینی زبان کے پروگرام کو سمجھ سکتا ہے اور اس کے مطابق کام بھی کرسکتا ہے۔

آپریٹنگ سسٹم (Operating System)

آپریٹنگ سسٹم کسی کمپیوٹر کے سسٹم سوفٹ ویئر کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔ یہ پروگرام حقیقت میں کمپیوٹر اور اور اس کا استعمال کرنے والے شخص کے درمیان کی ایک کڑی ہے۔ یہ کمپیوٹر استعمال کرنے والے شخص کے کاموں کو کمپیوٹر کے ذریعے نہایت آسانی سے کرا دیتا ہے اور اس کے زیادہ تر مسائل کو حل کرنے کی ذمے داری خود ہی سنبھال لیتا ہے۔ آپریٹنگ سسٹم کی مدد کے بغیر ہمارے لیے کمپیوٹر سے کوئی کام کرا سکنا ناممکن تو نہیں ہے، لیکن بہت ہی مشکل ضرور ہے۔ آپریٹنگ سسٹم کئی ایسے کاموں کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا ہے، جن کا کرنا ہمارے لیے بہت محنت کا کام ہوگا۔

آپریٹنگ سسٹم کے اہم کام درج ذیل ہیں:

(1) استعمال کرنے والے شخص یا صارف (User) کی ہدایات کو کمپیوٹر تک پہنچانا اور ان کے نتائج اور کمپیوٹر کے ذریعے دیے گئے پیغامات کو صارف تک پہنچانا۔
(2) صارف کے ذریعے بنائے گئے پروگرام کو شروع کرنا، اس پر عمل کرانا اور ختم کرنا۔
(3) ہارڈ ویئر کے سبھی حصوں (یعنی آلات) کو ضرورت پڑتے ہی پروگرام کے لیے دلوانا۔
(4) صارف کی فائلوں وغیرہ کا حساب رکھنا اور ان کی پوری حفاظت کرنا۔

ان سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپریٹنگ سسٹم کے کام کتنے اہم ہیں۔ اگر یہ کام صارف کو خود کرنے پڑیں، تو وہ بہت پریشان ہوجائے گا، کیونکہ اس کا سارا وقت تو انھیں کاموں میں لگ جائے گا اور وہ اپنا اصلی کام کبھی نہیں کرا سکے گا۔ درحقیقت، ہمارا سیدھا رابطہ کمپیوٹر کے بجائے آپریٹنگ سسٹم سے ہوتا ہے۔ ہم اپنا کام آپریٹنگ سسٹم کو دے کر مطمئن ہوجاتے ہیں۔

آپریٹنگ سسٹم کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ملٹی

پروگرامنگ (Mlti-Programing) آپریٹنگ سسٹم ایک ساتھ کئی پروگرام کو چلا سکتے ہیں۔ ٹائم شیئرنگ (Time Sharing) آپریٹنگ سسٹم ایک ساتھ کئی صارفین (یوزرس) کا کام کراسکتے ہیں۔ یہ آپریٹنگ سسٹم مین فریم یا منی کمپیوٹر پر پائے جاتے ہیں۔ پرسنل کمپیوٹر پر ایک بار میں ایک ہی آدمی کام کرسکتا ہے اور ایک وقت میں عموماً اس کا ایک ہی پروگرام چلتا ہے۔ اس لیے ان کے آپریٹنگ سسٹم چھوٹے اور آسان ہوتے ہیں لیکن ونڈوز (Windos) ایک ملٹی پروگرامنگ آپریٹنگ سسٹم ہے، اس لیے ونڈوز پر مبنی آپریٹنگ سسٹم پر ایک ساتھ کئی پروگرام چلائے جاسکتے ہیں۔

زیادہ تر چھوٹے کمپیوٹر میں جو آپریٹنگ سسٹم پایا جاتا تھا، اس کا نام ایم ایس۔ ڈاس (MS-DOS) تھا، لیکن اب ایسے کمپیوٹر تقریباً ختم ہو چکے ہیں، جن پر صرف ایم ایس-ڈاس سے کام ہوتا تھا۔ آج کل زیادہ تر چھوٹے کمپیوٹر ونڈوز پر مبنی آپریٹنگ سسٹم سے چلتے ہیں، جن کے نام ہیں: ونڈوز ایکس پی (Windows XP)، ونڈوز 7 (Windows7) یا پھر ونڈوز 8 (Windows8)۔ اس کتاب کے حصے 2 میں ان کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ آج کل پینٹیم (Pentium) نام سے جو پرسنل کمپیوٹر سب سے زیادہ رائج ہیں، ان میں بھی ونڈوز 7 (Windows7) یا اس کا جدید ترین ایڈیشن، ونڈوز 8 (Windows8) ہی پایا جاتا ہے۔

ونڈوز کے علاوہ لینکس (Linux) آپریٹنگ سسٹم بھی بہت سے پرنسل کمپیوٹر میں پایا جاتا ہے۔ اس میں بھی وہ سارے کام اتنی ہی اچھی طرح سے کیے جاسکتے ہیں، جتنی اچھی طرح ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں کیے جاتے ہیں۔ لینکس آپریٹنگ سسٹم عام طور پر مفت ہوتا ہے، لیکن ابھی اس کا رواج محدود ہے۔

سوفٹ ویئر پیکیج (Software Packages)

ہم کمپیوٹر سے جو کام کراتے ہیں، ان میں سے کئی ایسے ہوتے ہیں، جو ہمیں بدلے ہوئے ڈاٹا کے ساتھ بار بار کرانے پڑتے ہیں۔ اگر ان کے لیے پروگرام چھوٹا سا ہو، تو ہم خود لکھ سکتے ہیں۔ لیکن، اگر وہ کام لمبا ہو، تو اس کے لیے پروگرام بھی بہت بڑا ہوگا، جسے لکھنے میں ہمیں بہت محنت کرنی ہوگی۔ اس لیے ہم اسے پروگرام بازار سے لکھے ہوئے خرید لیتے ہیں۔ تب ان کا استعمال ہم اپنی خواہش کے مطابق، کبھی بھی اور کتنی بھی بار کرسکتے ہیں۔ ایسے پروگرام کو سوفٹ ویئر پیکیج کہا جاتا ہے۔ یہ پیکیج بہت کارآمد (Useful) ہوتے ہیں، کیونکہ ہمارے زیادہ

تر کام ان کے ذریعے ہی ہو جاتے ہیں۔ عام صارفین کو اپنے لیے الگ پروگرام لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے ہی کچھ پیکیج کے بارے میں آگے بتایا گیا ہے۔

ورڈ پروسیسنگ پیکیج (Word Processing Package) یا ورڈ پروسیسر (Word Processor): یہ ایسے پیکیج ہیں، جن سے ہم ایک اچھے ٹائپ رائٹر کی طرح اپنے خط، رپورٹ وغیرہ تیار کر سکتے ہیں۔ خطوں کو درست کر کے انھیں دوبارہ پرنٹ کرانا اور لائنوں کو اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر لے جانے کا کام بھی ان پیکیج پر ہوسکتا ہے۔ زیادہ تر ورڈ پروسیسر کے ذریعے حروف کو کئی شکلوں (Fonts) اور سائزوں (Sizes) میں بھی پرنٹ کرایا جاسکتا ہے اور کئی ورڈ پروسیسر ہجے (Spelling) کی غلطیاں بھی ٹھیک کر دیتے ہیں۔ ونڈوز پر مبنی پرسنل کمپیوٹر پر ورڈ پیڈ (Word Pad) بھی دستیاب ہوتا ہے، جو آپریٹنگ سسٹم کا ہی ایک حصہ ہے۔ اس کے بارے میں ہم کتاب کے حصہ 2 میں تفصیل سے بتائیں گے۔

ونڈوز XP یا ونڈوز 7 پر مبنی پینٹیم کمپیوٹر عموماً ایم ایس آفس (MS Office) نامی ایک اپلی کیشن پیکیج کا استعمال کیا جاتا ہے، جس میں ایم ایس-ورڈ (MS-Word) نامی ورڈ پروسیسنگ پروگرام بھی ہوتا ہے، جو بہت اثر دار ہے۔ ورڈ پروسینگ کے کاموں میں آج کل سب سے زیادہ استعمال ایم-ورڈ کا ہی ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کتاب کے حصہ 3 میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

لینکس آپریٹنگ سسٹم میں بھی کے-ورڈ (K-word)، اے بی-ورڈ (Abi Word)، اوپن رائٹر (Open Writer) اور اسٹار رائٹر (Star Writer) وغیرہ کئی ورڈ پروسیسنگ پیکیج دستیاب ہیں، جو سلسلے وار کے-آفس (K-Office)، جینوم آفس (Gnome Office)، اور اسٹار آفس (Star Office) نام کے وسیع پیکیج کے حصے ہیں۔

اسپیرڈشیٹ پیکیج (Spreadsheet Package): ایسے پیکیج میں ڈاٹا کو ٹیبل (جدول) کے روپ میں اسٹور کیا جاتا ہے اور ان پر حساب بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ضرورت پڑنے پر ڈاٹا کا تجزیہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ تر اسپریڈشیٹ پیکیج میں دیے گئے ڈاٹا کی بنیاد پر گراف، چارٹ وغیرہ بنانے کی بھی سہولت ہوتی ہے۔ آج کل ونڈوز پر مبنی پرسنل کمپیوٹر ایم ایس- آفس کے تحت ایم ایس- ایکسل (MS-Excel) نامی اسپریڈ شیٹ پیکیج سب سے زیادہ رائج ہے، جو لوٹس (Lotus) کا ہی اسپیشل ایڈیشن ہے۔ اس کے بارے میں آپ کتاب کے حصہ 4 میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

لینکس آپریٹنگ سسٹم میں بھی کے-اسپریڈ (K-Spread)، جی-نومیرک (G-Numeric)، اوپن کیلک (Open Calc) اور اسٹار کیلک (Star Calc) وغیرہ کئی اسپریڈشیٹ پیکیج دستیاب ہیں۔

پریزنٹیشن پیکیج (Presentation Package): یہ ایسے پیکیج ہوتے ہیں، جن کے ذریعے سیمناروں، کانفرنسوں، جلسوں وغیرہ میں کسی موضوع کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے پرزینٹیشن تیار کیے جاتے ہیں۔ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں چلنے والا ایسا ایک مشہور پیکیج پاور پوائنٹ (Power Point) ہے، جس کے بارے میں آپ کتاب کے حصہ 5 میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

لینکس آپریٹنگ سسٹم میں دستیاب ایسے چند پیکیج کے نام ہیں: کے پریزینٹر (K-Presenter)، امپریس (Impress) اور اسٹار امپریس (Star Impress)۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)،
سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

ہماری فلمیں اور عالمی ماحولیات

انیس امروہوی

تصویر کو متحرک کرنے کی کوشش دنیا کے کئی ممالک میں انیسویں صدی کے آخری عشرے میں تیزی سے کی جارہی تھی۔ آخرکار 1993 میں تجربہ کامیاب ہوا، اور پردے پر چلتی پھرتی تصویروں کو دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔ اُس زمانے میں ہندوستان میں بھی اس طرح کی کئی کتابیں شائع ہوئیں، جن میں تمام صفحات پر ایک جیسی تصویریں چھپی تھیں، مگر ہر تصویر پچھلی تصویر سے تھوڑی سی مختلف تھی۔ جب اس کتاب کے صفحات کو تیزی سے اُلٹا جاتا تو ایسا لگتا تھا جیسے اس کتاب میں چھپی ہوئی تصویر متحرک ہوا ٹھی ہے۔ بنیادی طور پر فلموں کو پردے پر پیش کرنے کا آئیڈیا اسی تجربے سے ملا تھا۔ 1885 میں مشہور سائنسداں مائی برج نے ایک ایسے پروجیکٹر کو بنانے میں کامیابی حاصل کی جس کی مدد سے فلم کو پردے پر حرکت کرتے ہوئے دکھایا جا سکا تھا۔

ہندوستان میں متحرک فلم کی نمائش 7 جولائی 1896 کو فرانس کے لومیئر برادران نے واٹسن ہوٹل میں کی تھی۔ اس مختصر فلم کا نام تھا 'دی میجک لائٹس'۔ اس کے ساتھ ہی فرانس اور جرمنی سے چھوٹی چھوٹی متحرک خاموش فلموں کی آمد کا سلسلہ ہندوستان میں شروع ہوگیا۔ اس طرح کی فلموں کو عوام نے اور تھیئٹر کے مالکوں نے بہت پسند کیا۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ کچھ دن پہلے پیش ہوا واقعہ وہ پردے پر ہو بہ ہو دیکھ رہے ہیں۔ یہ فلمیں اس طرح کی ہوتی تھیں جیسے ریل گاڑی کو آتے ہوئے دکھایا گیا یا سمندر کے کنارے لوگوں کو ٹہلتے ہوئے دکھایا گیا، یا پہلوانوں کو کشتی کرتے ہوئے دکھایا گیا۔

صوبہ مہاراشٹر کے ناسک ضلع کے رہنے والے دھنڈی راج گووند پھالکے کو فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا اور انھوں نے 1885 میں بمبئی کے جے جے اسکول آف آرٹس میں داخلہ بھی لیا تھا اور 1887 میں بڑودہ کے کلابھون میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد میں تعلیم مکمل ہونے پر دادا صاحب پھالکے کو اُسی کلابھون کے فوٹوگرافک اسٹوڈیو کی ذمے داری بھی سونپ دی گئی۔ اس کا پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے انھوں نے وہاں کے کتب خانے سے بھی فیض حاصل کیا۔

1910 میں جب دادا صاحب پھالکے کی عمر لگ بھگ چالیس برس کی تھی کہ وہ اپنے چند دوستوں کے ہمراہ ایک دن کرسمس شو دیکھنے گئے۔ وہاں اُس دن خصوصی طور پر امریکہ کی ایک فلم 'لائف آف کرائسٹ' دکھائی گئی۔ پھالکے کے لیے اس طرح کی متحرک فلم دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ وہ اس کرشمے سے اتنے

زیادہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اُسی وقت دل میں یہ ٹھان لیا کہ وہ بھی اسی طرز پر رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں اور کرداروں کو متحرک فلموں کے ذریعے پیش کریں گے۔ اس کے بعد ایک سال تک دادا صاحب پھالکے لگاتار مختلف سنیما گھروں کے چکر لگاتے رہے اور اس نئی ایجاد کی تکنیکی باریکیوں کا جائزہ لیتے رہے۔ انھوں نے پانچ ڈالر کی قیمت سے اپنا ایک ذاتی کیمرہ بھی خریدا، جس سے وہ مختلف مواقع کی تصویریں بھی اُتارتے رہے۔

اگلے ایک برس میں لگاتار بیس بیس گھنٹے کام کرتے ہوئے انھوں نے ایک ڈاکیومینٹری فلم 'مٹر کے بیج کا وکاس' یعنی ارتقاء کی تخلیق کی۔ اس کے لیے انھوں نے ایک گملے میں مٹر کا ایک بیج بو دیا اور ہر دن کے حساب سے اُس گملے کی ایک تصویر اُتارتے چلے گئے۔ بعد میں اُن سب تصویروں کو جوڑ کر انھوں نے یہ دستاویزی فلم تیار کی تھی۔ اس کے بعد وہ انگلینڈ چلے گئے اور وہاں فلمسازی کی مزید جانکاری حاصل کی۔ انگلینڈ سے واپس آ کر انھوں نے 'راجہ ہریش چندر' نام سے ہندوستان کی پہلی خاموش متحرک فیچر فلم بنانے کا کام شروع کیا۔ یہ فلم تیاری کے بعد 21 اپریل 1913 کو پہلی بار چند مخصوص لوگوں کو بمبئی کے اولمپیا تھیٹر میں دکھائی گئی اور 3 مئی 1913 کو بمبئی کے کارونیشن تھیٹر میں عام لوگوں کے لیے اس فلم کی نمائش ہوئی۔ لگ بھگ سوا گھنٹے کی اس خالص ہندوستانی فلم کو دیکھ کر لوگ حیران تھے۔ اس کے بعد انھوں نے 'بھسما سُر' نام سے دُوسری فلم بنائی اور کامیابی حاصل کی۔ دادا صاحب پھالکے کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے دوسرے لوگ بھی فلمیں بنانے لگے۔ حالانکہ ان فلموں کا موضوع زیادہ تر مذہبی اور دیومالائی قصے کہانیوں پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ تھیٹر کے ڈراموں پر بھی فلمیں بننے لگیں اور اس جادوئی ایجاد کو ترقی حاصل ہوتی چلی گئی۔

فلموں کے ارتقا کے بارے میں تفصیل سے اس تمہید کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ قارئین یہ جان لیں کہ کس قدر محنت، مشقت سے شروع ہو کر فلمسازی کا یہ کام ترقی کی منازل طے کرتا ہوا گزشتہ سو برس میں اس مقام کو پہنچا ہے کہ آج دنیا بھر میں ہمارا ملک ہندوستان ہالی ووڈ کے بعد سب سے زیادہ فلمیں بنانے والا دوسرا ملک بن گیا ہے۔ ایک دوسری بات یہ بھی بتانی تھی کہ ابتدا میں فلموں کے موضوعات مذہبی قسم کے دیومالائی قصے کہانیوں پر مبنی ہوا کرتے تھے، تب خود فلمسازوں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ آگے چل کر یہ میڈیا عوام میں اتنا زیادہ مقبول ہوگا اور طاقتور بھی ہو جائے گا کہ اس کے ذریعے ہر طرح کا پیغام

> سمندروں کی سطح بڑھ رہی ہے۔ پہاڑوں پر برف تیزی سے پگھلنے کی وجہ سے زمین کے درجۂ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایٹمی تجربے اور خلا میں بڑھتا ہوا کچرا بھی ہماری اس خوبصورت زمین کی ماحولیات کو خراب کرنے میں بڑی حد تک ذمے دار ہیں۔

لوگوں تک پہنچایا جا سکے گا۔ لہٰذا دھیرے دھیرے ہماری فلموں کے موضوعات بدلتے گئے۔

ان دنوں ہندوستان کی تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ لہٰذا تحریک آزادی بھی ہماری فلموں کا موضوع بنی اور دوسرے سماجی مسائل پر بھی فلمیں بننے لگیں جو عوام میں بے حد مقبول ہوتی چلی گئیں۔ بیسویں صدی کے آخری ربع میں جب لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ ہماری زمین کو ماحولیات کے خراب اثرات سے مختلف طرح سے خطرہ ہے تو کئی طرح سے اس موضوع کو بھی فلموں میں شامل کرنا شروع کر دیا گیا۔ دادا صاحب پھالکے کے ذریعے پہلی کوشش 'مٹر کے بیج کا ارتقا' بھی غیر دانستہ طور پر ماحولیات سے متعلق ہی تھا۔ درخت لگانے اور جنگلات کو کاٹے جانے کے خلاف بعد میں کئی فلموں کے ذریعے پیغام دیا گیا ہے۔

یوں تو ہماری اس خوبصورت زمین کو کئی طرح سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ قدرتی وسائل کی کمی ہوتی جا رہی ہے، زمین کا درجۂ حرارت بڑھتا جا رہا ہے، کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی مقدار بڑھ رہی ہے۔ جنگل لگاتار کم ہوتے جا رہے ہیں۔ آبادی لگاتار بڑھتی جا رہی ہے۔ پہاڑ کاٹے جا رہے ہیں۔ زراعت کے لیے زمین کم پڑتی جا رہی ہے۔ سمندروں کی سطح بڑھ رہی ہے۔ پہاڑوں پر برف تیزی سے پگھلنے کی وجہ سے زمین کے درجۂ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایٹمی تجربے اور خلا میں بڑھتا ہوا کچرا بھی ہماری اس خوبصورت زمین کی ماحولیات کو خراب کرنے میں بڑی حد تک ذمے دار ہیں۔

کئی لوگوں نے اس سلسلے میں فلموں کے ذریعے ماحولیات کے تحفظ کی بات اُٹھائی ہے۔ فلموں کے شروعاتی دور سے ہی اگر ہم دیکھیں تو 1933 میں بابوراؤ آپٹے کی فلم 'کالا پہاڑ' اور 1934 میں جے۔ پی۔ واڈیا کی فلم 'کالا گلاب' بنائی گئیں۔ 1935 میں تپن بوس نے فلم 'دھوپ چھاؤں' اور 1936 میں سہراب جی کیراوالا نے فلم 'زلزلہ' بنائی۔ ان فلموں میں کسی نہ کسی طرح ماحولیات کے بارے میں اشارے دیے گئے ہیں۔ اسی طرح موہن دیارام بھونانی نے 1938 میں فلم 'آندھی' بنائی اور 1941 میں نوتن، شمی کپور کو لے کر بی۔ مترا کی ہدایت میں فلم 'بسنت' بنائی گئی۔ اس فلم میں او پی نیر کی موسیقی اور قمر جلال آبادی کے لکھے نغمے تھے۔ 1942 میں ایشور لال، خورشید، وکشت اور نور جہاں کو لے کر فلم 'چاندنی' بنائی گئی، اور اُسی برس ویریندر ڈیسائی نے 'بمبئی سے ٹون' کے لیے فلم 'سویرا' بنائی جس میں شوبھنا سمرتھ، یعقوب وغیرہ تھے۔ 1946 میں ہدایتکار منی بھائی ویاس نے ممتاز شانتی، ترلوک کپور، پدما بنرجی اور وکرم کپور کو لے کر فلم 'دھرتی' بنائی۔ 1946 میں ہی چتر بھج دوشی نے مدھوبالا، موتی لال، خورشید کو لے کر فلم 'پھلواری' بنائی۔ 1947 میں خورشید اور بھگوان داس کی فلم 'مٹی' کی نمائش ہوئی۔ ان فلموں میں بھی ماحولیات کی خرابی سے ہونے والے نقصانات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ 1948 میں دلیپ کمار، کامنی کوشل کی فلم 'ندیا کے پار' اور 1949 میں پرکاش پکچر کی فلم 'ساون بھادوں' آئی جس کے ہدایتکار رویندر دوبے تھے۔ کشور ساہو، منور سلطانہ اور اوم پرکاش اہم ستارے تھے۔

1951 میں نرمل پکچرس کی فلم 'سبز باغ' عزیز کاشمیری کی ہدایت میں بنی، جس میں نمی اور شیکھر کے ساتھ اوم پرکاش اور سوریہ چودھری ستارے تھے۔ اسی طرح 1952 میں چیتن آنند کی 'آندھیاں' اور ورما فلم کی 'برسات'، او۔ پی۔ دتہ کی ہدایت میں اور آرٹ آف ایشیا کی فلم ''زلزلہ'' بنی جس میں کشور ساہو، گیتا بالی اور دیو آنند نے کام کیا تھا۔ 1954 میں سٹار لائٹ پکچرس کی 'طوفان' کے ستارے سجن، منور سلطانہ، پران اور اوم پرکاش تھے۔ 1955 میں 'چنگاری' اور'' 1956 میں ایم آر فلمز کی 'سیلاب'، 1957 میں بینا رائے، پریم ناتھ کی فلم 'سمندر' آئی جس کے ہدایت کار گرودت تھے۔ 1954 میں دارا سنگھ، ممتاز رندھاوا، کی فلم 'آندھی اور طوفان'، 1975 میں بی ایس تھاپا کی فلم 'ہمالیہ سے اونچا' آئی جس میں سنیل دت اور ملکہ سارا بھائی تھے۔

1980 میں ویدراہی نے ششی کپور، ریکھا اور ڈینی کو لے کر فلم 'کالی گھٹا' بنائی۔ یہ فلمیں ایسی تھیں جن میں فلم کا موضوع تو سوشل تھا ہی، مگر ساتھ میں تھوڑا بہت اشارہ

ماحولیات کی خرابی کی طرف بھی تھا اور اس سے زمین کو ہونے والے خطرات سے بھی آگاہ کیا گیا تھا۔

اب ہم یہاں کچھ خاص فلموں کا ذکر کرنا چاہیں گے جو ماحولیات کی خرابی کی طرف خصوصی توجہ دلاتی ہیں۔ ساؤتھ انڈیا کے ایک فلمساز ہدایتکار ایم۔ اے۔ چناّ دیور تھے جن کو جانوروں سے خاص دلچسپی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ زمین پر ماحولیات کا توازن برقرار رکھنے میں قدرتی حالات میں جانوروں کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ دیور نے 1971 میں راجیش کھنہ اور تنوجہ کو لے کر ایک فلم 'ہاتھی میرے ساتھی' بنائی جو نہایت عمدہ فلم تھی اور جانوروں کے تحفظ کے لیے بھر پور پیغام دیتی ہے۔ خاص طور پر ہاتھیوں کی حفاظت پر توجہ دلاتی ہے۔ اسی طرح دیور نے 1972 میں شمی کپور اور راکھی کو لے کر فلم 'جانور اور انسان' بنائی جو شیروں کی حفاظت کی حمایت میں ہے۔

1979 میں دھرمندر، ریکھا کی فلم 'کرتویہ' بھی ایک خاص فلم ہے جس میں دھرمندر نے ایک فاریسٹ آفیسر کا کردار ادا کیا ہے۔ اس فلم کے گیت کفیل آذر نے لکھے تھے جو بے حد مقبول ہوئے تھے۔ 1965 میں منوج کمار اور مالا سنہا کی فلم 'ہمالیہ کی گود میں' آئی تھی، جس میں منوج کمار نے ڈاکٹر کا کردار ادا کیا ہے۔ یہ فلم پہاڑوں کی انسانی زندگی میں ضرورت اور ان کی حفاظت کا پیغام دیتی ہے۔ اس فلم کے نغمے بھی بے حد مقبول ہوئے تھے۔ منوج کمار، مالا سنہا کی 1862 میں فلم 'ہریالی اور راستہ' آئی تھی۔ یہ فلم بھی انسانی زندگی، جنگل اور دیہاتی طرز زندگی کی حمایت کرتی ہے۔ 1971 میں نوین نشچل، نروپا رائے، ستیہ جیت پوری وغیرہ کے ساتھ فلم 'گنگا تیرا پانی امرت' آئی۔ وہ فلم انسانی زندگی میں قدرتی ندیوں کی اہمیت کی یاد دلاتی ہے۔ 1972 میں راجندر بھاٹیہ کی فلم 'جنگل میں منگل' بھی ماحولیات میں جنگلات کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔ کرن کمار، پران، اور رینا رائے اس فلم کے ستارے تھے۔

1969 میں دھرمندر، فیروز خان اور سائرہ بانو کی فلم 'آدمی اور انسان' آئی تھی جس میں ماحولیات کے لیے پہاڑوں کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ اسی طرح 1967 میں منوج کمار کی فلم 'اپکار' حالانکہ حب الوطنی کے موضوع پر مبنی فلم تھی، مگر اس میں کاشت کاری اور زمین سے متعلق انسانی زندگی کے رشتے کو بھی خوبصورتی سے دکھایا گیا تھا۔

اسی طرح 1953 میں بمل رائے کی فلم 'دو بیگھہ زمین' میں بلراج ساہنی اور نروپا رائے کے خاص کردار تھے۔ اس فلم میں کاشت کاری، زمین اور کسان کی زندگی کو بڑے قریب سے دکھایا گیا ہے۔

فلم 'نیا دور' 1957 میں بی آر چوپڑہ نے بنائی تھی۔ اس میں دلیپ کمار، وجنتی مالا، جیون اور اجیت کے کردار اہم تھے۔ اس فلم میں مشینوں کے ذریعے انسانی زندگی میں مداخلت ڈالنے اور ماحولیات کے توازن میں گڑبڑی پیدا ہونے کے اندیشے کی بات بتائی گئی ہے۔ بی آر چوپڑہ کی ہی ایک دوسری فلم 'ہمراز' میں بھی موضوع سے ہٹ کر فلم کے نغموں کے ذریعے قدرتی مناظر کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ قدرت کے مناظر، پہاڑ، ندیاں، پھول پودے، برف، کھیت کھلیان، باغات اور صاف ستھری ہوا کا انسانی زندگی میں بڑا اہم کردار ہے اور ان سب چیزوں سے ماحولیات کا توازن برقرار رہتا ہے۔ اس فلم کے نغمے بھی بے حد مقبول ہوئے تھے۔ منوج کمار کی فلم 'شور' میں آبادی کے بڑھتے شور سے ماحولیات کے توازن کے بگڑنے کے خطرے سے آگاہ کیا گیا تھا اور زندگی میں پانی کی اہمیت کو بتایا گیا تھا۔

1991 میں جگ موہن موندرا کی فلم 'وِش کنیا' میں سانپوں کی اہمیت اور ان کی حفاظت کا ماحولیات سے تعلق بتایا گیا تھا۔ مُن مُن سین اور کبیر بیدی فلم کے مرکزی ستارے تھے۔ 1957 میں محبوب خان کی فلم 'مدر انڈیا' بنی تھی۔ یہ ہندوستان کی اصل دیہاتی زندگی پر مبنی سب سے بڑی اور بہترین فلم ہے۔ اس فلم کے موضوع کے پس منظر سے بھی ہم ماحولیات کے تحفظ کا ایک بڑا پیغام محسوس کرتے ہیں۔

1965 میں دیو آنند کی فلم 'گائیڈ' میں کافی بڑا حصہ بنگال کے قحط سے متاثر تھا۔ زمین پانی کو ترس رہی ہے، لوگ پیاس بھوک سے مر رہے ہیں، جانور دم توڑ رہے ہیں، ایسے میں سب لوگ مذہب، عقائد اور تمام روایتیں توڑ کر پانی کے لیے دعائیں مانگتے ہیں اور بارش ہونے پر مل جل کر خوشیاں مناتے ہیں۔ اسی طرح 1969 میں جیتندر اور نندہ کی فلم 'دھرتی کہے پکار کے' میں بھی دیہاتی زندگی سے ماحولیات کے قریبی تعلق کی بات کو سمجھایا گیا تھا۔ 1990 میں امول پالیکر نے نانا پاٹیکر کو لے کر ایک فلم بنائی تھی 'تھوڑا سا رومانی ہو جائیں'۔ اس فلم میں بھی ایک شخص قحط کے دنوں میں بارش لانے کا خواب سب کی آنکھوں میں بسا دیتا ہے۔ 1978 میں تپن سنہا نے فلم 'سفید ہاتھی' بنائی تھی۔ اس فلم میں انسانی زندگی میں جانوروں کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ 2009 میں مہیش بھٹ کی فلم 'تم ملے' بھی بمبئی میں سیلاب آنے کے موضوع پر مبنی تھی۔ فلم 'دو بوند پانی' خواجہ احمد عباس نے بنائی تھی۔ اس فلم میں پانی کی اہمیت اور انسانی زندگی میں اس کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، جو کہ ماحولیات کے تحفظ کے لیے بھی انتہائی ضروری ہے۔

اسی طرح راج کپور کی فلم 'رام تیری گنگا میلی' اور دلیپ کمار کی فلم 'مدھومتی' میں بھی جنگلات اور ندیوں کی اہمیت کو بتایا گیا ہے۔ پریم چند کی کہانیوں پر مبنی فلم 'گودان' اور 'ہیرا موتی' بھی انسانی زندگی میں جانوروں کی اہمیت کو بتاتی ہیں۔ فلم ''من کی آنکھیں، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، جینے کی راہ'' اور 'ماں' جیسی فلمیں بھی کہیں نہ کہیں ماحولیات کے تحفظ کے بارے میں اشارے دیتی ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری دنیا کو بچائے رکھنے کے لیے اور انسانی زندگی کو بہتر بنائے رکھنے کے لیے ماحولیات کے تحفظ کی آج پہلے سے زیادہ ضرورت بڑھ گئی ہے۔ ایسے حالات میں ہماری فلموں نے اپنی ذمے داری کو محسوس کیا ہے اور وقت وقت پر لوگوں کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ ماحولیات کے توازن کو برقرار رکھنا کتنا ضروری ہے۔

■

Anees Amrohvi
F-5, First Floor, Jawahar Park (W)
Laxmi Nagar, Delhi - 110092
Email.: qissey@rediffmail.com

تبصرہ و تعارف

اردو صحافت کے دو سو سال (حصہ اوّل و دوم)

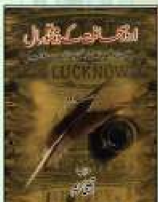

مرتب: ارتضیٰ کریم

کل صفحات: 974، قیمت (مکمل سیٹ): 435 روپے

سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: حقانی القاسمی، ڈی 64، فلیٹ نمبر 10، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

موجودہ دور میں ابلاغیات کو موضوعی مرکزیت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ پہلے سماجی نظام کی ترتیب و تشکیل میں ابلاغیات کا ایک اہم کردار ہوا کرتا تھا۔ اب اقتداری نظام کے استحکام میں اس کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ ماضی میں صحافت/ ابلاغیات کی زریں تاریخ رہی ہے۔ برطانوی استعماریت کے خلاف صحافت نے جو جدوجہد کی وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ عمل اور ردعمل کی صحافت کے بہت سے نقوش ہمارے ذہنی نقشے پر محفوظ ہیں۔ قومی اردو کونسل نے صحافت کے تاریخی تسلسل کو ذہن میں نقش کرنے اور صحافت کے وسیع تر کردار سے روشناس کرانے کے لیے مختلف شہروں میں جشن صحافت کا انعقاد کیا۔ اس کے علاوہ 'اردو صحافت کے دو سو سال' کے عنوان سے 5 تا 7 فروری 2016 عالمی سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں صحافت سے جڑے ہوئے دانشوروں نے پرمغز اور خیال افروز مقالے پیش کیے۔ یہ کتاب انھی مقالات کا مجموعہ ہے۔

دو جلدوں پر محیط اور گیارہ ابواب میں منقسم یہ اردو صحافت کی مکمل کتاب نہیں ہے مگر صحافت کی بیشتر جہتوں کے احاطے میں کامیاب ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جو تشنہ رہ گیا ہو۔ اس اعتبار سے اردو صحافت کے باب میں اس کتاب کی حیثیت دستاویزی ہوجاتی ہے۔ یہ ماضی میں صحافت پر کی گئی تحقیق کی صرف توسیع نہیں بلکہ اردو صحافت کو نئے موضوعات اور عنوانات سے بھی روشناس کرانے والی کتاب ہے کیونکہ اس میں جدید عہد کے بہت سے ایسے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے جن پر ماضی میں گفتگو ممکن نہیں تھی۔ پہلا باب 'اردو صحافت آغاز و ارتقا' ہے جس میں ڈاکٹر محمد نصیر الدین، شیخ منظور احمد، ملک محمد کامران یونس، عبدالسلام عاصم، تاشیانہ شامتالی، ڈاکٹر محی الدین زور کاشمیری کے مقالے شامل ہیں۔

ان تمام مضامین میں اردو صحافت کے آغاز و ارتقا اور انیسویں اور بیسویں صدی کے اخبارات اور رسائل کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور جنگ آزادی میں اردو صحافت کے مزاحمتی کردار و باغیانہ مزاج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے باب میں عالمی تناظر میں اردو صحافت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں نصر ملک، ڈاکٹر محمد غلام ربانی، ڈاکٹر علی عادل علی محمد کی تحریریں شامل ہیں۔ نصر ملک نے پاکستان میں اردو صحافت کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے وہاں کی صحافت کی بدلتی ترجیحات اور منفی رخ کو نشانہ بنایا ہے۔ ڈاکٹر محمد غلام ربانی نے بنگلہ دیش کی اردو صحافت کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ بنگلہ دیش سے انیسویں صدی تک اردو کا کوئی اخبار شائع نہیں ہوا تھا۔ ڈھاکہ سے پہلا شائع ہونے والا ماہنامہ 'المشرق' ہے، جس کے مدیر حکیم حبیب الرحمٰن تھے۔ انھی کا دوسرا اخبار 'جادو' تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ماہنامہ: اختر، سہ روزہ: مشرقی پاکستان، روزنامہ: پاسبان' ماہنامہ: خاور، ندیم، ستارہ اور موجودہ دور میں خیال، پیغام، ادب وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ بنگلہ دیش میں بھی اردو صحافت کا افق تابناک رہا ہے۔ علی عادل علی محمد نے ماریشس میں اردو صحافت کا جائزہ لیتے ہوئے اردو منظر نامے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق ماریشس سے نکلنے والا پہلا اردو مذہبی اخبار 'روشنی' تھا جس کے مدیر طیب ایوب تھے۔ دوسرا اخبار 'البدر' اور 'الہلال' تھا۔ ان کے علاوہ علی عادل محمد نے رسالہ 'ماہتاب'، 'صدائے اردو' کا ذکر کیا ہے۔

تیسرا باب خاصا بسیط ہے۔ اس میں علاقائی تناظر میں اردو صحافت کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ذیل میں جن علاقوں کی صحافت پر مربوط گفتگو کی گئی ہے ان میں مغربی بنگال، بہار، مہاراشٹر، تمل ناڈو، آندھرا، کشمیر، پنجاب، اترپردیش، کرناٹک، مدھیہ پردیش، ہریانہ، راجستھان جیسی ریاستیں شامل ہیں۔ ان تمام علاقوں میں اردو صحافت کا جو منظر نامہ رہا ہے ان سے یہ تمام مضامین انصاف کرتے نظر آتے ہیں۔

مغربی بنگال کے ذیل میں امان اللہ محمد، ابوذر ہاشمی، محمد وسیم الحق، کریم رضا مونگیری، ڈاکٹر امام اعظم، عاصم شہنواز شبلی کے مقالے شامل ہیں۔ امان اللہ محمد نے اپنے مضمون میں بنگال اردو صحافت کی جنم بھومی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔ جامِ جہاں نما، اردو کا پہلا اخبار ہے جو مرکزی کلکتہ کے کولوٹولہ سے شائع ہوا تھا۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس پہلے اردو اخبار کے مالک مسلمان نہیں بلکہ دو غیر مسلم بنگالی بھائی ہری ہردت اور منشی سداسکھ دیو تھے۔ ابوذر ہاشمی نے 1858 سے 1900 تک ارض بنگالہ کی اردو صحافت کا جائزہ لیا ہے۔ وسیم الحق نے 1900 سے 1947 تک کی صحافت کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال'، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے روزنامہ 'آزاد ہند' اور مولانا شائق احمد عثمانی کے 'عصر جدید' کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ کریم رضا مونگیری کا مضمون 1948 سے 2015 تک کی بنگال کی اردو صحافت پر مبنی ہے۔ ان کے مطابق ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے 1992 تک بنگال سے تقریباً 30 روزنامے شائع ہوتے

تھے۔ انھوں نے عصر جدید، انگارہ، الحق، امروز، اخوت، غازی، سنگم، باؤڑہ ٹائمز، شان ملت، اقرا کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ آزادی کے بعد سے 2015 کے درمیان شائع ہونے والے اہم اور مقبول اخبارات میں روزنامہ ہند، آزاد ہند، آبشار، عکاس، اخبارِ مشرق اور راشٹریہ سہارا کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے کولکاتا میں اردو صحافت کے عنوان سے بہت پرمغز مضمون تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے کلکتہ اور اس کے مضافات سے شائع ہونے والے تمام اردو روزناموں ہفت روزہ اخباروں، پندرہ روزہ جریدوں، کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس بات کو ثابت کرنے میں کامیاب رہے ہیں کہ اردو صحافت میں اہل بنگالہ کا رول بہت اہم رہا ہے۔ عاصم شہنواز شبلی نے 'تحریک آزادی میں صحافت اور بنگال' کے عنوان سے مضمون تحریر کرتے ہوئے گلشن نو بہار، اور دوربین جیسے دو اخبار کا ذکر کیا ہے جن کا آزادی کی جدوجہد میں بہت اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے 'الہلال'، اور 'البلاغ' اور دیگر اخبارات کے بارے میں بھی اپنے مضمون میں لکھا ہے۔

بہار کی اردو صحافت کے حوالے سے ڈاکٹر سید احمد قادری، صفدر امام قادری، اعجاز علی ارشد، ریحان غنی، حسن نواب حسن، شمیم قاسمی، ڈاکٹر مشتاق احمد کے مقالے شامل ہیں۔ ان تمام مضامین سے بہار کی اردو صحافت کا منظرنامہ سامنے آتا ہے۔ سید احمد قادری نے 1900 سے 1947 تک بہار کی اردو صحافت کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق 'نور الانوار' نے اردو صحافت کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے 1901 سے 1947 تک اردو کے جو اخبارات و رسائل شائع ہوئے ہیں ان تمام رسائل کا مبسوط ذکر کیا ہے۔ خاص طور پر اتحاد، صدائے عام، پٹنہ اخبار، پیغام وغیرہ کا۔ جن اخبارات نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی اور ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دیا۔ ان اخبارات کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے۔ صفدر امام قادری نے 'بہار میں اردو صحافت' کے عنوان سے اپنے مضمون میں یہ واضح کیا ہے کہ صوبہ بہار میں انگریزی اور ہندی صحافت سے قبل اردو صحافت کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ انھوں نے اس ضمن میں شہر آرا سے شائع ہونے والے اردو کے پہلے اخبار 'نور الانوار' کا ذکر کیا ہے جس کے ایڈیٹر سید خورشید احمد اور مالک سید احمد ہاشم بلگرامی تھے۔ انھوں نے پٹنہ ہرکارہ، ویکلی رپورٹ گیا، عظیم الاخبار، اخبار بہار، اخبار الاخیار مظفر پور، انڈین کرونیکل، رسالہ معاصر، اردو انڈین کرانیکل، الپنچ، دیہات، روشنی، صدائے عام، سنگم، قومی تنظیم، عظیم آباد ایکسپریس، پندار، انقلاب جدید، ایثار، جیسے اخبارات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ندیم، معیار، معاصر، صبح نو، اشارہ، آہنگ، اقدار، مریخ، زبان و ادب، علم و ادب، مباحثہ کا بھی تذکرہ کیا ہے جن کا بہار کی ادبی صحافت کے استحکام میں بہت اہم رول ہے۔ اعجاز علی ارشد نے بہار میں اردو صحافت کے خدوخال پر نظر ڈالتے ہوئے تبدیلی کے تناظر میں صدائے عام، ساتھی، سنگم، اشارہ، صبح نو، آہنگ، ہفت روزہ مورچہ، ندیم، سیکولر محاذ، کوہسار بھاگلپور، وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ روزناموں کے علاوہ انھوں نے ادبی رسائل کے حوالے سے صدف اور ابجد اردیا کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ریحان غنی کا مضمون 'بہار میں اردو صحافت کا آغاز و ارتقا' 1858 تا 1900 ہے۔ اس میں انھوں نے بہار کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے کچھ اہم اخبارات کے نام درج کیے ہیں جن میں خورشید عالم پٹنہ، نیر الفوائد، آرا، چشمہ علم پٹنہ، گلدستہ نظائر گیا، نادر الاخبار مونگیر، نسیم سارن چھپرہ، صبح وطن پورنیہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حسن نواب حسن نے بہار میں اردو صحافت کے نشیب و فراز پر روشنی ڈالتے ہوئے کچھ اہم اخبارات کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے گیا، مظفر پور، جمشید پور، رانچی، پھلواری شریف، دربھنگہ، سہسرام، پورنیہ، کشن گنج اور دیگر علاقوں سے نکلنے والے اخبارات کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی ہے کہ انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے وسط تک تقریباً 438 رسائل و اخبارات نکلتے رہے ہیں۔ شمیم قاسمی نے 'اردو صحافت اور بہار' کے عنوان سے اپنے مضمون میں سرزمین بہار میں 'دینی بہار' کو اردو کا پہلا اخبار قرار دیا ہے۔ انھوں نے ندیم گیا، ماہنامہ سہیل، اشارہ، تہذیب، صنم، صبح نو، انتخاب، مریخ، مباحثہ، کسوٹی جدید، آمد، زبان و ادب، جیسے ادبی رسالوں کے علاوہ اتحاد، صدائے عام، راہ رو، عظیم آباد ایکسپریس، امروز ہند وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ مشتاق احمد نے 'دربھنگہ میں اردو صحافت' کا جائزہ لیتے ہوئے 'مسیحا' کو دربھنگہ کا پہلا اردو ہفت روزہ قرار دیا ہے جس کے مدیر حکیم ابوالحسنات ناصر دہلوی تھے۔ اس کے علاوہ ندائے قوم، پروانہ، البدر، بشریٰ، آفتاب، سلفیہ، ہالہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ان اخبارات کے علاوہ ادبی رسائل میں جہانِ اردو، تمثیل نو اور دربھنگہ ٹائمز کا ذکر بھی شامل ہے۔

مہاراشٹر کی اردو صحافت کے حوالے سے جاوید جمال الدین، احمد عثمانی، نذیر فتح پوری نے لکھا ہے۔ جاوید جمال الدین نے میمونہ دلوی کے حوالے سے 'کشف الاخبار' کو ممبئی کا سب سے قدیم اخبار قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ ارمغان، خادم ہند، سرپنچ، ابوالظرفا، سراج خلوت اور خیر خواہ اسلام کو قدیم اخبارات میں شامل کیا ہے۔ انھوں نے مہاراشٹر کے اخبارات آفتاب، جمہوریت، اقبال، ہندوستان، اجمل، ہلال، الہلال اور انقلاب کے حوالے سے لکھا ہے۔ انھوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اردو کا پہلا خالص ادبی رسالہ مہاراشٹر کے شہر اورنگ آباد سے شائع ہوا جس کے مدیر مولوی عبدالحق تھے۔ انھوں نے اورنگ آباد کی صحافت کا بھی جائزہ لیتے ہوئے اثر فاروقی مرحوم کے 'قومی محاذ' کو پہلا ہفت روزہ اخبار ہے۔ ان کے علاوہ ہفت روزہ اورنگ آباد ٹائمز، روزنامہ آج اور دیگر اخبارات کا بھی ذکر کیا ہے۔ احمد عثمانی نے مہاراشٹر کے اردو اخبارات کا جائزہ لیتے ہوئے ممبئی، مالیگاؤں اور اورنگ آباد کو اردو صحافت کے بڑے مراکز میں شمار کیا ہے۔ انھوں نے کامٹی سے ہفتہ وار اخوت، رقیب اور تاج، مالیگاؤں سے خیالات نامی رسالے کا ذکر کیا ہے۔ نذیر فتح پوری نے مہاراشٹر میں اردو صحافت اور اشتہارات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے آمین سکندر کو کالی داس گپتا رضا کے حوالے سے مہاراشٹر کا پہلا اردو اخبار قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہاں کے اخبارات کے تجارتی اشتہارات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اشتہارات کے معاملے میں یہاں کے اخبارات کامیاب ہیں۔

تمل ناڈو میں اردو صحافت کے تعلق سے ڈاکٹر سید سجاد حسین کا مضمون بھی شامل ہے جس میں انھوں نے شہر مدراس سے شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اعظم الاخبار، شمس الاخبار، نیر اعظم، عمدۃ الاخبار اور تمل ناڈو کے مختلف علاقوں سے نکلنے والے مختلف اخبارات اور رسائل کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ صرف روزنامہ 'مسلمان' وہ واحد اخبار ہے جو پورے تمل ناڈو میں اردو صحافت کی نمائندگی کر رہا ہے۔ رؤف خیر نے 'آندھرا و تلنگانہ میں اردو صحافت' کا جائزہ لیا ہے اور وہاں سے نکلنے والے تمام اہم اخبارات خاص طور پر رہنمائے دکن، سیاست کا ذکر کیا ہے۔ کچھ ہفت روزہ اور پندرہ روزہ اخبارات بھی ان کے تذکرے میں شامل ہیں۔ انھوں نے سب رس، صبا، ماہنامہ پیکر، قلم کار، شگوفہ، فنکار نو، قومی زبان، خوشبو کا سفر، شعر و حکمت، الانصار اور دیگر رسائل کا بھی ذکر کیا ہے۔

کشمیر کی صحافت کے ضمن میں غلام نبی خیال، بلراج بخشی، الطاف حسین، ہارون رشی، کاچو اسفندیار خان کے مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ یہ تمام مضامین کشمیر کی صحافت کے مسائل اور امکانات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر

میں اردو صحافت بہت سی مشکلات کے باوجود بھی نہ صرف زندہ وتابندہ ہے بلکہ مضبوط اور توانا بھی ہے۔'

پنجاب میں اردو صحافت' پر نصر ملک کی تحریر بہت جامع ہے۔ اس میں انھوں نے متحدہ پنجاب کی اردو صحافت کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ خاص طور پر وہ اخبارات جن کا اردو کی صحافتی تاریخ میں ذکر ہوتا رہا ہے اور جس کے بغیر اردو صحافت کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ان میں پیسہ، زمیندار، کوہ نور، مولانا عبدالمجید سالک، اور مولانا غلام رسول مہر کی ادارت میں شائع ہونے والا روزنامہ انقلاب، روزنامہ پرتاپ، جے ہند، سہ روزہ 'وکیل' جیسے اخبارات شامل ہیں۔ انھوں نے اس بات پر افسوس بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ اخبارات جن کا کبھی پنجاب اور لاہور ہی نہیں پورے برصغیر میں طوطی بولتا تھا آج ان کا نام محض تاریخ کے اوراق میں ملتا ہے۔

اتر پردیش کی اردو صحافت کے عصری منظرنامے' کے حوالے سے شکیل احمد صبرحدی اور محمد وصی اللہ حسینی کی نگارشات شامل ہیں۔ شکیل احمد صبرحدی نے بیشتر ان اخبارات کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق اتر پردیش کی سرزمین سے ہے۔ انھوں نے قومی آواز، آگ، عزائم، انقلاب، جیسے اخبارات کے حوالے سے لکھا ہے اور عصری منظرنامے پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ جس سرزمین نے بڑے بڑے صحافی پیدا کیے آج وہ سرزمین قحط الرجال کا شکار ہے۔ محمد وصی اللہ حسینی نے مرزاپور سے شائع ہونے والے 'خیر خواہ ہند' کو اتر پردیش کا اردو کا سب سے پہلا اخبار قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق اتر پردیش کا دوسرا اخبار اودھ اخبار تھا۔ آگرہ اخبار، مخزن الخواتین اور دیگر اخباروں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے صحافت کے باب میں بھی لکھنؤ کو دبستانی حیثیت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ شہر صحافت میں بھی امتیاز کا حامل ہے کہ اسی شہر سے اودھ اخبار، اودھ پنچ، سچ، صدق جدید، مسلم گزٹ اور ہمدم جیسے اخبارات شائع ہوئے۔ انھوں نے لکھنؤ سے شائع ہونے والے دلگداز، خیر خواہ اطفال، خدنگ نظر، الندوہ، اور الناظر ہفت روزہ ہندوستان، روزنامہ قومی آواز، نیا دور، ماہنامہ کتاب، روزنامہ قائد ہفت روزہ عزائم اور کارپوریٹ گھرانے سے نکلنے والے اخبار روزنامہ سہارا کے علاوہ انھوں نے روزنامہ آگ، انقلاب، اودھ نامہ وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ ایک اہم مضمون ہے کہ اتر پردیش کے مختلف علاقوں سے نکلنے والے تمام اہم رسائل واخبارات کا ذکر اس میں شامل ہوگیا ہے۔ مدینہ بجنور کا بھی انھوں نے تفصیلی ذکر کیا ہے اور شب خون الہ آباد اور رامپور سے نکلنے والے اہم اخبارات ورسائل کا بھی۔

'کرناٹک میں اردو صحافت کا جائزہ' ڈاکٹر انیس صدیقی نے پیش کیا ہے۔ انھوں نے وہاں کے اولین اخبار 'قاسم الاخبار' پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ان کے علاوہ ہفت روزہ نشیمن، سالار، ایقان اور دیگر رسائل کا جائزہ لیا ہے اور اس طرح کرناٹک کا پورا صحافتی منظرنامہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

مدھیہ پردیش میں اردو صحافت کے حوالے سے عارف عزیز نے بہت معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے۔ انھوں نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں اردو صحافت کا جائزہ لیتے ہوئے قدیم اخبارات ورسائل میں رتن پرکاش، محتشم جاورہ، انتخاب اور افتخار کا ذکر کیا ہے اور آزادی کے بعد بھوپال سے شائع ہونے والے روزنامہ افکار، آفتاب جدید، بھوپال ٹائمز، روزنامہ ایکشن، سہ ماہی احتساب اور دیگر اخبارات و رسائل کا ذکر کیا ہے۔ ہریانہ میں اردو صحافت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر محمد مستمر نے ان علاقوں کا ذکر کیا ہے جہاں سے پہلے اردو اخبارات شائع ہوتے تھے۔ مگر اب وہاں اردو صحافت کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ انبالہ، پانی پت، حصار، سرسہ، سونی پت، فرید آباد، کروکشیتر، گوڑگاؤں سے شائع ہونے والے اخبارات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر زیبا زینت نے راجستھان کی اردو صحافت کا عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے مضمون کے مطابق راجستھان کا پہلا اردو اخبار 'مظہر السرور' تھا۔ انھوں نے جے پور، ٹونک، بھرت پور، الور وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے جہاں سے کبھی اردو اخبارات شائع ہوا کرتے تھے۔

تیسرے باب میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردو صحافت کی صورتِ حال کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے مگر اس باب میں کچھ اہم ریاستیں چھوٹ گئی ہیں جن میں گجرات، چھتیس گڑھ، ہماچل پردیش، جھارکھنڈ وغیرہ شامل ہیں۔ ان ریاستوں کے بھی صحافتی منظرنامے پر گفتگو ہوتی تو کتاب کی افادیت اور بڑھ جاتی۔

کتاب کے چوتھے باب میں 'اردو صحافت کے عصری منظرنامے' کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ ضامن جعفری، احمد اشفاق، مختار احمد فردین نے دورِ حاضر کی اردو صحافت کا جائزہ پیش کیا ہے۔ تینوں مضامین موجودہ عہد میں اردو صحافت کی سمت اور رفتار کی تفہیم میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔

پانچویں باب میں اردو کے اہم اخبارات اور رسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے تحت جامِ جہاں نما، اردو اخبار غدر، الہلال، نور افشاں، ادب لطیف، شاعر، مدینہ اور روزنامہ 'ہمدرد' کے حوالے سے پروفیسر یوسف تقی، جاوید دانش، ایلین ڈیسرولرس، ندیم احمد، سہیل عباس، احمد سہیل، فرزانہ خلیل، محمد قمر تبریز کے نہایت وقیع مقالے شامل ہیں۔ یوسف تقی نے جام جہاں نما کے امتیازات اور خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے تو وہیں جاوید دانش نے شمالی امریکہ کے پہلے اردو اخبار 'غدر' کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے غدر اخبار کی آئیڈیالوجی اور اس کے مشمولات کے حوالے سے بہت ہی اہم گفتگو کی ہے۔ غدر کے حوالے سے شاید یہ پہلا مبسوط مضمون ہے جو اردو میں شائع ہوا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس مضمون کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ ایلین ڈیسرولرس نے ابوالکلام آزاد کے شہرہ آفاق ہفت روزہ الہلال پر بہت ہی مربوط گفتگو کی ہے۔ ندیم احمد نے الہلال اور البلاغ کی روشنی میں مولانا آزاد کی جادوئی نثر کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل عباس نے عیسائیت کی تبلیغ کرنے والے اخبار 'نور افشاں' پر بہت ہی عمدہ اور تحقیقی مضمون تحریر کیا ہے اور اس کے موضوعات اور امتیازات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ احمد سہیل نے ادب لطیف لاہور اور شاعر ممبئی جیسے دو تاریخ ساز ادبی جرائد پر گفتگو کی ہے اور ان دونوں ادبی رسائل کے امتیازات واضح کیے ہیں۔ فرزانہ خلیل نے بجنور سے شائع ہونے والے مدینہ اخبار اور تحریک آزادی کے حوالے سے لکھا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس اخبار نے اردو صحافت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ اخبار بہت ہی مقبول اور اہم اخبار تھا جس پر حکومت کی نظر تھی۔ یہ عوام وخواص میں نہایت ہی مقبول اخبار تھا۔ قمر تبریز نے محمد علی جوہر کے مشہور اخبار روزنامہ 'ہمدرد' کا نہایت معروضی اور منطقی جائزہ لیا ہے اور اس کے امتیازات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس باب میں کچھ اہم اخبارات کی شمولیت ناگزیر تھی جن میں قومی آواز جیسا اخبار بھی شامل ہے جس نے اردو صحافت کو نیا طرز اور نیا اسلوب دیا اور اس اخبار نے واقعتاً اردو صحافت کو ایک وقار اور معیار عطا کیا۔ 'قومی آواز' کے ذکر کے بغیر معاصر اردو صحافت کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی کہ اس کے صحافتی امتیازات سے عوام وخواص دونوں ہی واقف ہیں۔

کتاب کے حصہ دوم کا آغاز خواتین اطفال اور اردو صحافت کے عنوان سے ہوا ہے۔ اس میں ناصر مرزا، جمیل اختر، قمر جہاں، مہرین قادر حسین اور خیال انصاری کی تحریریں شامل ہیں۔ ناصر مرزا نے روزنامہ آفتاب کشمیر کے حوالے سے مضمون تحریر کیا ہے جس کے بانی مدیر خواجہ ثناء اللہ بٹ تھے۔ جنھیں کشمیر میں بابائے صحافت کہا جاتا تھا۔ اس

مضمون میں آفتاب کے امتیازات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب میں اس مضمون کی شمولیت کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ روزنامہ آفتاب کا خواتین کا یا اطفال سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ شاید سہواً یہ مضمون اس باب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ جمیل اختر نے 'اردو صحافت اور صحافت نسواں' کے حوالے سے بہت ہی معلوماتی گفتگو کی ہے اور صحافت نسواں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے رفیق نسواں، اخبار النساء، شریف بی بی، تہذیب نسواں، معلم نسواں، پردۂ عصمت، شمس النہار اور رسالہ خاتون کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے خواتین کے مجلات پر تفصیلی روشنی بھی ڈالی ہے اور ان کے مشمولات و محتویات کے حوالے سے پر مغز گفتگو بھی کی ہے۔ جرائد نسواں کے حوالے سے یہ نہایت اہم اور وقیع مضمون ہے۔ قمر جہاں نے بھی 'اردو صحافت میں خواتین کا حصہ' کے عنوان سے ان بیشتر خواتین کا ذکر کیا ہے جن کی کسی نہ کسی طور پر پرنٹ میڈیا یا الیکٹرانک میڈیا سے وابستگی رہی ہے۔ انھوں نے دور جدید کی کچھ خواتین صحافیوں کے نام بھی لکھے ہیں۔ مہرین قادر حسین نے 'ادبی رسائل اور خواتین' کے حوالے سے خواتین مدیران کا ذکر کیا ہے جن میں صغریٰ ہمایوں مرزا کا رسالہ النساء، صالحہ الطاف کا خاتون دکن، احمدی بیگم کا قلم کار، ہاجرہ بیگم کا روشنی قابل ذکر ہیں۔ خیال انصاری نے 'خواتین اور اطفال کی صحافت' کے حوالے سے خاتون مشرق، بانو، پاکیزہ آنچل، مشرقی آنچل، زریں شعاعیں وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور خواتین اور اطفال کے لیے اخبارات میں شائع ہونے والے کالم اور کالم نگاروں کا بھی ذکر کیا ہے۔

ساتویں باب میں 'سائنس قانون کی صحافت' کے حوالے سے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اس میں خواجہ عبدالمنتقم، رفیع الدین ناصر، انیس رفیع، ابرار رحمانی، قطب الدین شاہد، ریحان انصاری، شیخ الماس حسین کے مضامین ہیں۔ خواجہ عبدالمنتقم نے 'ملکی و عالمی تناظر میں قانونی صحافت کی پیچیدگیوں کے حوالے سے' بہت مربوط اور مفید گفتگو کی ہے۔ رفیع الدین ناصر نے 'سائنس اور صحافت' پر اپنے مضمون کو مرکوز رکھا ہے۔ انیس رفیع نے 'اردو صحافت اور الیکٹرانک میڈیا' کے تعلق سے بہت ہی اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔ ابرار رحمانی نے 'اردو کے سرکاری رسائل و جرائد' کے حوالے سے مضمون لکھا ہے جس میں حکومت ہند کے اداروں سے شائع ہونے والے رسائل اردو دنیا، بچوں کی دنیا، فکر و تحقیق، آجکل، یوجنا، روزگار سماچار، سینک سماچار کے بارے میں بہت اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ قطب الدین شاہد نے 'جدید ٹیکنالوجی' کے حوالے سے یہ واضح کیا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے اردو صحافت کا قد و قامت بلند ہوا ہے اور اس میں کشش اور ظاہری حسن بھی پیدا ہوا ہے۔ لیکن باطنی حسن کو نقصان بھی پہنچا ہے۔ ریحان انصاری نے نئی ٹیکنالوجی کے حوالے سے اردو صحافت اور عصری چیلنجز پر بہت عمدہ اور مفید مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے ان تمام چیلنجز کا جائزہ لیا ہے جو اردو صحافت کو درپیش ہیں۔ ویب سائنس اور الیکٹرانک چیلنجز پر بھی انھوں نے نظر ڈالی ہے۔ شیخ الماس حسین نے 'انفوٹین منیٹ اور اردو صحافت' کے حوالے سے مضمون تحریر کیا ہے۔ یہ مضمون ایک نیا زاویہ عطا کرتا ہے۔ انفوٹین منیٹ کی تمام تر شکلوں کا احاطہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اردو صحافت میں انفوٹین منیٹ کے لیے کوئی انفراسٹرکچر نہیں ہے۔

آٹھواں باب 'علمائے کرام اور اردو صحافت' سے مختص ہے۔ اس میں قدوس جاوید، سہیل انجم، ڈاکٹر رشید احمد کے نہایت وقیع مضامین شامل ہیں۔ قدوس جاوید نے 'اردو صحافت اور مذہبی اتحاد' کے حوالے سے بہت ہی فکر انگیز گفتگو کی ہے اور اردو صحافت کے امتیازات کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اردو صحافت کی بنیاد حب الوطنی، انقلاب اور مذہبی اتحاد پر ہے۔ سہیل انجم نے 'ماضی کی اردو صحافت میں علما کا حصہ' کے عنوان سے مضمون تحریر کیا ہے اور علماء کی صحافتی خدمات پر مبسوط روشنی ڈالی ہے۔ دیکھا جائے تو ماضی کی اردو صحافت کے فروغ میں علماء کرام کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ بیشتر اہم اخبارات کے مدیران اور مالکان اسی طبقہ علماء سے تعلق رکھتے ہیں۔ دہلی کا پہلا اردو اخبار بھی مولانا محمد باقر نے نکالا تھا۔ ان کے علاوہ مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، مولوی مجید حسن، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا نصراللہ خاں عزیز، مولانا عبدالوحید صدیقی اور مولانا عبدالباقی جیسے نام قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اس ضمن میں علامہ شبلی نعمانی، ثناء اللہ امرتسری، علامہ نیاز فتح پوری، علامہ تاجور نجیب آبادی، مولانا عبدالحلیم شرر، علامہ راشد الخیری، مولانا عبدالماجد دریابادی، ماہر القادری اور عامر عثمانی کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ اردو کا پہلا روزنامہ 'اردو گائیڈ' جو کلکتہ سے 1857 میں جاری ہوا اس کے مدیر بھی مولوی کبیر الدین احمد تھے۔ ڈاکٹر رشید احمد نے بھی اردو صحافت سے تعلق رکھنے والے برصغیر کے علمائے کرام کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے ان مشاہیر صحافیوں کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق طبقہ علما سے ہے۔

نواں باب ادبی صحافت سے متعلق ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور عزیز نبیل نے ادبی صحافت کے مسائل اور تدریجی ارتقا پر بہت ہی وقیع گفتگو کی ہے۔ ابوالکلام قاسمی نے ان اہم ادبی رسائل کا ذکر کیا ہے جن کا ادبی مباحث کو زندہ رکھنے میں اہم اور موثر کردار رہا ہے۔ عزیز نبیل نے اہم ادبی رسائل پر بہت مربوط گفتگو کی ہے۔ خاص طور پر اہم ادبی رسائل کے خصوصی شماروں پر انھوں نے خاص نظر ڈالی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی میں بہت سے رسائل نے بہت ہی اہم شمارے شائع کیے تھے۔ ان شماروں کی اہمیت و معنویت ہمیشہ قائم رہے گی۔ انھوں نے بیشتر ادبی رسائل کو اپنے اس مضمون میں سمیٹ لیا ہے۔

کاروانِ صحافت کے عنوان سے کتاب کے دسویں باب میں پروفیسر شاہد حسین، پروفیسر تحسین فراقی، ڈاکٹر منظر اعجاز، عبدالعزیز، ایاز رسول نازکی کی تحریریں ہیں۔ شاہد حسین نے ان تمام صحافیوں کا ذکر کیا ہے جو دار و رسن کی آزمائش سے گزرے اور جنوں کی حکایت خونچکاں لکھتے رہے۔ تحسین فراقی نے عبدالماجد دریابادی کی صحافتی زندگی کے حوالے سے نہایت معلوماتی اور وقیع مضمون تحریر کیا ہے۔ مولانا کے اخبار سچ اور صدق جدید کے مشمولات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے آخر میں یہ تحریر کیا ہے کہ آج کی اردو صحافت مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے بہار آفریں اور عبرت انگیز قلم سے محروم ہے۔ منظر اعجاز نے بہار کے چند گمنام صحافی کے حوالے سے اپنے مضمون میں ان صحافیوں کا ذکر کیا ہے جو گمنام ہیں۔ ایسے صحافیوں میں اخبار بہار کے ایڈیٹر لالہ بندا پرشاد متخلص بہ حسرتی، اخبار الاخیار کے منشی اجودھیا پرشاد منیری جیسے صحافیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ عبدالعزیز نے مولانا علی میاں ندوی اور ریسرچ کانفرنس کے حوالے سے اخبار نویسوں کے سامنے دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں مولانا کے خطاب کو مرکز بنایا ہے۔ ایاز رسول نازکی نے ایک ایسی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے جنھیں اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ وہ شخصیت مولانا عبدالسلام رفیقی کی ہے۔

گیارھواں باب 'اردو صحافت مسائل و امکانات' کے عنوان سے ہے۔ اس میں شافع قدوائی، شاہد لطیف، زین شمسی، شجاعت بخاری، نوشاد مومن، جوہر قدوسی، شہاب عنایت ملک، رضوان اللہ آروی، مشتاق احمد نوری، عظمت جمیل صدیقی، احمد جاوید، محمد شعیب عالم، سید فیروز اشرف، جہانگیر فاطمی، اشرف استھانوی، مصطفیٰ حسین،

شکیل رشید کے مضامین شامل ہیں۔ ان تمام مضامین میں اردو صحافت کے مختلف مسائل خاص طور پر اقتصادی مسائل، روزگار، معاشیات، اشتہارات، مالی مشکلات، زبان، معیار، ترجمہ ادارت، قارئین کی قوت خرید اور مالی بحران کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ عصر جدید میں صحافت کے مختلف مسائل کو سمجھنے میں یہ تمام مضامین معاون ہوسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ کتابیات صحافت کے عنوان سے حیدر علی کا مرتب کردہ ایک اشاریہ شامل ہے۔ یہ دراصل اس کتاب کا ماحصل ہے کہ اس میں اردو صحافت سے متعلق اہم کتابوں کے علاوہ رسائل میں صحافت پر چھپنے والے مضامین، کتابوں میں مشمولہ مضامین اور صحافت پر لکھے گئے جامعات کے تحقیقی مقالوں کا اندراج کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اردو صحافت پر تحقیق کرنے والے اساتذہ اور طلبا کے لیے سمت نما کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ جامع اشاریہ ہے جو اب تک کی صحافتی تاریخ میں تیار کیا گیا ہے۔

دو حصوں پر محیط 'اردو صحافت کے دو سو سال' بہت سے اعتبارات سے اہمیت اور امتیاز کی حامل ہے۔ یہ صحافت پر لکھی گئی دیگر کتابوں سے بے نیاز تو نہیں کرتی مگر جن لوگوں کی رسائی صحافت کی کتابوں تک ممکن نہیں ہے ان کے لیے یہ ایک نشانِ منزل کی حیثیت ضرور رکھتی ہے۔ کتاب کے مرتب پروفیسر ارتضیٰ کریم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو صحافت کی جملہ جہتوں کو سمیٹنے کی بہت عمدہ کوشش کی ہے۔

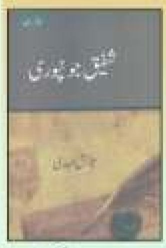

شفیق جونپوری

مصنف: ڈاکٹر تابش مہدی

صفحات: 120، قیمت: 75 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر جسیم الدین

سی 633، چوتھی منزل، گلی نمبر 9، ذاکر نگر، نئی دہلی

شفیق جونپوری کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے، جنھوں نے اردو شاعری کی آبرو بڑھائی ہے، وہ اپنے کلام کی خوبیوں کے لیے مشہور ہیں، جس نے بھی ان کا کلام ایک بار پڑھ لیا، اس کے دل میں آپ کے لیے جگہ پیدا ہوگئی۔ شفیق جونپوری غزل و نظم پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان کے تغزل میں جہاں گدگدی ہے، وہیں ان کی نظموں میں، جوش و جذبہ، اخلاق و مروت، ملت کا درد اور وطن کی محبت موجزن ہے۔ الفاظ کے برمحل استعمال اور مصرعوں کے دروبست کا توازن آپ کی شاعری کی خصوصیت ہے، خیال کو اس خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ لفظ و معنی کا باہمی ربط شیر و شکر ہوجاتا ہے۔ شفیق جونپوری کی شاعری میں غم محبت ضرور ہے، لیکن یاس و ناامیدی نہیں ہے، طلب اور مسلسل طلب و جستجو ان کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں۔ آپ کی شاعری جہاں سوئے ہوئے لوگوں کو جگاتی ہے، وہیں تھکے ہارے لوگوں کو نشاط و آسودگی بھی فراہم کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعری میں جس شخص کا قد و قامت اتنا بلند ہو، ان سے آنے والی نسلوں کو روشناس کرانا بھی ازحد ضروری ہے۔

اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں سرگرم قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اہم مقاصد میں شامل ہے کہ نابغۂ زمانہ ادبا، شعرا اور قدآور شخصیات کے مونوگراف تیار کرائے جائیں، تاکہ آنے والی نسل اپنے بزرگ شعرا و قابل قدر شخصیات سے آشنا رہے، مونوگراف چوں کہ اختصار کے ساتھ جامعیت بھی رکھتا ہے، اس لیے مصنف کے لیے یہ کسی چیلنج سے کم نہیں ہوتا، محدود صفحات میں اس طرح کوائف بیان کیے جائیں کہ شخصیت اور کارنامے دونوں سے بھرپور آگہی حاصل ہو مونوگراف کا مقصد ہوتا ہے۔ کونسل کے معزز ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم اس کام کے لیے قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے شفیق جونپوری کا مونوگراف تیار کرنے کے لیے ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جو کہ حسن انتخاب کا پرتو ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر تابش مہدی خود ہی قادرالکلام شاعر ہونے کے ساتھ عمدہ نثر نگار بھی ہیں، ان کی شاعری جہاں مقبول عام ہے، وہیں ان کی نثر نگاری بھی سحر انگیز ہے۔ آپ نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:

''شفیق جونپوری سے ہمیشہ عقیدت و محبت رہی، میں نے شفیق جونپوری سے بہت کچھ سیکھا ہے، آج بھی ان کی شاعری کا بڑا حصہ میرے حافظے کی زینت ہے۔ شفیق جونپوری ہماری اردو تاریخ کے ان عظیم لوگوں میں ہیں، جنھوں نے پرورش لوح و قلم بھی کی ہے اور نئی نسل کی ذہنی و فکری تربیت میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے، ایسے شعرا کے حالات زندگی اور افکار و خیالات سے نئی نسل کو متعارف کرانا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جیسے عظیم ادارے کا قومی و لسانی فریضہ ہے۔''

یہ خوش آئند بات ہے کہ کونسل اس ذمے داری کو بہ حسن و خوبی نبھا رہی ہے۔

ڈاکٹر تابش مہدی نے نہایت جامعیت کے ساتھ اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے شفیق جونپوری کی شخصیت اور شاعری جو کہ ایک بحرِ بے کراں ہے، اس کو کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مونوگراف میں مقدمہ کے بعد شفیق جونپوری کی شخصیت و سوانح، شفیق جونپوری کا نظریۂ شعر و ادب، آج کا شعری و تنقیدی رویہ اور شفیق جونپوری اور اخیر میں ان کے نمونۂ کلام کو پیش کیا ہے۔ یقیناً یہ مونوگراف قابل قدر کاوش ہے، جس کے لیے جہاں کونسل کے سرگرم و فعال ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم قابل مبارکباد ہیں، وہیں اس کے مصنف ڈاکٹر تابش مہدی بھی شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے جامعیت کے ساتھ شفیق جونپوری کی شخصیت اور ان کی شاعری سے آشنائی کے لیے قارئین کو گراں قدر ادبی سرمایہ نذر کیا ہے۔ توقع ہے کہ اس ادبی شہ پارے کی علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق وتنقید

جوگندرپال کی افسانہ نگاری

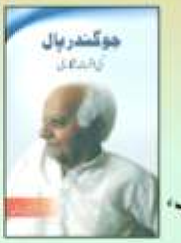

مصنف: ڈاکٹر ابوظہیر ربانی
صفحات: 164، قیمت: 200 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی
مبصر: راشد جمال فاروقی، سی 1452، آئی ڈی پی ایل ٹاؤن شپ، ویربھدر، رشی کیش، ضلع دہرہ دون 249202 (اترا کھنڈ)

جوگندر پال اردو فکشن کا ممتاز نام ہے۔ انھوں نے خوب لکھا اور اچھا لکھا۔ افسوس کہ ان کے فن پر خاطر خواہ بات نہیں ہوئی اور جو کچھ تھوڑی بہت ہوئی یا ہو رہی ہے وہ بھی اب ان کی وفات کے بعد۔ ہم مردہ پرست اردو والے اپنے فنکاروں کے مرنے کے منتظر رہتے ہیں۔

جوگندر پال کی زندگی شروع سے ہی مشکلات سے بھری رہی ہے۔ سیالکوٹ سے نقل مکانی کے بعد انھوں نے انبالہ میں اپنی سائیکل پر دودھ ڈھو ڈھو کر پسینہ بہایا۔ غریبی کا تجربہ بڑا تلخ تھا لیکن ایسے میں بھی ان کے والد اپنے بیٹے کو برفی کھلانا نہیں بھولتے تھے۔ نامساعد حالات میں بھی جوگندر پال کی تعلیم جاری رکھی گئی۔ اپنی مفلسی سے تنگ آکر جوگندر پال نے اپنے سرنیم سیٹھی سے دست برداری کو مناسب جانا اور زندگی بھر سیٹھی کہلوانا پسند نہیں کیا۔ جوگندر پال آغاز سے ہی بہت حساس تھے اگر کبھی ان کی ماں ان سے ناراض ہو جاتیں تو وہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر معافی مانگتے اور ماں انھیں معاف کر دیتی تھی۔

بی اے کے تیسرے سال میں کالج میگزین میں جوگندر پال کی پہلی کہانی 'تعبیر' شائع ہوئی۔ 1945 کی بات ہے جب وہ ایم۔ اے (انگریزی) کر رہے تھے تو مولانا شاہد دہلوی کے ماہنامہ 'ساقی' میں ان کی دوسری کہانی 'تیاگ سے پہلے' شائع ہوئی۔ 1948 میں کینیا کا ایک خاندان انھیں اپنے ساتھ لے گیا اور وہاں کرشنا سے ان کی شادی ہوگئی۔ کینیا میں جوگندر پال اسکول ٹیچر ہو گئے اور ان کی زندگی اب کچھ ڈھرے پر آگئی تھی۔ 1963 میں کینیا آزاد ہو گیا اور وہ پنشن لے کر ہندوستان لوٹ آئے۔ یہاں آکر اورنگ آباد (مہاراشٹر) کے ایک کالج میں پروفیسر اور بعد میں پرنسل بن گئے۔ لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اب تک ان کی 22 تصانیف آچکی ہیں۔ ہندی، پنجابی، مراٹھی، کنڑ، تیلگو، ملیالم، روسی اور عربی میں ان کی متعدد تصانیف کے تراجم ہو چکے ہیں۔ ان کے فن پر کئی ریسرچ اسکالر ایم فل اور پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ایک انتہائی اہم کتاب 'جوگندر پال: ذکر، فکر، فن' 1999 میں شائع کی۔ جوگندر پال کے فن اور شخصیت کو سمجھنے کی یہ اولین سنجیدہ کوشش تھی۔ ابوظہیر ربانی کی زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ جوگندر پال پر تمام معیاری اور معتبر رسائل نے خصوصی گوشے شائع کیے۔ مثلاً شاعر، توازن، اورنگ آباد ٹائمز، عصری آگہی، جدید ادب، انشا، ارتقا، پرواز ادب، معلم اردو، آجکل، چہار سو اور سبق اردو کے خصوصی گوشے جوگندر پال کی تفہیم کے ضمن میں وقیع ہیں۔ ان ہندوستانی رسائل کے علاوہ چند پاکستان اور جرمن رسائل نے بھی ان پر خصوصی مواد شائع کیے۔

جوگندر پال کو میر تقی میر ایوارڈ، غالب ایوارڈ، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، اقبال سمان، عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ اور متعدد ریاستی اکادمیوں کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے جوگندر پال کی کہانیوں کے پلاٹ، ان کے مختلف النوع کرداروں، زبان واسلوب اور قصہ گوئی کی تکنیک پر بہت تفصیل سے اور اقتباسات کی رو سے بات کی ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ جوگندر پال کے پیش نظر تمام ملکی مسائل اور زمینی حقائق تھے لہٰذا انھوں نے ان سے صرف نظر نہیں کیا۔ ساتھ ہی عالمی مسائل مثلاً بھوک، اخلاقی اقدار میں گراوٹ، ماحولیاتی کثافت، بدعنوانی اور دہشت گردی بھی ان کے موضوعات ہیں۔ جہاں تک جوگندر پال کی فکر کا تعلق ہے تو ڈاکٹر ابوظہیر ربانی انھیں عظیم مفکر اور دانش ور تسلیم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دردمندانہ فکر ان کے افسانوں کی روح ہے۔ جوگندر پال کے فن کے ضمن میں مصنف کا خیال ہے کہ ان کے افسانوں میں خیال واسلوب، موضوع وہیئت آپس میں یوں شیر وشکر ہو جاتے ہیں کہ انھیں علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اعلیٰ انسانی اقدار جوگندر پال کے فن کا سرچشمہ ہیں لہٰذا وہ قاری کو اپنے باطن کا شریک بنا کر چلتے ہیں۔

اس کتاب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ ہر بات مستند حوالوں کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے لیے مصنف کو خاصی مشقت کرنی پڑی ہوگی لیکن حوالوں کی فہرست تقریباً ہر باب کے اختتام پر موجود ہے۔ سرورق پر کھادی کا کرتا زیب تن کیے ہوئے جوگندر پال کی صاف وشفاف تصویر جلوہ گر ہے۔ ڈاکٹر ابوظہیر ربانی کی تنقیدی زبان منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ واضح بھی ہے۔ انھیں اپنی عالمانہ رائے کے اظہار کے لیے کسی پیچیدہ بیانی کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ جوگندر پال کی شخصیت کے ہر ہر پہلو سے واقفیت اور ان کی افسانہ نگاری کی تفہیم میں اس کتاب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہوگا۔ بلکہ مستقبل میں جوگندر پال پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی یہ کتاب مشعل راہ بنے گی۔ ظاہری گٹ اپ کے اعتبار سے بھی یہ کتاب آپ کی ذاتی لائبریری کی رونق کو دوبالا کرے گی۔

نقوش قلم

مصنف: انوارالحسن وسطوی
صفحات: 232، قیمت: 250 روپے،
ناشر: الہدا ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، حاجی پور (ویشالی)
مبصر: حمیرہ خاتون، 1033، جامع مسجد، دہلی

زیر مطالعہ کتاب 'نقوش قلم' انوارالحسن وسطوی کا ادبی اور نیم ادبی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں تاثراتی، تنقیدی، اور تبصراتی مضامین شامل ہیں۔ اس سے پہلے 'رشحات قلم' 2011 کے نام سے ان کا دوسرا تنقیدی مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ زیر مطالعہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں 15 مضامین اور دوسرا کتابوں اور مجلات کے تبصرے پر مبنی ہے پہلے حصے میں موجود بعض مضامین شعرا اور ادبا کی شخصیت پر مبنی ہیں جس میں حیات وخدمات کے حوالے سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ کتاب میں شامل پروفیسر عبدالقوی دسنوی سے متعلق مضمون ایک اہم تحریر ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر قمر اعظم ہاشمی، الحاج ہارون رشید، ڈاکٹر رضوان احمد، شکیل احمد خان ایڈووکیٹ، تمنا مظفر پوری، صحافی محمد مرغوب، ان لوگوں میں سے ہیں جو اس دنیا کو خیر آباد کہہ چکے ہیں۔ ان کی یادوں کو سمیٹتے ہوئے ان کی خدمات پر تحقیقی گفتگو کی ہے۔ قیصر صدیقی، پروفیسر ناز قادری، فاروق صدیقی، قوس صدیقی اور بدر محمدی، پر لکھے گئے مضامین بھی اہم اور قابل توجہ ہیں ان مضامین کا اختتام عموماً ان کی درازیٔ عمر اور سلامتی کی خواہش پر ہوا ہے ان مضامین میں مضمون نگار نے باتیں اپنے تعلقات کے حوالے سے بھی کی ہیں۔ ان سے ملاقات کا تاثر جو قاری کے ذہن ودل پر ہوا اس کو الفاظ کا جامہ پہنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں آخری مضامین 'بہار میں اردو تحریک' اور 'اردو کا سچ' اردو تحریک سے متعلق اہم مضامین ہیں۔ ان مضامین میں اردو کی زبوں حالی پر مضمون نگار کا

قلم خون کے آنسو روتا نظر آتا ہے۔ بہار میں اردو تحریک کی ابتدا،سرگرمیاں،اردو کی بقا و فروغ کے لیے کی گئی کوششیں،اردو مجاہدین کے ذریعے اردو کی بقا و تحفظ کی خاطر جھیلی گئیں مصیبتیں،قید و بند کی صعوبتیں،اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے کی کاوشوں کو مختصر مگر جامد طریقے سے بیان کیا گیا ہے چند الفاظ میں لکھا گیا مضمون بہار کی اردو تحریک کی تاریخ کو پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔'اردو کا سچ' میں مصنف نے اردو گھرانوں پر جو اردو سے دوری اختیار کی جارہی ہے اس پر چوٹ کی ہے۔اردو اخبارات ورسائل کم قیمت پر دستیاب ہونے کے باوجود اردو سے آشنا لوگ انھیں خریدنا گوارہ نہیں کرتے۔ جو ہماری نئی نسل کے لیے نقصاندہ ہے۔اور یقیناً اس سے فقط اردو کا ہی نہیں بلکہ ہمارا بھی نقصان ہوگا۔

کتاب کا دوسرا حصہ جو کہ شاعروں اور ادیبوں کے مجموعوں پر کیے گئے تبصرے ہیں بھی ہماری توجہ مرکوز کرتا ہے۔اس حصے میں مصنف نے کتابوں کو سامنے رکھ کر ان کی اہمیت وعظمت واضح کی ہے جس سے ادب وشاعری کی جو رفتار ہے اس تک ہماری رسائی ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی تصنیف 'اقبال شاعر اور دانشور:ایک تعارف'، ڈاکٹر منظر اعجاز کی فیض احمد فیض کے خطوط کا مجموعہ 'صلیبیں میرے دریچے میں'، ڈاکٹر سید آل ظفر کی 'نظیر کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر'، ڈاکٹر ابوالحیات کی 'کلیم عاجز کی نثر نگاری'، ڈاکٹر شفیع الزماں کی 'عبدالمغنی :اردو کی ایک عبقری شخصیت'، پروفیسر احمد حسن دانش کی ''مجلہ 'عکس سرسید' وغیرہ پر کیے گئے تبصرے قابل غور ہیں۔ مصنف نے کتاب میں موجود ہر باب کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کا اسلوب سادہ وعام فہم ہے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ پروف کی غلطیاں برائے نام ہیں۔مگر ایک کمی جو اس کتاب میں خاص طور پر کتاب کے پہلے حصے میں مصنف نے ہر شخصیت پر شعر اور کہیں کہیں مصرعہ نقل کیا ہے مگر شاعر کا نام نہیں دیا۔اگر نام ہوتا تو ہمارے علم میں اور زیادہ اضافہ ہوتا اس کے علاوہ کتاب کے دوسرے حصے جو تبصرے کا حصہ ہے اس میں کتابوں کی کمی اور غلطیوں پر مصنف نے کچھ نہیں لکھا ہے۔اس طرح کتاب کا دوسرا رخ ہمارے سامنے نہیں آپاتا۔علاوہ ازیں کتاب کی طباعت، ٹائٹل،کاغذ عمدہ ہے۔کتاب کی پشت پر پروفیسر ثوبان فاروقی نے اپنے تاثرات رقم کیے ہیں۔امید ہے کہ ادبی حلقے میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور یقیناً یہ ہمارے علم میں اضافے کا باعث ہوگی۔

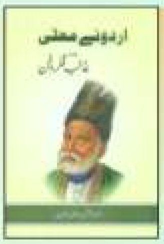

اردوئے معلی: غالب فکر و فن

مصنف: عبدالرحمٰن جمال الدین

صفحات: 231، قیمت: 280 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: حافظ عبدالکریم رضوان، دواخانہ حکیم سید ضیاء الرحمٰن اکبر نگر، دھرم شالہ روڈ، بانسی، سدھارتھ نگر (یوپی)

زیر تبصرہ کتاب 'اردوئے معلی: غالب فکر وفن' میں صاحب کتاب نے اپنے تنقیدی اور تحقیقی شعور کی روشنی میں غالب کے خطوط کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کی ابتدا ایک مختصر سے پیش لفظ سے کرتے ہوئے اس کتاب کو دو باب میں تقسیم کیا ہے۔ان دونوں ابواب میں مختلف عنوان سے 9 مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون 'اردوئے معلی ایک تعارف' ہے۔ دس صفحے کے اس مضمون میں مصنف نے 'اردوئے معلی' کی اشاعت سے متعلق غالب اور ان کے دوستوں کے انکار اور رضامندی کے تعلق سے ہوئی خط وکتابت کو موضوع بحث بناتے ہوئے 'اردوئے معلی' کی تاریخ اشاعت اور اس کی علمی و ادبی اہمیت سے متعارف کرایا ہے۔ دوسرا مضمون 'اردوئے معلی کی پہلی اشاعت' 6 مارچ 1869 سے لے کر 1969 تک متعدد اشاعتوں، ان میں شامل خطوط اور ان کے مرتبین کے ساتھ مطبع کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ جن میں مطبع اکمل المطابع دہلی، مطبع کریمی لاہور، مطبع رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور، مطبع مجتبائی دہلی، مطبع فاروقی دہلی، مطبع مجیدی کانپور، مطبع رام نرائن لال بینی مادھو، نیشنل پریس الہ آباد، مطبع عالم گیر اور مطبع مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع شدہ 'اردوئے معلی' میں اضافہ اور حذف کیے گئے خطوط اور ان مضامین کی فہرست مع حوالہ پیش کی گئی ہے۔

یہ مضمون تحقیقی لحاظ سے بہت اہم ہے کیونکہ اس کے مطالعے سے قارئین اردو ادب کو 'اردوئے معلی' کے حصہ اول اور دوم سے متعلق کئی اہم معلومات فراہم ہوگی۔

45 صفحات پر پھیلے مضمون 'اردوئے معلی' میں غالب کے اشعار، میں صاحب کتاب نے 'اردوئے معلی' کے خطوط میں شامل غالب کے اردو اور فارسی اشعار حصہ اول اور دوم کی ترتیب سے درج کیے ہیں۔ غالب کے اشعار پر مشتمل اس مضمون کو اگر مضمون نگار نے خطوط کے حوالے کے ساتھ پیش کیا ہوتا یعنی کون سے اشعار کس خط میں اور کس کو بھیجے گئے تو یہ فہرست تحقیقی لحاظ سے بہت اہم ہوجاتی۔ پہلے باب کا چوتھا اور آخری مضمون بھی اشعار کی فہرست پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں مصنف نے 'اردوئے معلی' کے خطوط میں درج دوسرے شعرا کے اردو اور فارسی اشعار کو درج کرکے اس حصے کو 'اردوئے معلی' میں دیگر شعرا کے اشعار کا عنوان دیا ہے۔ اس میں بھی مصنف نے سہل مزاجی سے کام لیا ہے اگر مکتوبات میں درج اشعار کو ان مکتوبات کے حوالوں کے ساتھ ہر شعر کے بعد شاعر کا نام بھی لکھ دیا ہوتا تو 12 صفحے کی اس فہرست کی مزید اہمیت بڑھ جاتی۔

کتاب کے دوسرے باب میں مصنف کے پانچ مضامین شامل ہیں۔ اس باب میں شامل سارے مضامین 'اردوئے معلی' کے خطوط کی روشنی میں غالب کے عہد اور ان کی تحریروں کو مختلف رخ سے دیکھنے کی کوشش ہے۔ دوسرے باب کا پہلا مضمون 'خطوط غالب اور زبان واسلوب' کے عنوان سے ہے۔ اس 15 صفحے کے مضمون میں غالب کے انداز و اسلوب پر بحث کرتے ہوئے مضمون نگار نے مکتوبات کے حوالوں اور ناقدین کی آرا کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی رائے بھی قائم کی ہے۔ غالب کے انداز واسلوب پر مصنف کی یہ رائے ملاحظہ کیجیے:

''حقیقت ہے غالب کے یہاں تصنع نہیں ہے بلکہ ان کی طبعی ظرافت اور شعری ہم آہنگی اور لگاؤ کی وجہ سے ان کے خطوط کی عبارتیں جا بہ جا مسجع ہیں۔ ان کی زبان دوسروں کی زبان سے بالکل الگ تھلگ ظرافت کا احساس دلاتی ہے۔''

دوسرے باب کے دوسرے مضمون جس کا عنوان 'غالب کے خطوط میں غالب کا تنقیدی شعور' ہے۔ 22 صفحات پر مشتمل اس مضمون میں صاحب مضمون نے 'اردوئے معلی' کے مختلف خطوط میں غالب کے تنقیدی شعور کا جائزہ لے کر غالب کو اسلوبیاتی نقاد کے زمرے میں شمار کرنے کی سعی کی ہے۔ ان خطوط میں خاص طور سے تفتہ، شیونرائن، حبیب اللہ خاں ذکا، میر مہدی مجروح، سعدالدین خاں شفق، قاضی عبدالجمیل، دادا خاں سیاح، اور مرزا حاتم علی مہر وغیرہ کے خطوط بہت اہم ہیں۔ غالب نے مذکورہ بالا اشخاص کو فن شاعری اور زبان کی اصلاح سے متعلق خطوط کے ذریعے مشوروں سے نوازا تھا۔

'غالب کے خطوط میں تہذیبی عناصر' کے عنوان سے 17 صفحے کے اس مضمون میں مضمون نگار نے غالب کے عہد کی تہذیب کو ان کے خطوط میں تلاش کرکے قارئین کے روبرو کیا ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تہذیب انسانی طرز زندگی کا ایک اہم جزو ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ اسی طرح غالب کی تحریروں میں ان کے عہد کے مذہبی

رسومات، شادی بیاہ، میلہ ٹھیلہ، غم و خوشی، خورد و نوش، رنگ ڈھنگ، کھان پان، پکوان اور رسم و رواج کی تصویریں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں جسے مصنف نے تلاش و جستجو کے ذریعے بحسن و خوبی پیش کیا ہے۔ دوسرے باب کا چوتھا مضمون مکمل طور پر تاریخی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس مضمون 'غالب کے خطوط میں تاریخی عناصر' میں مضمون نگار نے غالب کے خطوط میں 1857 کے ہنگامہ خیز حالات کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے ساتھ اس وقت کی تباہیوں اور بربادیوں پر محققانہ نظر ڈالی ہے جس کو مدنظر رکھتے ہوئے صاحب کتاب رقم طراز ہیں:

''مختصر یہ کہ غالب کے خطوط میں تاریخ کی جو کچھ روشنی ملتی ہے اس سے اٹھارہ سو ستاون کی ایک اچھی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔''

کتاب کا آخری مضمون 'غالب کے خطوط میں غالب کے سوانحی حالات' کے عنوان سے 18 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے غالب کے خطوط کی مدد سے ان کی حالاتِ زندگی کی متعدد کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کی ہے، جس میں خاص طور سے غالب کے خاندانی پس منظر، غالب کی تاریخِ پیدائش، غالب کے عقیدے، ان کی شادی، اولاد اور قلعے میں ملازمت سے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہے۔ اخیر میں معاون کتابوں اور رسالوں کی فہرست کتابیات میں درج ہے جو اس کتاب کی تکمیل میں بنیادی اور ثانوی ماخذ کے طور پر کام میں لائی گئی تھیں۔

پروف کی غلطیوں کے باعث کہیں کہیں عبارت کی تفہیم میں دقت پیش آتی ہے۔ آئندہ اشاعت میں مصنف کو اس پر توجہ دینی ہوگی۔ ویسے اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے یہ کتاب غالب فہمی اور غالب شناسی کے سلسلے میں ایک اہم اضافہ ہے۔ امید ہے کہ نوجوان ریسرچ اسکالر عبدالرحمٰن جمال الدین کی اس پہلی تحقیقی اور تنقیدی کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

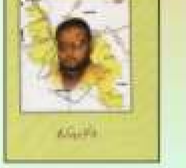

دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ

(ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی وصحافتی خدمات کے حوالے سے)

مصنف: ڈاکٹر سرور کریم

صفحات: 376 قیمت: 300 روپے، اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ) موبائل: 09430898766

دربھنگہ شمالی بہار کا ایک مردم خیز خطہ ہے۔ یہ عہد قدیم سے ہی اہل علم و دانش کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کے تخلیق کاروں نے اردو زبان و ادب کی آبیاری میں قابل قدر حصہ لیا ہے۔ اردو کے اہم مراکز سے دور اس خطے کی ادبی خدمات کا مطالعہ ایک اہم کام تھا جس کو ڈاکٹر سرور کریم نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور اس حوالے سے ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی اور صحافتی خدمات کو منعکس کیا ہے۔ یہ تصنیف تحقیقی مقالے کی کتابی صورت گری ہے، جس پر مصنف کو ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ (بہار) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ ڈاکٹر سرور کریم کا تعلق درس و تدریس سے ہے اور وہ شعر و ادب سے بھی والہانہ شغف رکھتے ہیں۔

الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ دربھنگہ کے زیر اہتمام شائع زیر تبصرہ کتاب 'دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی وصحافتی خدمات کے حوالے سے' پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں دربھنگہ (متھلا) کے تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور علمی پس منظر کے ساتھ ادبی پیش رفت کا جائزہ لیا گیا ہے نیز عصر حاضر تک یہاں کے ادبا و شعراء کی کارگزاریوں کا مطالعہ اس کے محتویات میں شامل ہے۔ یہ حصہ خاموش دربھنگوی (وفات 1813) سے ڈاکٹر فیاض احمد وجیہہ (پیدائش 1982) تک تقریباً ایک سو باون اہل قلم حضرات کی ادبی کارگذاریوں کا حوالہ بنا ہے۔ یہ دربھنگہ کے حوالے سے جامع اور اپ ٹو ڈیٹ تحقیق ہے۔ اس موضوع پر دستیاب کتابوں کی اگلی کڑی کے طور پر اسے دیکھا جانا چاہیے۔

باب دوم سے پنجم تک ڈاکٹر امام اعظم کی سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کا تعین کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم شاعر، ناقد، صحافی اور دانشور ہیں۔ سولہ برسوں سے سہ ماہی ادبی جریدہ 'تمثیل نو' دربھنگہ سے نکال رہے ہیں۔ معاصر ادبی منظر نامے میں اپنی فعالیت اور ادبی کارگزاریوں کے سبب جانے پہچانے جاتے ہیں۔ فی الوقت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ریجنل سینٹر کولکاتا (مغربی بنگال) کے ریجنل ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ یہ ابواب مختلف عنوانات کے تحت ان ہی کے کارناموں کا اجالا ہیں۔ باب دوم ان کے حالات زندگی اور علمی و ادبی پس منظر کے لیے مختص ہے۔ اس میں خانوادہ، پیدائش اور تعلیم و تربیت، تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں، ملازمت، خانگی زندگی، سیمینار، کانفرنس اور ورکشاپ، غیر ممالک کا سفر ذیلی سرخیوں کے تحت شخص اور شخصیت کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب سوم ان کی ادبی خدمات کے جائزے پر محیط ہے۔ اس کے لیے شاعری، تنقید، تحقیق و تدوین، ترجمہ نگاری، سفرنامے، سیمینار و سمپوزیم عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ محقق نے یہاں ان کی تصنیفات و تالیفات کو مطالعے میں رکھا ہے جن کی تعداد اٹھارہ ہے۔ اس کے علاوہ چند کتابچے بھی ہیں۔ 'قربتوں کی دھوپ' اور 'نیلم کی آواز' کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ ''ان کی شعری کائنات میں شعر و ادب کی اعلیٰ ترین روایتوں کی پاسداری کا لحاظ ملتا ہے اور فطری طور پر عصری حسیت کا بالیدہ شعور بھی نمایاں ہوا ہے۔'' 'گیسوئے تنقید' اور 'گیسوئے تحریر' کے مضامین سے ان کی تنقیدی حسیت اور شعور و آگہی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تحقیق و تدوین کے ضمن میں ان کی سات کتابوں اور چند کتابچوں کا جائزہ لیتے ہوئے محقق موصوف نے ڈاکٹر امام اعظم کی خدمات کو اطمینان بخش قرار دیا ہے۔ ہندی شاعر ارون کمل کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ شعری مجموعہ 'نئے علاقے میں' کے اردو ترجمے کو سامنے رکھ کر ان کی ترجمہ نگاری کے اوصاف متعین کیے گئے ہیں اور اس صاف ستھرے ترجمے کی تعریف کی گئی ہے۔ 'اک سفر کراچی کا'، 'جدہ کا سفر'، 'کلکتے کا ایک یادگار سفر' اور 'بھونیشور کا ایک مختصر سفر' وغیرہ کے مطالعے کی روشنی میں ان کی سفرنامہ نویسی کا جائزہ بھی دلچسپ ہے۔ موصوف نے جن سیمینار اور سمپوزیم میں شرکت کی ہے ان سب کی فہرست سازی بھی کی گئی ہے۔ اس طرح اس باب میں ان کی ادبی خدمات کے تقریباً تمام گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ چوتھے باب میں ڈاکٹر امام اعظم کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے لیے 'ادارت' اور 'اخبارات و رسائل میں ادبی رپورٹنگ' دو ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور ان نکات کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے ڈاکٹر موصوف کی صحافتی کارکردگی کو جانا جا سکے۔ محاکمہ میں اس تحقیقی مقالے کا نچوڑ موجود ہے اور ڈاکٹر امام اعظم کی جملہ ادبی وصحافتی خدمات کے اقرار و اعتراف کی راہیں ہموار کی گئی ہیں۔ کتابیات سے قبل 'ضمیمہ' کے تحت سرور کریم کو پی ایچ ڈی ڈگری تفویض ہونے کے بعد سے کتاب شائع ہونے تک ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی کارگزاریوں کی تفصیلات صاحب کتاب کی ادبی دلچسپی اور کتاب کو حتمی بنانے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں موضوع کے تعلق سے حاصل شدہ مواد کو معنی خیزی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، کارآمد حوالے اخذ کیے گئے ہیں اور شخصیت کے کارناموں کے تعین میں تنقیدی شعور سے کام لیا گیا ہے۔ دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ اور ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی وصحافتی خدمات کے حوالے سے یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ناول چاندنی بیگم ایک مطالعہ

مصنف: ارشاد سیانوی
صفحات: 160، قیمت: 200 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی
پروجیکٹ فیلو، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'قرۃ العین حیدر کا ناول چاندنی بیگم ایک مطالعہ' ارشاد سیانوی کی تحقیق، جستجو اور محنت کا ثمرہ ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ مصنف کتاب فی الوقت دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے میں منہمک ہے۔ یوں تو 'چاندنی بیگم' پر اس سے پہلے بھی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، لیکن سابق کتابوں کی وجہ سے اس کتاب پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ہر مصنف کا اپنا ایک خاص اور منفرد نقطۂ نظر ہوتا ہے، جس کے تحت وہ نتائج برآمد کرتا ہے اور اسے لفظوں کا جامہ پہنا کر قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ارشاد سیانوی نے بھی قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری بالخصوص 'چاندنی بیگم' کے حوالے سے اس کتاب میں اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا ہے۔

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے جو بالترتیب قرۃ العین حیدر کا عہد اور شخصیت، قرۃ العین حیدر کا ناول 'چاندنی بیگم' ایک مطالعہ اور 'چاندنی بیگم' کی انفرادیت ہیں۔ ان تینوں ابواب میں مصنف نے نہایت مختصر اور جامع انداز میں قرۃ العین حیدر کی خدمات، ان کی شخصیت، ہم عصر فکشن نگار، ناول چاندنی بیگم کا تجزیہ اور اردو ادب میں اس کی اہمیت و انفرادیت سے بحث کی ہے۔ پہلا باب جو 'قرۃ العین حیدر کا عہد اور شخصیت' پر مبنی ہے اس باب میں فقط ان کے عہد اور شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی جاتی تو زیادہ مناسب تھا، لیکن مصنف نے اس باب میں ان کے ہم عصر فکشن نگار مثلاً سجاد ظہیر، کرشن چندر، عزیز احمد، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، انتظار حسین کی فکشن نگاری کا مختصر اتعارف بھی پیش کیا ہے، جس کی اس باب میں قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ البتہ ہم عصر فکشن نگار کا ذکر کرتے ہوئے موازنے کی کوئی صورت پیدا کی جاتی تو بہتر ہوتا۔ دوسرے اور تیسرے باب میں مصنف نے اپنی تنقیدی بصیرت کا سہارا لیتے ہوئے جن نکات کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے موضوع کے تئیں ان کی سنجیدگی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول 'چاندنی بیگم' پر ہمارے ناقدین ادب نے اعتراضات بھی کیے ہیں اور کھلے دل سے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ یعنی ایک طرف اسے 'آگ کا دریا' کے بعد ان کا دوسرا اہم ناول قرار دیا گیا تو دوسری جانب اسے لغو اور بے کار گردانتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا گیا کہ صفحات بڑھانے کے لیے زبردستی کی کھینچ تان کی گئی ہے۔ 'چاندنی بیگم' پر ایک اعتراض ملاحظہ فرمائیں:

''...چار سو پچیس صفحات پر پھیلے ہوئے اس ناول میں قصہ ابھی 164 صفحات تک ہی پہنچا تھا کہ ہیروئن ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ یعنی یہ کہ اس کے بعد نصف سے زیادہ ناول میں فقط زبردستی کی کھینچ تان ہے اور بات بن نہیں سکی ہے۔'' (ص 144)

ان جیسے تمام اعتراضات کی نفی کرتے ہوئے صاحب کتاب نے 'چاندنی بیگم' کو قرۃ العین حیدر کا ایک اہم ناول قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ مصنف نے اس ناول کو اردو فکشن کی تاریخ میں ایک نئے موڑ سے تعبیر کیا ہے۔ ''...ہم حقیقتاً چاندی بیگم کو اردو ناول میں ایک نیا تجربہ محسوس کرتے ہیں..... یہ ناول روایتی ناول نگاری کی طرز والا ناول نہیں ہے بلکہ ایک نئی سمت کا آغاز ہے اور ناول نگاری کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ ہے۔''

کتاب کی طباعت اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ زبان صاف، سلیس اور رواں ہے، لیکن کہیں کہیں الفاظ اور جملوں کی بے ترتیبی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے قیمت کا بار کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ پروف ریڈنگ کی کچھ غلطیاں بھی کتاب میں در آئی ہیں، جسے امید کرتا ہوں اگلے ایڈیشن میں درست کرلیا جائے گا۔ بہر حال مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارشاد سیانوی کی کتاب ''قرۃ العین حیدر کا ناول چاندنی بیگم ایک مطالعہ'' اردو فکشن بلکہ قرۃ العین حیدر کو سمجھنے اور ان سے مستفید ہونے کی جانب ایک مثبت قدم ہے۔ امید کرتا ہوں کہ اردو حلقے میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

فکشن

ملبہ

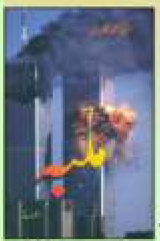

مصنف: سید احمد قادری
صفحات: 320، قیمت: 350 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: نفیس عبدالحکیم، 51، مسلم ہاسٹل، یونیورسٹی آف الہ آباد، الہ آباد

افسانوی ادب میں سید احمد قادری کا نام کوئی نیا نہیں ہے۔ اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے (ریزہ ریزہ خواب 1985، دھوپ کی چادر 1995 اور پانی پر نشان 2006) منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ اردو کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے 1970 کے آس پاس سے لکھنا شروع کیا، جب ترقی پسند تحریک اپنے حصے کا کام کر چکی تھی اور ادبی منظر نامے پر جدیدیت پروان چڑھ چکی تھی۔ جیسا کہ اردو ادب کا ایک ادنی قاری بھی اس بات سے بہ خوبی واقف ہے کہ جدیدیت کے زیر اثر مبہم، علامتی اور تجریدی افسانہ لکھنا ایک فیشن بن چکا تھا۔ ان کے معاصر افسانہ نگار علامتی اور تجریدی افسانہ کے ذریعے اپنی شناخت بنانے میں مصروف تھے۔ ایسے ادبی منظر نامے میں انھوں نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی ایک الگ شناخت قائم کرنے کے لیے جدیدیت کی بیساکھی کا سہارا نہیں لیا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کی بالادستی سے اعراض کرتے ہوئے اپنے افسانے کو ذریعۂ اظہار بنایا۔

زیر نظر 'ملبہ' سید احمد قادری کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے جس میں کل بیالیس افسانے ہیں۔ انھوں نے اپنے اردگرد کی دنیا کو غور سے دیکھا ہے۔ ان کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے صدق دل سے لکھا ہے۔ بہ قول افسانہ نگار 'میں نے زندگی کے بہت سارے نشیب و فراز تہذیبوں اور قدروں کا زوال، ٹوٹتے بکھرتے سماجی رشتے اور سیاست کی بساط پر انسانیت، حیوانیت کی شہ و مات کی چال کو قریب اور دور سے دیکھا اور شدت سے محسوس کیا ہے'۔ انھیں اسباب و عوامل کی بنا پر ان کے افسانے تخیل و تصور کی وادی میں بھٹکنے کے بجائے زندگی کے روزمرہ حقائق سے نبرد آزما ہیں۔

زیر نظر مجموعہ 'ملبہ' میں پہلا ہی افسانہ ملبہ کے عنوان سے ہے۔ یہ افسانہ بہ ظاہر عشقیہ افسانہ معلوم ہوتا ہے لیکن افسانے کے پس منظر میں ایک عالمی مسئلہ دہشت گردی اور سپر پاور ملک کا کمزور ملک پر حملے کے سنگین نتائج میں جانی و مالی نقصان کی وجہ سے جو نفسیاتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، ان کی طرف افسانہ نگار نے بڑے ہی باریک لہجے میں اشارہ کیا ہے۔

اس مجموعے میں 'زندگی' کے سابقہ و لاحقہ سے مرکب تین افسانے ہیں جس میں زندگی کی بصیرتیں کمال سادگی و کمال پرکاری سے اظہار پاتی ہیں۔ گہرائی میں جاکر دیکھا جائے تو ان کے افسانوں کے مرکزی کردار اپنے دور، اپنے ماحول اور اپنے طبقے کے ترجمان ہیں۔ اس لیے ان کے افسانے میں ایک فرد پورے معاشرے کا اور پھر اس معاشرے کے پورے ایک طبقے کا نمائندہ کردار بن جاتا ہے...... مگر ملبہ میں شامل بعض افسانے کے مرکزی کردار بہت ہی کمزور ہیں جو زندگی کی سچائیوں کو تسلیم نہیں کرتے اور

ان سے فرار کا کوئی بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں 'وقت کا بہتا دریا' ہے جو بڑے شہروں کی زندگی کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے کہ بڑے شہروں میں کتنی بھاگ دوڑ والی زندگی ہوتی ہے۔ میاں بیوی دونوں نوکری کرتے ہیں اور بچے کیئر ٹیکر ہوم میں پرورش پاتے ہیں۔ باپ کو یہ زندگی اور بچوں کی ایسی پرورش سے گھن پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنی بیوی سے گاؤں چلنے کو کہتا ہے جہاں مشرقی تہذیب و معاشرت ہے مگر بیوی بہت ہی معنی خیز جملہ کہتی ہے۔ ''سنو جاوید، آج زندگی کی یہی سچائی ہے اور ہم ان سچائیوں سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ بس زندگی کے بہتے دھارے میں بہتے جاؤ.....اور، آسکر وائلڈ کا قول تو تمھیں یاد ہی ہوگا کہ 'وقت کے ساتھ چلو، ورنہ وقت تمھیں چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا'۔

اسی طرح ان کے افسانے 'سلسلہ بھوک کا'، 'وحشی اور مسیحا کے درمیان' کے بھی کردار زندگی میں پیش آنے والی مصیبتوں کا سامنا کرنے اور ان مسائل کا حل ڈھونڈنے کے بجائے خودکشی جیسا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ 'سلسلہ بھوک کا' میں مرکزی کردار 'رمیا' جس کے چھ بچے ہیں اور شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ فاقہ کشی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے اپنی چھوٹی بچی کو دو ہزار میں بیچ دیتی ہے اور گھر گرہستی کچھ دن چلاتی ہے۔ بالآخر دو ہزار کتنے دن چلتے ؟ اس نے کچھ دنوں بعد دوسری بچی کو بھی فروخت کر دیا اور اس کے کچھ دنوں کے بعد تیسری بچی کو بھی فروخت کر دیا۔ اس کے بعد اس کو مزید کو فروخت کرنے کی تاب نہ رہی تو اس نے اپنے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ کنوئیں میں چھلانگ لگا کر ہمیشہ کے لیے بھوک کو ختم کر دیا۔ یہ تو رہی بات مسائل کا سامنا نہ کرنے کی۔ اس افسانہ کے کردار 'رمیا' کا متضاد رویہ کھٹکتا ہے۔ افسانہ نگار 'رمیا' کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ شوہر کے انتقال کے بعد وہ فاقہ کشی پر مجبور ہو گئی 'بری نظر ڈالنے والوں نے اس پر بری نظر بھی ڈالی۔ طرح طرح کے لالچ بھی دیے، لیکن وہ کسی دوسری ہی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ عصمت گنوا کر پیٹ بھرنے پر وہ کبھی رضامند نہیں ہوئی۔' دوسری طرف وہی ماں اپنی اور اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کے لیے اپنی بچیوں کو ایسے ہاتھوں میں فروخت کر دیتی ہے۔ افسانہ نگار افسانہ کے آخر میں کہتا ہے کہ 'وقت گزرتا رہا تھکی، چھوٹی اور گوری کا اپنے جن بھائی بہنوں اور ماں کی بھوک مٹانے کے لیے ایک بار سودا ہوا تو ہمیشہ ان کا سودا ہی ہوتا رہا۔ اپنی ماں اور بھائیوں کی بھوک تو وہ نہیں مٹا سکی۔ ہاں چندھیا دینے والی روشنی سے نہائے امیر لوگوں کی دوسری بھوک مٹانے کا ایک ذریعہ ضرور بن گئیں۔' یہاں پر رمیا کا دوہرا کردار کھٹکتا ہے کہ اپنی عصمت گنوا کر وہ پیٹ بھرنے پر رضامند نہیں ہوئی اور اپنی بچیوں کو چند سکوں کے عوض مستقل عصمت فروشی کے لیے فروخت کر دیتی ہے۔

ان کے موضوعات میں تنوع ہے اور کہیں پر اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ فن میں پختگی اور مشاہدے میں گہرائی اور گیرائی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ سید احمد قادری عموماً بیانیہ اسلوب، سلیس اور رواں زبان اختیار کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں ترسیل کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ مجموعہ ظاہری و باطنی دونوں اعتبار سے عمدہ ہے۔

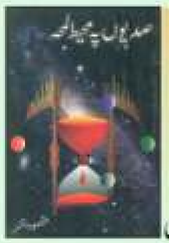

صدیوں پہ محیط لمحہ

مصنف: مقصود اظہر

صفحات: 198، قیمت: 200 روپے

ناشر: تکمیل پبلی کیشنز، ممبئی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

بیسویں صدی کے آخری عشرے اور اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں جن افسانہ نگاروں کو شہرت ملی ان میں مقصود اظہر کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ 'صدیوں پہ محیط لمحہ' یہ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جس میں 16 افسانے شامل ہیں۔ افسانوں سے قبل مقصود اظہر کے افسانوں کے حوالے سے تین مختصر مضامین شامل ہیں جن میں پہلا مضمون اردو کے اہم فکشن نقاد مہدی جعفر کا مضمون 'عصر حاضر کا منظر اور مقصود اظہر' دوسرا اختر یوسف کا 'صدیوں پہ محیط لمحہ' اور تیسرا مصنف کا 'خود کلامی نہ سمجھ تو میرے افسانے' کو شامل ہے۔ یہ تینوں مضامین مختصر مگر جامع ہیں اور مقصود اظہر کی افسانوی تکنیک پر اچھی گفتگو ہے جن کے مطالعے سے ان کے افسانوی خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ جبکہ اس مجموعے میں پہلے افسانوی مجموعے 'کشتن' سے چند منتخب افسانے شامل کیے گئے ہیں اور آخر سے قبل 'تاثرات' کے عنوان سے ان اکابرین ادب کے آرا کو شامل کیا گیا ہے جو انھوں نے ان کے افسانوں کے بارے میں پیش کی ہیں۔ ان تاثرات کو پڑھ کر بھی ان کی افسانوی بُنت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے کا انتساب 'رحم مادر میں اور بعد از پیدائش اپنے ہی ماں باپ کے ذریعے بے سبب و بے گناہ قتل کر دی جانے والی بیٹیوں کے نام' کیا ہے۔

زیر نظر مجموعہ 'صدیوں پہ محیط لمحہ' میں شامل پہلا افسانہ 'مرید' ہے یہ افسانہ دراصل قرآن کی ایک آیت قد افلح من زکٰھا و قد خاب من دسّٰھا کی ایک طرح سے تفسیر ہے۔ اس میں اس تصوف کے مضمون کو پیش کیا گیا ہے جب اس میں خرافات نہیں تھی پیری اور مریدی میں خلوص وللٰہیت شامل تھی، مقصود اظہر نے تصوف کی اصل روح کو پیش کیا ہے اور اس کو عصر حاضر سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس افسانے میں پیر و مرشد ابوالفیض خلیل اللہ کس طرح مریدین کی صف میں آ گئے اور احمد بن غفران مریدین کی صف سے نکل کر پیر و مرشد کی صف میں شامل ہو گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک انسان اپنی محنت، ریاضت، ایمانداری، دیانتداری، صداقت، عبادت، خلوص اور نیک نیتی کے ذریعے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس مجموعے میں شامل دوسرا افسانہ 'منظر کیوں بدل گیا' ہے۔ اس افسانے میں مشرقی تہذیب و تمدن کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر نامے پر سوالیہ نشان قائم کرتا ہے اور آئے دن اخبارات کی سرخیاں بننے والے سڑک حادثات، مہنگائی، حکومت کی غلط پالیسیاں، طالبہ کے ساتھ استاد کی نازیبا حرکت، اجتماعی عصمت دری، باپ کے ذریعے بیٹی کے رشتے کی پامالی، پولیس کی زیادتی، حکومت کی بے حسی، نکسل وادیوں کے حملے، ہم جنسوں کی شادی کی اجازت ان سب پر سوال اٹھاتا ہے کہ آخر یہ منظر کیسے بدل گیا؟ مشرقی تہذیب و تمدن کے منظر نامے کی تبدیلی میں آخر کس کا رول ہو سکتا ہے؟ افسانہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے منظر نامے کی تبدیلی کے اسباب کا بھی اندازہ ہونے لگتا ہے اور بظاہر جو سبب نظر آتا ہے وہ یہ کہ ساری تبدیلی گلوبلائزیشن اور انٹرنیٹ کی وجہ سے ہوئی ہے اور یہ سب مغربی تہذیب کا اثر ہے۔

اس مجموعے میں شامل تیسرا افسانہ 'کراسنگ' ہے۔ یہ موجودہ منظر نامے میں ازدواجی زندگی کے بدلتے رشتوں کی کہانی ہے۔ ازدواجی زندگی میں کب، کہاں کراسنگ آ جاتی ہے اور تاش کے پتے کھیلتے ہوئے بیگم پھینک کر کس طرح بازی ہار جاتے ہیں وہ اس افسانے کی قرأت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چوتھا افسانہ 'الاؤ اور آگ' ہے۔ یہ بھی ایک اہم افسانہ ہے جو دیہاتی زندگی اور جوائنٹ فیملی کی اہمیت اور افادیت کو واضح کرتا ہے۔ الاؤ دراصل دیہاتی منظر نامے کو واضح کرتا ہے جہاں موسم سرما میں لوگ اپنے کام کاج اور خورد و نوش سے فارغ ہو کر الاؤ کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور اس دن کے واقعات اور حادثات وغیرہ پر گفتگو کرتے ہیں، دوران گفتگو اچھی اور بری دونوں باتوں کا ذکر ہوتا، وہاں قصے کہانیاں سنی اور سنائی جاتیں، دوست احباب آپس میں ہنسی مذاق کرتے، ایک دوسرے سے سکھ دکھ بانٹتے، ایک دوسرے کے مسائل حل کرتے، بوڑھے بزرگ اپنے گزرے اوقات کا ذکر کرتے، اس طرح وہاں نئی نئی کہانیاں جنم لیتیں اور لوگوں کی تفریح کا سامان بھی ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ الاؤ میں بھی تبدیلی

آگئی۔ اس الاؤ میں تبدیلی کیوں آئی افسانے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی انصاف پسندی، صداقت، سادگی اور عدل کا ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ کسی بھی ملک کے حکمراں کو کس طرح ہونا چاہیے۔ اس کتاب میں شامل پانچواں افسانہ 'صدیوں پہ محیط لمحہ' ہے یہی کتاب کا عنوان بھی ہے۔ اس میں در اصل فلسطین اور فلسطینی مسلمانوں پر ہو رہے اسرائیلی ظلم و ستم کی داستان ہے جس کے در پردہ انسانی نسل کشی کی تاریخ دہرائی گئی ہے۔ اس میں ایک عورت انسانی نسل کی خیر خواہی کا دعائیہ استعارہ بن کر ابھرتی ہے۔ مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ بے امان، بیان، دشائیں، بے سماعت، اژدھا، بوڑھی بستی کے اپاہج، گرد آلود، فیصلہ، دیوی، کھنڈر اور بلی ایسے افسانے ہیں جن کے مطالعے سے نئے در وا ہوں گے۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے کتابت بھی بہتر ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

تاریخ

سلاطین دکن کے عہد میں شادیاں

مؤلف: اسلم مرزا

صفحات: 184، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: نوائے دکن پبلی کیشنز، رشید پورہ اورنگ آباد۔ 431001

مبصر: ڈاکٹر نشاں زیدی گیسٹ لیکچرر (شعبہ اردو) جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

'سلاطین دکن کے عہد میں شادیاں' اسلم مرزا کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 2010 میں شائع ہوا تھا، جس کی ادبی حلقوں میں پذیرائی بھی خوب ہوئی۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کتاب پر بہت سے مشاہیر ادب اور نقادوں نے اپنی رائے دی ہیں، جو کتاب کے آخر میں شامل ہیں۔ دور جدید کے معروف نقاد و ادیب شمس الرحمن فاروقی رقم طراز ہیں۔

''کتاب بہت خوبصورت ہے اور خوبی سے لکھی ہوئی ہے۔ یہ ایک معلوماتی اور اپنی نوعیت کی انوکھی کتاب ہے، جو سماجی اور انسانی تاریخ میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔''

اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کیونکہ مؤلف نے سلاطین دکن کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے، وہاں کی تاریخ اور جغرافیہ بھی بیان کیا ہے۔ کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسلم مرزا نے دکنی ادب کا باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ کتاب میں تیرہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک کے بہمنی، برید شاہی، عماد شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین کی سماجی سیاسی سرگرمیوں سے بخوبی روشناس کرایا گیا ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پیش گفتار کے تحت مؤلف نے سلاطین دکن کی تاریخ بھی پیش کی ہے جس میں ان کی جنگ کا بھی ذکر ہے، فتح و شکست کی تفصیل بھی ہے اور سلاطین کی ذاتی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ سلاطین کے مذہب و عقائد کا ذکر بھی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سلاطین میں مذہبی اور مسلکی اختلافات بہت کم تھے۔ یہاں تک سیاسی مفاد کے لیے ازدواجی رشتہ داریاں بھی قائم ہو جاتی تھیں۔ ان کے لیے ضروری نہیں تھا کہ شادی اپنے خاندان یا عزیز و اقارب میں ہو بلکہ ان کے لیے خاندانی برابری اہم تھی۔ بہمنی، برید شاہی، خاندیش، قطب شاہی اور عادل شاہی حکمرانوں کے مسلک کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

''بہمنی برید شاہی اور خاندیش کے فاروقی حکمران جہاں سنی عقائد کے پیرو تھے، وہیں نظام شاہی، قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین شیعہ عقائد کے پیرو تھے۔ اس کے باوجود ان سلاطین نے آپس میں ازدواجی رشتہ داریاں قائم کیں اور اعلیٰ انسانی صفات کا مظاہرہ کیا۔''

اسی طرح ہندو مذہب سے رشتہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

''ان سلطنتوں کے سلاطین اور ان کے عزیز و اقرباء نے صرف اپنے ہی خاندانوں میں شادیاں نہیں کیں بلکہ اپنے برابر کے دیگر شاہی خانوادوں سے، صوفیوں سے، عالموں کے گھرانوں سے زمینداروں سے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے، نیز ہندو راجاؤں سے بھی شادی بیاہ کے رشتے قائم کیے۔ اس قسم کی رشتہ داریاں اس عہد کے سیاسی مزاج کی آئینہ دار ہیں۔

کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بہمنی خاندان کے مختلف حکمرانوں نے تقریباً ایک سو نوے سال تک حکمرانی کی، ساتھ ہی سلاطین کے نام اور ان کے عہد حکومت کی فہرست بھی درج کی ہے۔ علاوہ ازیں بہمنی سلطنت کے بطن سے جو پانچ آزاد مملکتیں وجود میں آئیں ان کی مختصر تفصیل بھی پیش کی ہے۔ شادی ہر مذہب و ملت اور ہر زمانے میں اہمیت کی حامل رہی ہے شادی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ۔ پوری دنیا میں شادی کے مختلف رسم و رواج ہیں۔ کچھ رسمیں تو اتنی ضروری بنا دی گئی ہیں کہ لوگ ان رسوم کے بغیر شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اسلم مرزا نے سلاطین کے عہد کی شادیوں کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے اور قاری تیرہویں صدی کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ مؤلف نے دولہا دلہن کے کپڑوں، زیورات، سہرے، شیروانی وغیرہ کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ شادی کا منظر کھینچتے ہوئے جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔

اسی طرح جہیز میں محل، قلع اور اضلاع دینے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ رسوم بیجا کا رواج بہت زیادہ تھا۔ فضول خرچی حد سے زیادہ تھی زیادہ تر فرسودہ رسوم کا رواج تھا جن کا اسلام سے دور دور تک لینا دینا نہیں تھا۔ شان و شوکت کی خاطر بے حساب دولت خرچ کر دی جاتی تھی۔ اسلم مرزا نے اس پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے کہ ان شادیوں کا سیاسی حالات پر کیا اثر پڑتا تھا۔ کن سیاسی مصلحتوں کے تحت کون سی شادی منعقد کی گئی اور وہ کتنی کامیاب رہی اور کتنی ناکام اور کس طرح دو حکمرانوں کے درمیان صلح ہوئی۔ مؤلف نے تمام ابواب نہایت باریک بینی اور محققانہ بصیرت کے ساتھ درج کیے ہیں۔ سلاطین دکن کی تصویر تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کی ہے۔ اسلوب سادہ ہے زبان آسان اور عام فہم ہے۔ امید ہے یہ کتاب تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے معاون ثابت ہوگی۔

ابلاغیات

اردو زبان و ادب کے فروغ میں ریڈیو نشریات کا حصہ

مصنف: افتخار الزماں

ضخامت: 400 صفحات، قیمت: 207 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: مختار احسن، محلہ کالی باغ، نزد نئی مسجد، بتیا، مغربی چمپارن، بہار 845438

'اردو زبان و ادب کے فروغ میں ریڈیو نشریات کا حصہ' افتخار الزماں کی نئی تصنیف ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ مصنف نشریات سے عملی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے ریڈیو کے رموز و نکات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ کتاب نشریات کے موضوع پر اردو اور نشریاتی ادب کے حوالے سے ایک اہم کتاب کہی جا سکتی ہے۔ نشریات کے مختلف تکنیکی پہلوؤں، متعدد شعبوں کی کارکردگی، ان کی آپسی تال میل، پروگراموں کی ترتیب اور تشکیل وغیرہ ایسے امور ہیں جو مصنف کے پیش نظر رہے ہیں۔ یوں تو نشریات سے متعلق اس سے قبل بھی دیگر کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں لیکن اس کی نوعیت کچھ اور ہی ہے۔

زیر نظر کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'عوامی ذرائع ترسیل: اصول و نظریات'

ہے جس میں لفظ ترسیل کا معنی اور مفہوم، اس کا تہذیبی پس منظر، ترسیل کے بنیادی وسائل وسائل کی اہم جہتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دیگر چار ابواب ریڈیو نشریات سے متعلق ہیں۔ مثلاً ریڈیو نشریات کی تاریخ اور ارتقا، اقسام اور اقدار، مختلف جہتیں نیز اردو زبان وادب کے فروغ میں ریڈیو نشریات کو موضوع بحث بناتے ہوئے عہد بہ عہد ریڈیو نشریات کے بدلتے رنگ وروپ پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے تاکہ برصغیر ہندو پاک میں نشریات کے آغاز سے موجودہ دور تک اس کے فروغ اردو ترقی کی بتدریج تصویر ہمارے سامنے آسکے۔

کسی بھی زبان کے فروغ میں اس کے ذرائع ابلاغ کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے لیکن تجربے کی بنیاد پر مصنف کا خیال ہے کہ ابلاغ کا عمل اس قدر پیچیدہ ہے کہ اسے ایک ماڈل میں محصور نہیں کیا جاسکتا۔ شاید اسی لیے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اب اس کے پیچیدہ عمل پر غور وفکر کرنے اور پھر اس کے ترقی یافتہ طریقۂ کار کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

مصنف نے ریڈیو نشریات کی تاریخ، اس کے دائرۂ کار پر روشنی ڈالنے سے پہلے ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور وائرلیس کی ابتدا اور ارتقا کا جائزہ پیش کیا ہے۔ سائنس داں ایسی چیزوں کی تلاش میں سرگرداں تھے جن کے ذریعے تیز رفتاری کے ساتھ پیغام بھیجا جاسکے۔ چنانچہ اس ضرورت نے آگے کا راستہ بھی کھول دیا۔ سائنس دانوں نے ثابت کیا کہ بجلی کے ذریعے پیغام بڑے بڑے فاصلوں تک بھیجا جاسکتا ہے۔ اس کھوج کے نتیجے میں سب سے پہلے ٹیلی گراف ہمارے سامنے آیا جس کے ذریعے پہلا پیغام 24 مئی 1844 کو واشنگٹن سے بالٹی مور بھیجا گیا۔ کچھ ہی برسوں بعد ٹیلی فون کی ایجاد بھی ہوگئی۔

ہندوستان میں نشریات کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں کہی جاسکتی۔ مصنف نے ریڈیو نشریات کے میدان میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان پر بھی نظر ڈالی ہے۔

ریڈیو نشریات: اقسام اور اقدار کے باب میں ریڈیو نشریات کی تمام اصناف کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز اس کے پروگراموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا موسیقی کا پروگرام اور دوسرا اسپوکن ورڈس یعنی بولا ہوا لفظ۔ بعد ازاں اسپوکن ورڈس کے پروگراموں کی مختلف اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں تقریر (ریڈیو ٹاک)، ڈرامہ، مباحثہ، غنائیہ اور انٹرویو شامل ہیں۔ پھر ریڈیو ٹاک کی بھی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ مثلاً ادبی، تاریخی، سائنسی، معاشرتی، مزاحیہ، ترقیاتی وغیرہ۔

ہندوستان میں نشریات کے ابتدائی دور سے ہی اردو زبان کو پھلنے پھولنے کا موقعہ ملا۔ اشاعتی ادب سے جو کام نہیں ہوسکا نشریاتی ادب نے اسے کم مدت میں کردکھایا۔ شروع ہی سے اردو ادب کی نامور ہستیوں کی اس سے وابستگی رہی ہے گویا کہ ریڈیو نے اردو ادب کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ کہا جائے کہ ریڈیو کے ذریعے ادب کو معاشرے سے قریب تر لانے کی کوشش کی گئی تو غلط نہ ہوگا۔ چاہے غزل ہو یا افسانہ، ڈرامہ ہو یا دیگر فیچر ہر ایک صنف سخن نے ریڈیو کے ذریعے اردو کے فروغ میں حصہ لیا۔

پانچواں باب اردو زبان وادب کے فروغ میں ریڈیو نشریات کا حصہ میں جن ادیبوں اور فنکاروں نے نشریات کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نشریاتی ادب کے لیے راستہ ہموار کیا، ان میں احمد شاہ بخاری اور ذوالفقار بخاری کا نام سرفہرست ہے۔ بعد ازاں جن ادیبوں نے اس سفر کو آگے بڑھایا ان میں نورالحسن ہاشمی، غلام ربانی تاباں، مرزا محمود بیگ، پروفیسر مظفر حنفی، ڈاکٹر نریش، ذوالفقار بخاری، پطرس بخاری، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، میاں لطیف الرحمٰن، رفیع پیرزادہ، شوکت تھانوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ریڈیو کے لیے ڈرامہ لکھنے والوں کی فہرست بھی طویل ہے۔ اس ریڈیو ڈرامے نے بھی خاصی ترقی کی ہے۔ ریڈیو سے اردو ڈرامے اچھی خاصی تعداد میں نشر کیے گئے۔ آج اردو نشریاتی ادب میں ریڈیو ڈرامے اہم مقام رکھتے ہیں۔ مصنف نے اس بات کی بھی نشاندہی کی ہے کہ جب اردو ڈرامے پر زوال آنے لگا تو ریڈیو نشریات نے بڑی حد تک اسے سنبھالا دیا۔

نشریات کے تین مقاصد بتائے گئے ہیں۔ لوگوں کو تعلیم دینا، اطلاعات فراہم کرنا اور ان کی تفریح کرنا۔ پرائمری اسکول سے یونیورسٹی سطح تک کے طالب علموں کے لیے طرح طرح کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ خواتین، بوڑھے، نوجوانوں کے لیے بھی خصوصی پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے کونے کونے میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں ریڈیو کامیاب ہے۔ مصنف نے اردو سروس نئی دہلی میں نئی نسل، نئی روشنی پروگرام کا ذکر کیا ہے جس کے ذریعے نوجوان اپنی صلاحیتوں کو فروغ دے سکتے ہیں۔ ریڈیو کی اسی مقبولیت کے مدنظر ہر سال 13 فروری کو یوم ریڈیو کے طور پر منایا جاتا ہے۔

مصنف نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ ریڈیو کے لیے کیسی زبان استعمال کرنی چاہیے یعنی تخلیق کار کے لیے آسان اور عام فہم زبان استعمال کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ زبان ایسی سلیس ہونی چاہیے جو سامعین کے ذہنوں میں اتر جائے اور ان کے دلوں کو جھنجھوڑ دے۔ غرض زیر تبصرہ کتاب کے مطالعے سے ریڈیو نشریات کی اہمیت اور معاشرے اور سماج میں اس کی افادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سائنس

سائنسی تقریبات

مصنف: ایس ایس علی
صفحات: 134، قیمت: 150 روپے
ناشر: ذاکر شہزاد
مبصر: ریحانہ فاطمہ، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'سائنسی تقریبات' جناب ایس ایس علی کے سائنسی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اردو میں اس نوع کے مضامین خال خال ہی دیکھنے یا پڑھنے کو ملتے ہیں۔ کسی بھی زبان کی ہمہ گیر وسعت کا تقاضا ہے کہ اس میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں لکھی جائیں تاکہ اس زبان کا دامن مزید وسیع ہو اور ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہو۔ اس نوع کی عالمی زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں مختلف النوع موضوعات پر نہ صرف کتابیں دستیاب ہیں بلکہ اس میں اعلیٰ تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی اردو زبان کی یہ رہی ہے کہ اس زبان میں سائنسی ادب پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی اور نہ ہی انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر اس کی ترویج وترقی کی کوشش کی گئی۔ عام طور پر اردو ادب کے معنی شاعری کے ہیں ایسا ایک عام تاثر پیدا ہوگیا ہے اور فی زمانہ یہ حقیقت بھی ہے کہ اردو میں سب سے زیادہ ادبی کتابیں چھپتی ہیں اور قاری ان دنوں اس سے بھی دور ہوتے جارہے ہیں۔ اس منظرنامے پر ایس ایس علی کی یہ کتاب نوید صبح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں بارہ متنوع سائنسی موضوعات پر مضامین ہیں۔ ایک سو چونتیس صفحات پر مشتمل اس کتاب میں جذام، ریڈیو، نیند، صحت، تمباکو کی لت، پلاسٹک سرجری، فوٹوگرافی، اوزون کی تہہ، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، ریڈیولوجی اور قومی یوم ریاض وغیرہ۔ صرف ان موضوعات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب کس قدر متنوع موضوعات کی حامل ہے۔

جذام کے سلسلے میں ایک خیال یہ ہے کہ یہ قہر خداوندی کی ایک شکل ہے۔ مضمون نگار نے اس مضمون میں اس توہم پرستی کو ختم کیا کہ یہ ایک جلدی بیماری ہے اور یہ مرض موروثی نہیں ہوتا بلکہ جذام کے جرثومے اس کی وجہ ہیں۔ یہ بیماری دنیا میں پہلی بار کب آئی اس پر کون کون سے سائنسدانوں نے تحقیق کا کام کیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اس مرض کو ختم کرنے میں عالمی صحت تنظیم نے کیا رول ادا کیا ہے۔ ان سب کا احاطہ اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح ریڈیو کی تاریخ اور اس کے سرد گرم سفر پر ایک اچھا مضمون شامل ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کا موجد صرف ایک شخص نہیں تھا بلکہ کئی سائنسدانوں کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔

نیند اللہ کی دی ہوئی زبردست نعمت ہے۔ اس کے کیا فائدے ہیں قرآن کریم سے لے کر سائنس کی تحقیق کی روشنی میں بتایا گیا ہے بلکہ نیند کی پیمائش کے طریقے کار سے بھی قارئین کو واقف کرایا گیا ہے یہ اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے۔ اس طرح کے مضامین اردو میں شاید ہی نظر آتے ہیں۔ اس مضمون میں عالمی یوم نیند کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مارچ کے تیسرے جمعہ کو منایا جاتا ہے۔ اسی طرح عالمی یوم صحت 7 اپریل کو منایا جاتا ہے۔ غنیمت ہے صحت علالت سے پہلے اس مضمون میں انسانی صحت کے مطالعے پر توجہ مرکوز کی گئی ہے اور قرآنی حوالوں اور سائنسی تحقیقات کی روشنی میں اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تمباکو کی لت ارے توبہ۔ اس مضمون کی ابتدا اس شعر سے کی گئی ہے۔

چشم قاتل مری دشمن تھی ہمیشہ لیکن
جیسی اب ہوگئی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

اس مضمون میں تمباکو کے استعمال سے ہونے والی بیماریوں کا ذکر کیا گیا ہے اور عالمی صحت تنظیم کی کوششوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مختلف اعداد و شمار سفید و سیاہ۔ تصاویر کے ذریعے اس کے ہولناک ہونے کا منظر بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں شامل ایک اور مضمون اپنی نوعیت اور انفرادیت کی وجہ سے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ باہر بھی آپے سے سمندر نہیں ہوتا۔ اس مضمون میں سمندر کے آغاز و ارتقا اور اس میں پائی جانے والی آلودگی سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ 8 جون کو عالمی یوم سمندر منایا جاتا ہے۔ مضمون کے ابتدا میں سورۃ انبیا اور سورۃ نور کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس مضمون میں سمندر میں پائے جانے والے جانور اور نباتات کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے اسی طرح پلاسٹک سرجری، فوٹوگرافی، اوزون کی تہہ، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، ریڈیولوجی اور قومی یوم ریاضی پر بھرپور مضامین شامل کتاب ہیں۔ ان تمام مضامین کو پڑھ کر بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جناب ایس ایس علی کو ان موضوعات سے کتنی دلچسپی ہے وہ بیک وقت سائنس کے مختلف موضوعات پر درک رکھتے ہیں اور مضامین کے اسلوب میں ان سائنسی مسائل پر ان کی گہری تشویش بھی عیاں ہے۔ اس کتاب کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ ہر مضمون میں حسب حال اساتذہ کے اشعار کو استعمال کیا گیا ہے جس سے ایس ایس علی کے ادبی ذوق اور مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔

مذکورہ کتاب اردو کے سائنسی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے اور اردو زبان کو زندہ اور پائندہ رکھنے کے لیے سائنسی موضوعات اور ایس ایس علی جیسے سائنسی بصیرت رکھنے والے ادیب کی ہمت افزائی بھی وقت کی ضرورت ہے۔

مکاتیب

نذیر فتح پوری بنام سلطان اختر (خطوط)

مرتب: محمد یعقوب برکت اللہ

صفحات: 132، قیمت: 150 روپے

مبصر: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری،

گورنمنٹ ڈگری کالج ماگام، بڈگام، کشمیر 193401

سلطان اختر کے نام نذیر فتح پوری کے خطوط کا یہ مجموعہ جسے محمد یعقوب برکت اللہ نے مرتب کیا ہے، پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خط لکھنا نہ صرف یہ کہ ہماری ایک پرانی، مگر شاندار روایت رہی ہے، بلکہ یہ ہر دور میں ایک من پسند شغل بھی رہا ہے۔ اسی لیے جہاں ہم مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شاعری کی بات کرتے ہیں، وہاں ان کے خطوط کا بھی خوب تذکرہ ہوتا رہتا ہے اور بلاشبہ غالب کے خطوط اپنی مثال آپ ہیں غالب جن کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ اسے آدھی ملاقات قرار دے دیا، نے اپنی شاعری میں کئی جگہوں پر اس ہنر کا ذکر کیا ہے:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو / ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے
قاصد کے آتے آتے ایک اور خط لکھو / میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر / کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

جناب نذیر فتح پوری کے خطوط کا زیر تبصرہ مجموعہ پڑھ کر مجھے غالب کی خطوط نگاری کا نہ صرف یہاں تذکرہ کرنا پڑا، بلکہ میں وثوق کے ساتھ یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس مجموعے میں کئی ایسے خطوط بھی شامل ہیں کہ جن کو پڑھ کر مجھے خطوط غالب کا گمان ہونے لگا۔ اس مجموعے میں شامل پہلا خط 16 جولائی 2011 کو لکھا گیا، جبکہ آخری خط 14 جون 2015 کو تحریر کیا گیا۔ یعنی یہ آج کا زمانہ ہے اور یہ وہ زمانہ ہے، جب سماجی رابطے کے مختلف وسائل جیسے فیس بک، واٹس اَپ کے علاوہ موبائل فون ہر ایک کے دسترس میں ہے۔ اس کے باوجود بھی خطوط کے ذریعے اپنے روز و شب کی احوال نویسی نہ صرف یہ کہ قابل تحسین ہے، بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ یہاں میں یہ بات بھی ضمناً عرض کرتا چلوں کہ الیکٹرانک میڈیا کچھ بھی ہو، آخر یہ سب کچھ ہوا میں اُڑتا ہی جاتا ہے۔ اس کے برعکس پرنٹ میڈیا کتاب ایک زندہ ریکارڈ ہے جو آسانی سے مٹنے والا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں کتاب پڑھنے کا اپنا ایک الگ ہی مزہ ہے۔

خطوط کا یہ مجموعہ ہمارے اس زمانے کے سیاسی، ادبی، سماجی اور اقتصادی حالات کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ان خطوط میں نامہ نویسندہ نے نہ صرف اپنے ذاتی احساسات اور جذبات، کیفیات اور حالات کی ہی نہیں بلکہ سیاسی رسہ کشی، سماجی تانے بانے، ادب اور خاص کر اردو ادب، یہاں تک کہ ایسے حالات کا بھی اظہار کیا ہے، جن کا سامنا ہمیں آئے دن کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ یکم جنوری 2012 کو لکھے گئے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے:

''آدھی رات کے بعد کسی وقت بستی کی بجلی کسی بے وفا دوست کی طرح اچانک غائب ہوگئی تھی، گویا بجلی بورڈ والوں نے اعلان کردیا کہ ہم نئے سال کا خیر مقدم اندھیروں کی چادر تان کر کریں گے۔ کوئی ہمارا کیا بگاڑے گا۔''

اسی خط میں آگے بڑھ کر عالمی سیاسی حالات کی منظر کشی بڑے طنزیہ انداز میں کی گئی ہے ''کہاں گئے صدام کے وہ مہلک ہتھیار جن کی وجہ سے انھیں ہلاک کیا گیا، لگتا ہے وہ ایران منتقل ہوگئے اور اب وہ مہلک ہتھیار ایران میں تلاش کیے جائیں گے۔''

ان خطوط میں نہ صرف اردو ادب بلکہ اردو کے کچھ چوٹی کے ادیبوں کے بارے میں بھی نذیر فتح پوری کے خیالات واضح طور پر ملتے ہیں۔ ایک خط میں شمس الرحمن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کے خیالات اور ان کے رتبے کے بارے میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''دونوں ہمارے بزرگان ادب ہیں۔ ادبی طور پر قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔ علم و ادب کا سمندر ہیں۔ میں دونوں سے ملا ہوں۔''

اب جہاں تک کہ ان خطوط کی زبان کا سوال ہے تو بلاشبہ ان خطوط میں ایک ایسی اردو زبان استعمال کی گئی ہے، جو اردو خطوط نگاری کا خاصہ ہے جیسے:

''میں ٹھیک ہوں، بلکہ بہت ٹھیک ہوں۔ اس عمر میں اپنی صحت بھی قدرت کا عطیہ ہے۔ لکھ رہا ہوں، پڑھ رہا ہوں، لوگوں کو اسباق پڑھا رہا ہوں۔ خود بھی کبھی کبھی سبق یاد کرلیتا ہوں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ آخری سانس تک سیکھتا رہے۔'' (ص 124)

خطوط کے اس مجموعے کو اوّل تا آخر پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر تحریر موثر اور جاندار ہو، تو قاری ہرگز بوریت محسوس نہیں کرسکتا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ خطوط کے اس مجموعے کو حاصل کرکے پڑھنے والا ہر فرد میری اس رائے کے ساتھ ضرور اتفاق کرے گا۔

شعری مجموعہ

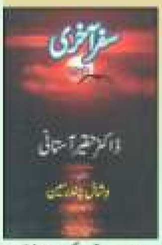

سفر آخری

مرتب: وشال چندر سین

صفحات: 240، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2016

مبصر: راحت علی صدیقی، محمد پور ماسی،
کھتولی، مظفر نگر، 251201 (یوپی)

اردو زبان نے اپنی جاذبیت، چاشنی اور مٹھاس سے بہت سے ایسے افراد کو متاثر کیا جن کا تعلق اردو زبان سے نہیں تھا، جن کا گھر، سماج، معاشرہ، تہذیب و ثقافت کا اردو حصہ نہیں تھی، جن کا میدان عمل اردو زبان ادب نہیں، ایسے بہت سے افراد اس زبان وادب سے وابستہ ہوئے اور اسے بے پناہ قیمتی سرمایہ عطا کیا، ان کی ادبی خدمات نے بڑے بڑے ادبا کو حیران و متعجب کر دیا اور عیاں ہو گیا کہ اردو زبان کتنی بلند ہے، اس کا معیار کتنا اعلی ہے، اسی قافلے کا ایک فرد ڈاکٹر کیشو چندر سین (حقیر آستانی) بھی ہیں جن کا میدان معاشیات ہے۔ ان کی اعلی تعلیم اسی فن میں ہوئی۔ شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو وہاں بھی کامیاب ہوئے۔ ان کے پانچ مجموعے ہیں جو شائع ہو کر باوقار قارئین تک پہنچ چکے ہیں (1) افکار گریزاں (2) خبط و ضبط (3) آدمی درندہ ہے (4) رقص عطش (5) سفر آخری۔ ان کے ادبی سفر کا قابل قدر ذخیرہ ''سفر آخری'' نگاہوں کے سامنے ہے۔ 238 صفحات پر مشتمل غزل نظم رباعی متفرق اشعار سے پُر مجموعے کی ابتدا میں مصنف کا مختصر تعارف موجود ہے جو شخصیت کے معیار کا احساس کراتا ہے۔ شاعری کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے جس سے خالق و مالک اور اس کی صفات و کمالات کا اظہار ہوتا ہے، مالک حقیقی کی تعریف و ستائش دلکش اور متاثر کن ہے، اس کے بعد غزل، وہ حسین صنف شاعری صدیاں گزرنے کے بعد مشکل اور اچھے حالات سے نبرد آزما ہونے کے بعد بھی اس کا حسن متاثر نہیں ہوا اور غزل کی اہمیت و وقعت میں دوبالگی اور بلندی ہوتی رہی اور آج بھی یہ صنف اردو شاعری کی پیشانی پر جھومر کی طرح سجتی ہے۔ غزل مجموعے کے تقریباً دو تہائی حصہ کو محیط ہے، غزلیں صاف ستھری اور معیاری ہیں الفاظ نپے تلے اور تراکیب عام طور پر آسان اور سلیس ہیں، معنی اور مفہوم کے اعتبار سے گفتگو کی جائے تو بلند افکار کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالا گیا ہے، سطحیت نہیں ہے معیاری خیالات کی عکاسی ہے، انسانی سماج اور معاشرہ کا خوبصورت اور بصیرت آمیز بیان ہے، غزلیں بدلتے مزاج، زمیں بوس ہوتی اقدار کا آئینہ ہیں۔ تلخ مسائل سماج و معاشرہ کو دیمک کی طرح چاٹنے والے گندے طور و طریق انسانوں کی خوبصورت عادات سے دوری اور صفات رذیلہ کی پرستاری ان تمام چیزوں کو غزلوں میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

سنتے ہیں زمانے میں اک چیز مروت تھی　　　وہ بات کہاں باقی وہ لوگ کہاں ہوں گے

دنیا کے حالات، گھر، سماج، ظلم، جور، ستم ایذا رسانی، برائی کی حکمرانی اور اچھائی کی شکست پر خوبصورت طنز بھی غزلوں کا خاص وصف ہے:

کسی ٹوٹے ہوئے دل سے یہی آواز آتی ہے　　　یہ دنیا ہے بڑی ظالم مجھے کیوں کر ستاتی ہے

جہاں یہ مسائل غزلوں میں موجود ہیں، وہیں ان کا حل اور حالات کے تبدیل ہونے کی امیدیں بھی ان غزلوں میں جاگتی ہیں، ان کی خاصیت یہی ہے کہ انسان مایوسی و ناامیدی کے سیاہ اندھیرے میں شکست خوردہ اور لاچار و بے بس نہیں ہوتا بلکہ ان کے حل کی جستجو اس کی منزل ہے، یہ شعر اس بات کا گواہ ہے:

صد چاک رہا دامن اپنا ہر چاک مگر سینہ ہوگا
منزل بھی یہاں اپنی ہوگی اپنا ہی یہاں زینہ ہوگا

غزلوں میں مرکزی حیثیت انہی عناوین کو حاصل ہے مگر خشکی نہیں ہے۔ روایتی طرز کی غزلیں بھی موجود ہیں اور عشق و محبت کے حسین جذبات بھی غزلوں میں موجود ہیں، بڑے سلیقے سے اس کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنایا گیا ہے اگر چہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں بھی غم کے سایہ سے آزادی کم ہی میسر آئی ہے اور غم زیست، غم حبیب کا روپ دھار کر عشقیہ اشعار میں جلوہ گر ہوا ہے۔ یہی اس مجموعے کی خوبصورتی ہے کہ ہر شخص اس کو اپنی زندگی کے دکھوں کی کہانی اور اپنے غموں کا بیان محسوس کرتا ہے، چاہے وہ ایک خاص جذبے کو شامل ہو یا عام خیالات پر مشتمل ہو۔ اندازہ کیجیے اس شعر سے:

اپنا جینا بن تیرے ہوگا محال　　　سچ یہی ہے یہ طرفداری نہیں

اور یہ بھی اسی رنگ میں ملاحظہ کیجیے:

اک دھواں سا اٹھ رہا ہے دیر سے　　　کچھ میرے سینے میں ہے جلتا ہوا

دوسرا حصہ نظموں پر مشتمل ہے اختر الایمان کی دنیا (نظم) میں بھی مجموعے کا ایک مختصر حصہ موجود ہے تقریباً نو نظمیں مجموعے میں شامل ہیں جن میں مختلف عناوین پر گفتگو موجود ہے۔ تنوع ان کا خاص وصف ہے اور مسائل زیست سے لے کر مسائل دنیا اور مسائل عشق کو بھی نظمیں بیان کرتی ہیں، پہلی نظم اطمینان، کائنات کی بے اطمینانی کا اظہار کرتی ہے اور یہ باور کراتی ہے کہ اطمینان کسی کو حیات میں کہاں میسر ہے۔ دوسری نظم آزمانا مجھے چھوڑ دے، مالک حقیقی سے شکوہ ہے کہ آخر کب تک مجھے آزمایا جاتا رہے گا اور اس امتحان کا اختتام کب ہوگا؟ جنت سے نکالا جانا، صلیب پر لٹکایا جانا، ان تمام دشوار ترین مراحل سے انسان گزر چکا، اب کب تک یہ سلسلہ ہوگا۔ اسی کا شکوہ اس نظم میں موجود ہے۔ موقع پرستی ایک مختصر نظم ہے جس کا عنوان ہی اس پر مطلع کرتا ہے، فلسطینیوں پر ہو رہے ظلم و ستم پر بھی ایک نظم موجود ہے، کھلونا انسان کے دل کی کیفیت کو بیان کرنے کی خوبصورت کوشش اور قلب کو کھلونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لین دین، اس نظم میں زندگی کی بے ثباتی اور لوگوں کا خرید و فروخت میں الجھنا، اور اپنی سادگی کا اظہار کیا گیا ہے۔

آخری حصہ چار مصرعوں پر مشتمل ہے، اس میں حیات کے گذران اور زندگی کے مسائل کا پرتو ہے اور عشق کا عنصر جابجا جلوہ گر ہوا ہے۔ یہاں یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ رباعیات میں غزلوں سے زیادہ عشقیہ مضامین کی جلوہ نمائی ہے اور آخری حصے سے اسی طرز پر چند متفرق اشعار بھی موجود ہیں۔ مجموعے کے اشعار سادہ، سلیس ہیں، عام و خاص قاری ان سے یکساں طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں۔

دانش کدہ

شاعر/ناشر: دانش فراہی

صفحات: 216، قیمت: 150 روپے

مبصر: انور پارہ بنکوی، 1/11، ایچ 7، ہرشی اسٹریٹ، کلکتہ

اتر پردیش کا مردم خیز خطہ اعظم گڑھ جو زمانہ قدیم سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے اسی اعظم گڑھ سے تعلق رکھنے والے علم و ادب کے منبع شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی، ترجمان القرآن، علامہ حمید الدین فراہی، اقبال احمد خاں سہیل، خلیل الرحمن اعظمی، کیفی اعظمی، شمیم کرہانی، اور اختر مسلمی جیسی ادبی شخصیات نے اپنے وقت میں علم وادب کے چراغ سے پورے اعظم گڑھ کے ہی خطے کو نہیں بلکہ عالمی ادب کی تمام خانقاہوں کو روشن کیا ہے اسی اعظم گڑھ کا معروف علاقہ پھریہا یعنی فراہی حلقے سے تعلق رکھنے والے ریاض احمد، جدامجد کا عطا کردہ نام اور قلمی نام دانش فراہی شاعری سے والہانہ شغف رکھنے والے اپنی علمی بصیرت کے تحت عہد حاضر میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات اور حالات کے پیش نظر صنف سخن کے سہارے اپنی غزلوں کا دیدہ زیب مجموعہ 'دانش کدہ' منظر عام کیا

ہے۔ قیاس ہے کہ یہ ان کا پہلا پڑاؤ ہے دانش فراہی نے اپنی غزلوں کے مجموعے کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے گویا اس شعری مجموعے کو ان کے خون جگر کا حسین ثمرہ کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

سخنوری کی بساط عام لفظوں میں شعر گوئی کہی جاتی ہے اور شعریت پہلو میں فصاحت و بلاغت کے ایوان ضم ہوتے ہوئے پائے جاتے ہیں شاعر اپنا ادبی مزاج بنا کر جب اشعار کہنے پر مائل ہوتا ہے اسی تابیے شاعر کے ذہن و خیال میں غیب سے مضامین خود ہی وارد ہوتے ہیں گویا شاعر پر الہامی کیفیت طاری ہوتی ہے یعنی کہ القا ہوتا ہے شاعر اچھا و سلجھا یعنی منجھا ہوا فن کے معاملے میں فنکار ہے تو اس شاعر کی فنکاری اسے عالی مقام پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں نشاط تصور کا وسیع دائرہ اپنی بانہیں پسارے کھڑا ہوا ملتا ہے اور اسی نشاط تصور کے دامن پر نت نئے انداز کی نغمہ سنجی کے نقوش کے پرتو شاعر کو سہارا دیتے ہوئے ملتے ہیں جس کی بنیاد پر شاعر اپنے ذوق فطرت اور وسعت فکر و نظر کے تمام پہلوؤں پر اپنی نظر گاڑ دیتا ہے اس کے بعد ہی شاعر کے پرمغز خیالات کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اور شاعر اپنے فنکارانہ رویے سے استغراقی سمندر میں خود کو سمو کر اپنے اشعار میں یکسوئی کے ساتھ ارتکازی کیفیات کے عناصر پروتا ہے جس میں زمیت، شگفتگی، تازگی، غنائیت اور بے ساختگی جیسی انمول ندرت اپنا جلوہ بکھیرتی ہے اسی لمحے کے کہے ہوئے اشعار اہل نقد و نظر کے حضور اچھوتے و انمول ہونے کی ان سے سند پاتے ہیں۔

میری غائرانہ و طائرانہ نظر جس نے وثوق سے جن ادبی شہ پاروں کا محاسبہ کیا ہے اسی کے تعلق سے دانش فراہی کی شعری جہت کے سلسلے نے میرے قلم کو جنبش دینے پر مجبور کیا ہے۔ بالخصوص اس امر کے لیے کہ کوئی بھی قلمکار یا فنکار خواہ اس کی ادبی جہت شعری یا نثری ہو وہ اپنی فکر اور تخیل کے باعث کسی موضوع کو مرکزیت کا درجہ عطا کرتا ہے اس کے بعد ہی قلمکار یا فنکار اپنے تخلیقی سفر پر آمادہ ہوتا ہے اس ضمن میں مجھے یہ کہنا درست ہوگا کہ فنکار یا قلمکار اپنے تخلیقی سفر کے دوران ان باتوں کا خاص خیال رکھے کہ اس کی تخلیق میں دانشمندانہ ادب کی جھلکیں اپنی شفافیت اور پاکیزگی کا قارئین کو احساس دلاتی ہوئی ملیں، زبان و ادب میں شائستگی کے گل بوٹے اپنی مہک سے ادب شناس کو پوری طرح سرشار کرتی ہوئی انفرادیت سے ہمکنار ہوتی رہیں اور سنجیدہ ادب نواز کے ذہن و دل کے علاوہ اہل زبان و ادب کی اشتہائی کیفیت سے مسرور ہونے کی مہر بھی ثبت کرتی ہوئی ملیں اسی کی روشنی میں قلمکار یا فنکار کی اپنی فنکارانہ صلاحیت جس میں تجربات و مشاہدات کے ساتھ ادراکی بصارت و عرفانی بصیرت کے امتزاج کا پہلو نظر آئے ایسی مدافعانہ روش کے مدنظر شعری یا نثری تخلیق جب صفحۂ قرطاس پر بکھرتی ہے تو اکابرین کے نزدیک فنکار یا قلمکار کا تخلیقی عمل ایک جہان نو کی تعمیر کرنے کے مترادف ہے۔

دانش فراہی کا مجموعہ 'دانش کدہ' اسم بامسمٰی کی صورت میں ہے۔ مجموعے میں ناشر نے جن غزلوں کا انتخاب کیا ہے اس ضمن میں تخلیق کار نے کسی قدر شعری تخلیق کو سہل ممتنع جیسے ہنر سے مزین کیا ہے مگر بعض مقام پر چندے اشعار دولخنگی کے شکار ہونے کے علاوہ بحور اور اوزان کی راہوں میں متوازن نظر نہیں آتے ہیں۔ اس کے باوجود شاعر نے غزل کے لہجے کو شعلہ زنی سے بھی ہمکنار نہیں کیا ہے اور نہ ہی کسی مقام پر ثقیل لفظوں سے کام لیا ہے برعکس اس کے شاعر نے ممکنہ طور پر یہ سعی کی ہے کہ اس کی غزل کے ہر شعر کی روح میں رعنائی و دلکشی کو لیے عشقیہ قمقمے ضیائے تابانی بکھیرتے ہی رہیں دراصل شاعر کے رومانی احساس کی یہ ترجمانی کہی جا سکتی ہے۔ رومان اور حقیقت کے میلان سے فکر اور جذبے کا توازن سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے اور مضامینی عبارت بھی پر اثر ہوتی ہے لہٰذا دانش فراہی کی غزلوں کا مجموعہ بہت ہی اعلیٰ پائے کا ان معنوں میں بھی ہے کیونکہ اس مجموعے میں شامل عالمانہ انداز کی تقریظات قارئین کو مطالعے کے لیے متوجہ کرتی ہیں۔

رسائل و جرائد

فکر انقلاب (اشاعت خصوصی: اُردو زبان کے فروغ میں دیوبند کا ڈیڑھ سو سالہ کردار)

مدیر اعلیٰ: اسعد مختار، مدیر: احسن مہتاب
جلد: 5، شمارہ: 112، 16 تا 31 جنوری 2017
صفحات: 888، قیمت: 400 روپے
ناشر: آل انڈیا تنظیم علمائے حق، دہلی
مبصر: فاروق ارگلی، 25، گنیش پارک، رشید مارکیٹ، دہلی 51

دارالعلوم دیوبند محض ایک دینی درسگاہ نہیں، یہ اسلامیانِ برصغیر کا عظیم الشان مذہبی، تہذیبی، ثقافتی اور قومی مرکز ہے۔ ہندوستان کی تاریخ آزادی علمائے دیوبند کی بے مثال وطنی حریت اور لازوال قربانیوں سے روشن ہے۔ اسلامی اقدار و روایات اور علوم و فنون کے فروغ و ترویج میں دارالعلوم دیوبند کی خدمات کو بین الاقوامی شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ آج بھی دنیا کے ہر گوشے میں فرزندانِ دارالعلوم اسلامی تعلیمات، امن عالم، بقائے باہم اور اقدار انسانی کی بقا و تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ فی زمانہ ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی فاضل دیوبند کی قیادت میں آل انڈیا تنظیم علمائے حق شاندار علمی، صحافتی اور سماجی و ملی خدمت انجام دے رہی ہے۔ تنظیم علمائے حق وقتاً فوقتاً قومی و ملی موضوعات پر ملکی سطح کے سیمینار منعقد کرنے کے ساتھ ہی بلاتفریق مذہب و ملت سماج کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیات کو ایوارڈ و اعزاز سے سرفراز کرتی ہے، لیکن صحافی، شاعر، ادیب اور اسلامی دانشور مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی کی قیادت اور ادارت میں تنظیم کے ترجمان جرائد 'حسن تدبیر' اور 'فکر انقلاب' کے تحت اکابر علمائے دیوبند کی حیات و خدمات پر نہایت وقیع خاص نمبر شائع کیے ہیں، جن میں حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسی عہد ساز ہستیوں پر وقیع اشاعتیں شامل ہیں۔ فکر انقلاب کا خصوصی شمارہ 'اُردو کے فروغ میں دارالعلوم دیوبند کا ڈیڑھ سو سالہ کردار' مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی، اسعد مختار اور احسن مہتاب کا تازہ ترین صحافتی کارنامہ ہے۔ یہ ضخیم مجلہ مشاہیر علماء اور دانشوروں کے گرانقدر تحقیقی، تجزیاتی اور معلوماتی مقالات و مضامین سے مزین ہے جو دارالعلوم دیوبند کے علماء، فقہاء، ادیبوں، شاعروں اور اہل فکر و قلم کی ڈیڑھ سو سالہ بے نظیر اُردو خدمات کا احاطہ کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اُردو ادب، شاعری اور صحافت کے حوالے سے دارالعلوم دیوبند کی خدمات کو پوری طرح اجاگر کرنے کی کوئی باقاعدہ، منظم اور مقصدی کوشش ابھی تک نہیں کی گئی ہے تاہم یہ تقاضا اس مجموعے میں شامل مضامین سے بڑی حد تک پورا ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے، جیسے ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کا مضمون 'اُردو زبان کی توسیع میں تحریک ریشمی رومال کا کردار'، ڈاکٹر نجم الاسلام کا مضمون 'اُردو ادب پر تحریک دیوبند کے اثرات کا جائزہ'، پروفیسر صلاح الدین یوسف کا مضمون 'علمائے دیوبند اور اُردو زبان' اور مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی کا مضمون 'دارالعلوم دیوبند کی ادبی اور صحافتی خدمات: منظر پس منظر' وغیرہ تحقیقی اہمیت کی حامل تحریریں ہیں جن میں ہر ایک مکمل کتاب کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہ مرقع یقیناً ایک اہم علمی دستاویز ہے جو اُردو کے باذوق قارئین کے ساتھ ساتھ اُردو ادبیات کے طلبہ، محققین اور اُردو ماہرین لسانیات کے لیے گراں بہا تحفہ ہے۔ 'فکر انقلاب' کے اس خصوصی شمارہ کی ترتیب و اشاعت کے لیے مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی اور مدیران اسعد ممتاز، احسن مہتاب و ارکان ادارہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ 888 صفحات پر مشتمل اس مجلّے کی قیمت 400 روپے بے حد مناسب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، شعبۂ اعلیٰ تعلیم، ایف۔سی،33/9، جسولا انسٹی ٹیوشنل ایریا، نئی دہلی110025

قومی اردو کونسل کی 23ویں میٹنگ کی روداد

مقام: کمیٹی روم'B'، لوک سبھا سکریٹریٹ
پارلیمنٹ ہاؤس انیکسی، نئی دہلی110001

تاریخ: 25نومبر 2016
وقت: ڈھائی بجے

موجودہ ممبران

1.	جناب پرکاش جاوڈیکر، وزیر برائے فروغ انسانی وسائل	:	چیئرمین
2.	جناب جاوید علی خان، رکن پارلیمان	:	ممبر
3.	پروفیسر سید علی کریم، ڈائرکٹر، این سی پی یو ایل	:	ممبر سکریٹری
4.	محترمہ شمع خان	:	ممبر
5.	جناب پی اے انعامدار	:	ممبر
6.	جناب رفیق بھنڈاری	:	ممبر
7.	پروفیسر خورشید انور	:	ممبر
8.	جناب مولانا صہیب قاسمی	:	ممبر
9.	پروفیسر صغیر افراہیم	:	ممبر
10.	جناب احتشام عابدی	:	ممبر
11.	محترمہ ایس منوری بیگم	:	ممبر
12.	پروفیسر اختر الواسع	:	ممبر
13.	محترمہ حفیظہ مظفر	:	ممبر
14.	ڈاکٹر شائستہ یوسف	:	ممبر
15.	جناب حاجی محمد اقبال خان	:	ممبر
16.	پروفیسر نند کشور پانڈے، چیئرمین سی ایس ٹی اینڈ ڈائرکٹر کے ایچ ایس	:	ممبر
17.	جناب بلدیو بھائی شرما	:	ممبر
18.	پروفیسر محمد فاروق انصاری	:	نمائندہ، این سی ای آر ٹی
19.	ڈاکٹر کے ایس راو	:	نمائندہ، ساہتیہ اکادمی
20.	جناب راج شیکھر ویاس	:	نمائندہ، دوردرشن
21.	جناب حسن باقر کاظمی	:	خصوصی مدعو

وزارت کے نمائندگان

1. ڈاکٹر سکھبیر سنگھ سندھو، جوائنٹ سکریٹری (لسانیات) : ممبر
2. محترمہ درشنا ایم ڈبرال، جے ایس اینڈ ایف اے : ممبر
3. جناب آر سیتارام مورتی، نائب سکریٹری (لینگویجز)
4. جناب وی سری پاتی، انڈر سکریٹری (لینگویجز)

این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر نے سب سے پہلے کونسل کے چیئرمین عزت مآب وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اور اجلاس میں شرکت کررہے کونسل کے ارکان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد تمام ارکان نے اپنا تعارف پیش کیا اور پھر این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر نے چیئرمین سے خطاب کی گزارش کی۔

عزت مآب چیئرمین نے میٹنگ میں شرکت کے لیے تمام ارکان کی ستائش کی اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے تمام زبانوں کی تعریف کی اور کہا کہ ان میں اردو زبان سب سے شیریں ہے لہٰذا اس کی ہر طرح سے حفاظت کرنے اور اسے فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب کونسل کو سال میں دوبار اس طرح کا اجلاس منعقد کرنا چاہیے۔ عزت مآب وزیر نے کہا کہ ہمارے ملک کی ترقی کا تعلق ہماری زبانوں کی ترقی سے مربوط ہے جس میں خصوصی طور پر اپنی مادری زبان میں تعلیم دینا شامل ہے۔ انھوں نے اس کے لیے اسرائیل کی مثال پیش کی جہاں تمام مضامین خواہ وہ سائنس، انجینئرنگ اور میڈیکل کی تعلیم ہی کیوں نہ ہو، مادری زبان میں دی جاتی ہے۔ تمام والدین پر اپنے بچوں کو انگریزی میں تعلیم فراہم کرنے کا جنون سوار ہے تاکہ انھیں روزگار ملے۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو کئی زبانوں سے واقف ہیں لیکن اس میں مہارت نہیں رکھتے۔ لہٰذا آئین میں منظور شدہ تمام ہندوستانی زبانوں کی معیاری تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔ اس روشنی میں اردو کونسل کے لیے ترجیحی بنیاد پر اپنے ایجنڈا کے تحت معیاری طریقے سے اردو کو فروغ دینا ضروری ہے۔ ایسے مواد کو تیار کرنے کی ضرورت ہے جو اپنی زبان کو اپنانے کی ترغیب دے۔ اسی طرح اردو کونسل کے لیے اردو زبان کو معیاری اعتبار سے فروغ دینا بھی اہم ہے۔ اسے بھی یقینی بنانا ضروری ہے کہ جس مقصد کے لیے فنڈ مہیا کرائے گئے ہیں اسی میں اسے خرچ کیا جائے اور پورے ملک میں این سی پی یو ایل کے ذریعے قائم کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر کے طریقہ کار کی بہتر نگرانی کو بھی یقینی بنانا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ دانشوران اور محبان اردو کی ٹیم کے تعاون سے اردو زبان کو ایک مشن کے طور پر فروغ دینے کے لیے اجتماعی کوشش کی جائے گی۔ عزت مآب چیئرمین نے 17 دسمبر 2016 میں مہاراشٹر کے بھیونڈی میں کل ہند کتاب میلے میں شرکت کی خواہش کا اظہار کیا اور اردو زبان کے فروغ کے لیے جہاں بھی جانے کی ضرورت ہو وہاں جانے کے عزم کا بھی اظہار کیا۔

عزت مآب چیئرمین نے مزید کہا کہ عالمی اردو کانفرنس کے فوراً بعد بجٹ سیشن کے بعد کے وقفے میں کونسل کی ایک میٹنگ بلائی جائے گی جس کے لیے ڈائرکٹر ایک ایکشن پلان تیار کریں گے تاکہ کونسل کے ذریعے تیار کیے جانے والے تعلیمی مواد میں مزید بہتری آسکے۔ انھوں نے سبھی ممبران سے تحریری یا ای میل کے ذریعے مشورے بھیجنے کی بھی درخواست کی۔

کونسل کی گورننگ باڈی کے رکن پروفیسر اختر الواسع نے عزت مآب وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کا پارلیمنٹ میں تاریخ ساز تقریر کے لیے شکریہ ادا کیا اور پورے ملک میں اردو کے فروغ کے لیے این سی پی یو ایل کی حمایت کے لیے ان کی ستائش کی۔ ایک دوسرے رکن جناب اقبال خان نے بھی اردو کے فروغ میں کونسل کی حمایت کے لیے وزیر موصوف کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر نے کونسل کا ایجنڈا پیش کیا۔

آئٹم نمبر XXIII.1: 22.07.2015 کو منعقد کونسل کے بائیسویں اجلاس کی تفصیلات کی تصدیق

22.07.2015 کو منعقد کونسل کے بائیسویں اجلاس کی تفصیلات کی تصدیق کی گئی۔

آئٹم نمبر XXIII.2: 22.07.2015 کو منعقد کونسل کے بائیسویں اجلاس کی تفصیلات پر کی گئی کارروائی کی رپورٹ

کونسل کے بائیسویں اجلاس کی تفصیلات پر کی گئی کارروائی کی رپورٹ پر عمل آوری ہوئی۔

آئٹم نمبر XXIII.3: سال 2015-2016 کے لیے کونسل کے سالانہ اکاؤنٹس پر ایک نظر

سال 2015-2016 کے لیے کونسل کے سالانہ اکاؤنٹس اور آڈٹ رپورٹ کونسل کے سامنے پیش کی گئی۔ ایگزیکیوٹو بورڈ کے ذریعے سال 2015-2016 کے آڈٹ کیے ہوئے سالانہ اکاؤنٹس پر کونسل نے عمل آوری کی۔

آئٹم نمبر XXIII.4: سال 2015-2016 کے لیے کونسل کی سالانہ رپورٹ پر ایک نظر

ایگزیکیوٹو بورڈ کے ذریعے قبول کیے گئے سال 2015-2016 کے لیے کونسل کی سالانہ رپورٹ کو منظوری ملی۔

آئٹم نمبر XXIII.5: کونسل کے ذریعے کیے گئے کام کا جائزہ

کونسل کے ذریعے کیے گئے کام کی تفصیلات پیش کی گئیں جس کی تمام ارکان نے ستائش کی۔

آئٹم نمبر XXIII.6: چیئرمین کی اجازت سے دیگر کام

کونسل کے ارکان نے اپنے خیالات کا اظہار کیا:

1۔ **جناب احتشام عابدی:** (الف) اقلیتی تعلیم کی نگرانی کے لیے قومی نگرانی کمیٹی جو کافی دنوں سے کام نہیں کررہی ہے، اسے فعال بنانا ضروری ہے۔
(ب) حکومت چونکہ اردو کے فروغ کے لیے کروڑوں روپے خرچ کررہی ہے لہٰذا کونسل کو اترپردیش کے دور دراز کے علاقوں میں کام کرنا چاہیے۔ جناب عابدی صاحب کے مطابق انھوں نے وارانسی میں بھی اس سلسلے میں درخواست کی ہے۔

2۔ **جناب اقبال خان:** اردو کے فروغ کے لیے اردو کونسل کو گاؤں میں اور چھوٹے شہروں میں بھی کام کرنا چاہیے۔ بہت سارے لوگ کونسل کے بارے میں اب بھی زیادہ نہیں جانتے۔ اگر کونسل دور دراز کے علاقوں میں بھی اپنی رسائی کو یقینی بنائے تو روزگار کے حصول میں یہ مددگار ثابت ہوگی۔

3۔ **پروفیسر اختر الواسع:** (الف) کونسل کے کمپیوٹر پروگرام اس کے سیکھنے والوں کو بہتر ملازمت حاصل کرنے میں بہت مددگار ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس پروگرام سے منسلک افراد کی تنخواہیں کم ہیں لہٰذا ان کی تنخواہوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ وہ جوش سے بھرے ہوں اور زیادہ وقف شدہ ہوں۔ (ب) دوسرا معاملہ منشی پریم چند کے نام پر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور قرۃ العین حیدر کے نام پر ادب میں عطا کیے جانے والے دیگر اعزازات سے متعلق ماضی کی تجاویز کا ہے۔ تیسرا اعزاز صحافت سے متعلق ہے۔ اردو میں صحافت کی روایت، غور وفکر اور حقیقت سے جڑی ہے۔ اسے سرسید احمد خان کے نام سے قائم کیا جانا چاہیے۔

4۔ **محترمہ حفیظہ مظفر:** جموں وکشمیر سے بہت ہی کم غیر سرکاری تنظیموں نے این سی پی یو ایل مراکز کے لیے درخواستیں دی ہیں۔ اس میں اضافہ ہونا چاہیے۔ وہ بچے جو عربی سیکھتے ہیں انھیں سعودی عرب میں ملازمت مل جاتی ہے۔ ان علاقوں میں این سی پی یو ایل کے بارے میں لوگ زیادہ نہیں جانتے۔

5۔ **محترمہ منوری بیگم:** (الف) تمل ناڈو میں اردو کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ کونسل کو خواتین سے متعلق بھی ایک جریدہ شائع کرنا چاہیے جسے ان علاقوں میں پہنچایا جانا چاہیے۔ (ب) ہمیں ڈی ڈی اردو کو بھی فروغ دینا چاہیے۔

6۔ **محترمہ شائستہ یوسف:** حکومت کے تقرر کردہ بہت سارے ارکان یہاں موجود ہیں۔ ہمیں ہمارے علاقے میں غیر سرکاری تنظیموں کے طریق کار پر نظر رکھنے اور اسے یقینی بنانے کی ذمے داری دی جانی چاہیے۔

7۔ **جناب اقبال خان:** ہر ریاست میں کونسل کے ارکان کو ذمے داریاں سونپی جانی چاہیے۔ وہ اسے کسی باہر کے عہدیدار کے مقابلے بہتر طور سے انجام دے پائیں گے۔

8۔ **جناب پی اے انعامدار:** (الف) ہم لوگوں نے ڈیجیٹل دور میں قدم رکھ دیا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ہماری کتابیں بیرون ممالک میں بھی پڑھی جائیں۔ این سی پی یو ایل کتابوں کو ڈیجیٹل طریقے سے شائع کر سکتی ہے۔ (ب) کونسل کو اردو اساتذہ کو کمپیوٹر کے شعبے میں بہتر بنانے کے لیے ان کی مدد کرنی چاہیے۔ (ج) کونسل کا پونے میں اجلاس طلب کیا جانا چاہیے۔

9۔ **جناب مولانا صہیب قاسمی:** کتابوں کی تعداد کیا ہے؟ اس کے سرکولیشن کی تفصیلات مہیا کی جانی چاہیے اور کیا یہ کتابیں جن تک پہنچنی چاہیے، انھیں مل رہی ہیں، اگر نہیں مل رہی ہیں تو اس اسٹاک کا کیا فائدہ جس پر کروڑوں روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔

عزت مآب وزیر برائے فروغ انسانی وسائل: ہر مسئلے کو موثر طریقے سے حل کرنے اور اس کے احتساب کو یقینی بنانے کے لیے ہر شعبے کے لیے تین سے چار ارکان پر مشتمل کمیٹیاں تشکیل دی جا سکتی ہیں۔

10۔ **جناب رفیع بھنڈاری:** یہ بہت اچھا ہوگا کہ این سی پی یو ایل کی ایک شاخ جنوبی کرناٹک میں قائم کی جائے جس سے اردو کے چاہنے والوں کی ضروریات پوری کی جا سکیں۔

11۔ **جناب جاوید علی خان، رکن پارلیمنٹ:** سال 2014 میں این سی پی یو ایل نے ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں کونسل کی ادبی سرگرمیوں کو توسیع دینے کی خاطر بیرون ممالک میں کانفرنس اور سمینار منعقد کرانے کی قرارداد کو منظوری دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں سعودی عرب کے جدہ میں اردو کانفرنس اور کیلی گرافی کی نمائش کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ سابق حکومت نے اس تجویز کو تسلیم کیا تھا از سر نو اس پر غور وفکر ہونا چاہیے۔

آخر میں جناب چیئرمین نے اردو کو جدید تعلیم سے جوڑ کر اس کی تدریس پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ مدرسوں سے وابستہ لوگوں کو دعوت دینا چاہتے ہیں کیونکہ جب تک وہ اچھی تعلیم فراہم نہیں کریں گے تب تک کامیابی نہیں ملے گی۔ این سی پی یو ایل کو یہ یقینی بنانا ضروری ہے کہ جو اسپانسر شدہ مراکز میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ ٹکنالوجی سے بھی لیس ہوں تاکہ وہ بہتر ملازمت حاصل کر سکیں۔ مقابلے کے لیے ان میں دلچسپی ہو۔ کونسل ان تمام اہداف کے حصول میں مدد کر سکتی ہے۔ ہم لوگ جلد ہی اس پر غور وفکر کے لیے ایک اجلاس طلب کریں گے۔ بعض ماہرین کو بھی دعوت دی جا سکتی ہے جو وژن پیپر کی تیاری میں ہماری مدد کر سکیں جس میں آئندہ دس برس کے روڈ میپ کا ذکر ہو۔ انھوں نے این سی پی یو ایل کے ارکان سے کونسل کی بہتری کے لیے ڈائرکٹر کے نام تحریری طور پر مشورے دینے کی بات کہی جسے ڈائرکٹر سب کی طرف سے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کو پیش کریں۔ انھوں نے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ ان کے مشوروں پر غور کیا جائے گا۔

دن بھر کے تبادلہ خیال کے بعد اخیر میں این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر نے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اور تمام ارکان کا ان کی شرکت کے لیے شکریہ ادا کیا۔

اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر نے پاور پوائنٹ کے ذریعے کونسل کی مختلف سرگرمیوں کو شاندار طریقے سے دستاویزی طور پر پیش کیا جس کی کافی ستائش کی گئی۔

(پروفیسر سید علی کریم)

ڈائرکٹر

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

'ہندوستان میں اردو کی آئینی اور قانونی حیثیت' کے موضوع پر دوروزہ سمینار

نئی دہلی: اردو اسی ملک کی زبان ہے اور ہندوستان میں یہ ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ یہ ایسی زبان ہے جو ملک کے لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے۔ اردو زبان نے ہندی کو عام لوگوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ اردو ہمیشہ سے عوامی زبان رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر فیضان مصطفیٰ نے قومی اردو کونسل کے ذریعے 'ہندوستان میں اردو کی آئینی اور قانونی حیثیت' کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ سمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا رسم الخط اگر ہٹا دیا جائے تو یہ زبان جلد ختم ہو جائے گی۔ اپنے کلیدی خطبے میں ہندوستان کی آزادی سے قبل اردو کی صورت حال کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اردو زبان اس ملک کی روح میں شامل ہے اور اسے کوئی بھی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کے آئینی حقوق کو عام کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس سے قبل سمینار کے آغاز میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بھی مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے انھیں کونسل کی کتابیں پیش کیں اور سمینار کے موضوع کی غرض و غایت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ہم سب کو عملی طور پر کوشش کرنی ہوگی۔ اردو دستور سے نہیں اپنے گھر سے مجبور ہے۔

کونسل کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے بھی اردو کی قانونی حیثیت پر پرمغز گفتگو کی اور یہ بھی کہا کہ دور حاضر میں دانشوری کے ساتھ ساتھ دانشمندی کی بھی ضرورت ہے۔ پروفیسر طاہر محمود نے اس موقعے پر بڑی اچھی بات کہی کہ ہم ہمیشہ سے یہ سنتے آئے ہیں فلمی دنیا نے اردو کو زندہ رکھا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس بات کو یوں کہنا چاہیے کہ اردو نے فلمی دنیا کو زندہ رکھا ہے۔ آج آپ فلموں کے نغموں، اسکرپٹ، ڈائیلاگ وغیرہ میں اردو کے الفاظ واضح طور پر محسوس کر سکتے ہیں۔ اردو زبان ہندوستان کے کلچر سے خارج ہو ہی نہیں سکتی۔ عدالتوں اور ایوان میں اردو زبان کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے جسٹس فخرالدین نے کہا کہ آج کے دستور میں سب کچھ ہے۔ ہم نے کچھ بھی نہیں کھویا ہے بس ہمیں مثبت سوچ کے ساتھ آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ زبان کبھی مسلمانوں کی زبان نہیں رہی بلکہ ہر پڑھے لکھے دانشور طبقے کی زبان رہی ہے۔ ہندوستان میں اردو کی

آئینی اور قانونی حیثیت کم نہیں ہے۔

ظہرانے کے بعد اس سمینار کا پہلا اجلاس بعنوان 'اردو کا فروغ اور اردو جاننے والوں کے لیے روزگار کے مواقع' منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر جنگ راج جے اور ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے کی۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ پروفیسر خواجہ اے منتقم نے 'عدالتی زبان کی حیثیت سے اردو زبان کا ارتقا' کے موضوع پر پڑھا۔ ان کے علاوہ جناب وی کے مہیشوری، جناب مشتاق احمد، ڈاکٹر افضل قادری، ضیاء حسن، پروفیسر شوکت اللہ خان اور ڈاکٹر کلیم اللہ نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے کی۔ سمینار میں مقتدر شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

نئی دھلی: ہمیں اردو کی ترقی کے لیے مثبت سوچ کے ساتھ کوشش کرنی ہوگی تبھی اردو کو اس کا مقام مل پائے گا۔ اردو کے فروغ میں ہماری تساہلی رکاوٹ بن رہی ہے۔ ہم اسکولوں میں اپنے بچوں کے داخلے کے وقت مادری زبان کے کالم میں 'اردو' کی جگہ 'سنسکرت' یا دوسری زبان لکھ دیتے ہیں۔ والدین کو اس سلسلے میں بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار 'ہندوستان میں اردو کی آئینی اور قانونی حیثیت' کے تیسرے اور آخری اجلاس میں صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہیں۔ قومی اردو کونسل کے فائنانس کمیٹی کے ممبر جناب احتشام عابدی نے اس موقعے پر کہا کہ عدالتوں میں اردو زبان اپنی لطافت کی وجہ سے زندہ ہے۔ اس اجلاس کا موضوع 'مرکزی/ریاستی قوانین اور قانونی مواد کی اردو میں دستیابی' تھا۔ اس سیشن میں جناب سید اقبال احمد، جناب ساجد علی، جناب سعود احمد اور جناب خلیل احمد نے مقالے پڑھے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ظفر محفوظ نعمانی نے کی۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے اس موقعے پر کہا کہ ہمیں اردو کو اپنے گھروں میں زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم کسی ایک غیر اردو داں کو اردو زبان سکھانے کی کوشش کریں گے تو یہ اردو کی بڑی خدمت ہوگی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے ہمیں مثبت سوچ اپنانے کی ضرورت ہے۔

اس سے قبل سمینار کے دوسرے دن کا پہلا اجلاس محترمہ ریتا وسشٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سیشن کا پہلا مقالہ پروفیسر منیر عالم نے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں اردو میں روزگار پیدا کرنے کے وسائل پر پرمغز گفتگو کی۔ سمینار کا دوسرا مقالہ ڈاکٹر محمد ظفر محفوظ نعمانی نے 'عدالت کے فیصلوں میں اردو زبان کی اہمیت' پر پڑھا۔ انھوں نے دستور ہند کی روشنی میں عدالتوں کے فیصلے پر گفتگو کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ عدالتوں میں اردو زبان کا خوب استعمال ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ زبان کے تعلق سے سپریم کورٹ کا فیصلہ قابل ستائش ہے جس میں لسانی اقلیتوں کی زبان کے تحفظ کی بات کی گئی ہے۔ مصباح الدین صدیقی نے اردو میں قانونی ادب کے فروغ کے لیے مرکزی حکومت کے اقدامات پر مقالہ پڑھا۔ 'انتظامیہ اور عدلیاتی و نیم عدلیاتی اداروں میں اردو کی معنویت' کے موضوع پر منعقدہ اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر ریتا وسشٹ نے اردو زبان کی اہمیت پر بڑی خوبصورت گفتگو کی۔ انھوں نے خالص اردو زبان میں تقریر کی اور بتایا کہ اردو ہمیں وراثت میں ملی۔ ہمارے والد نے اردو میں تعلیم حاصل کی اور میں بھی اردو زبان سے حد درجہ محبت رکھتی ہوں۔ انھوں نے مثال دے کر یہ بتانے کی کوشش کی کہ عدالتوں، پولیس محکموں یا دیگر اداروں میں بھلے ہی دیوناگری رسم الخط کا استعمال ہوتا ہو لیکن زیادہ تر الفاظ اردو کے ہوتے ہیں۔ انھوں نے ایسے اہم موضوع پر سمینار کرانے کے لیے قومی اردو کونسل کا شکریہ ادا کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے ہندوستان کے آئین کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک کا آئین دنیا کا سب سے بڑا جمہوری آئین ہے۔ ہمارے یہاں بنیادی حقوق سبھی کے لیے ہیں لیکن اقلیتوں کے لیے ہندوستانی آئین میں آرٹیکل 29 اور 30 کو بطور تحفہ دیا گیا ہے۔ سمینار کے اختتام پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے مندوبین اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس دو روزہ سمینار میں دہلی کے معززین کے علاوہ طلبا اور طالبات کی بڑی تعداد شریک تھی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 اور 30 اپریل 2017

تخلیقی ادب پینل میٹنگ کا انعقاد

نئی دہلی: آج کل نئی نسل میں اردو کا شوق کم ہوتا جارہا ہے۔ اس کے پیچھے کئی وجوہات ہیں۔ ان میں اول تو

بچوں کی اردو سے دوری ہے دوسری ابتدائی مرحلے میں اردو درس وتدریس کے بہتر انتظام کا فقدان ہے۔ کونسل کا مقصد ایسے بچوں کو تلاش کرنا ہے جن کے پاس تخلیقی قوت موجود ہے لیکن منظر عام پر آنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا ایسے اذہان تیار کرنا ہے جو اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں معاون ہوں۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں منعقدہ تخلیقی ادب پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس کے لیے کونسل کی طرف سے ملکی سطح پر اردو اسکولوں کے علاوہ ایسے اسکولوں میں جہاں اردو کی تعلیم نہیں دی جاتی ہے اردو کارنرز کھولے جائیں گے جہاں موجودہ نسل کو ہمارے تخلیق کار اردو کی اہمیت و افادیت سے روشناس کرائیں گے۔ تجربے کے طور پر شائستہ یوسف کی زیر نگرانی بنگلور کے دس اسکولوں میں بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دلچسپ پروگراموں کا انعقاد کیا گیا، جہاں خاطر خواہ نتائج سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج کی اس میٹنگ میں کئی اہم فیصلے لیے گئے جن میں پانچ نئی تصویری کتاب کی اشاعت بھی شامل ہے۔ پینل کے ممبران کے مطالبے کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے اردو رائٹرس کو مالی تعاون دیا جاتا ہے۔ کونسل ایسے پبلشرز سے سال میں ایک لاکھ قیمت تک کی کتابیں خریدنے کی کوشش کرے گی جو اردو کے فروغ کے لیے سنجیدہ ہیں تاہم مالی بحران کی وجہ سے اپنے اہداف کو پانے میں ناکام ہیں۔

میٹنگ کی صدارت معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ کونسل نئی نسل خصوصاً بچوں میں تخلیقی صلاحیتوں کی ہمت افزائی کے لیے انعامات اور توصیف دینے پر غور کر رہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ بچوں میں اردو کے تئیں دلچسپی پیدا کی جاسکے۔

انھوں نے مزید کہا کہ تخلیقی ادب کے فروغ کے لیے شاعری اور فکشن پر ورکشاپ انعقاد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر قاسم خورشید نے خصوصی طور پر فرمایا کہ اردو کے فروغ کے سلسلے میں بچوں کے تخلیقی ادب اور ان کے اردو میں دلچسپیوں کے فروغ کے لیے ایک ماڈیول کا تیار کیا جانا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ممبران نے کئی اہم تجاویز پیش کی جن پر سنجیدگی کے ساتھ غور وخوض کیا گیا۔

میٹنگ میں جناب رتن سنگھ، پروفیسر حسین الحق، پروفیسر گنگا پرشاد وِمل، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر انور ظہیر انصاری، جناب قاسم خورشید، جناب محسن خان، محترمہ شائستہ یوسف، محترمہ ترنم ریاض کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، ٹیکنکل اسسٹنٹ محترمہ آبگینہ عارف اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 مئی 2017

اردو ادب پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: فی الوقت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں 24 پینل ہیں۔ ان میں بالخصوص اردو ادب پینل کی کارکردگی کا محاسبہ کریں تو اسے اطمینان بخش کہا جاسکتا ہے۔ اگر اشاعتی پہلو سے جائزہ لیں تو مالی سال مارچ 2017 تک کونسل 107 نئی کتابیں مختلف موضوعات پر شائع کرچکی ہے جب کہ دوسو کے لگ بھگ ایسی کتابیں ہیں جن کا دوسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ اس حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کونسل کی سرگرمیاں کئی جہات کو محیط ہیں۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ اردو ادب پینل کی میٹنگ میں کہی۔ انھوں نے کہا کہ اس رفتار کو مزید بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ایسی نادر و نایاب کتابیں جو اردو قارئین سے دور ہوتی جارہی ہیں اسے بھی دوبارہ منظر عام پر لانا ہے۔

انھوں نے کہا کہ متن سے قاری کا رشتہ تبھی استوار ہوسکتا ہے جب کتابیں موجود ہوں۔ کتابوں کی عدم موجودگی میں یہ ممکن نہیں۔ پینل کی صدارت معروف تنقید نگار مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی کے سابق شیخ الجامعہ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی۔ انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت کونسل اس سلسلے میں کئی سطحوں پر کام کر رہی ہے۔ اس کے اشاعتی کام کی پیش رفت تشفی بخش ہے، جس کی تائید پینل کے تمام ممبران نے بھی کی۔ جس میں قدیم متن کی بازیافت اور غیر شائع شدہ متن کی اشاعت شامل ہے۔ اس موقع پر بہار اردو اکادمی کے سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری نے کہا کہ فیصلے تیزی سے اور تشفی بخش لیے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے ممبران نے بھی کئی اہم تجاویز پیش کی جن پر سنجیدگی کے ساتھ غور وخوض کیا گیا۔

میٹنگ میں پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر رئیس انور، پروفیسر مہ جبیں نجم غزال، پروفیسر شبنم حمید، ڈاکٹر نریش، ڈاکٹر سلیمہ بی کولور، کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، محمد انصر (ریسرچ اسسٹنٹ)، محمد شہاب الدین (ریسرچ اسسٹنٹ) اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 مئی 2017

جامع انگریزی-اردوڈکشنری میٹنگ

نئی دہلی: کلیم الدین احمد کی جامع انگریزی- اردو

ڈکشنری ایک بسیط اور وسیع کام ہے۔ اردو زبان میں لغت سازی کے میدان میں اب تک جتنے کام ہوئے ہیں، ان میں سے اسے ایک معرکۃ الآرا کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ اس پروجیکٹ کا خاکہ 1975 میں تیار ہوا تھا، جب یہ ادارہ ترقی اردو بیورو کی شکل میں تھا۔ اس کی پہلی جلد سنہ 1994 میں شائع ہوئی اور بالترتیب اس کی اور پانچ جلدیں منظر عام پر آگئیں۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقد جائزہ میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ کلیم الدین احمد کی ڈکشنری پر از سر نو کام کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ اس کی تکنیکی خامیوں کو درست کیا جا سکے۔ اس واسطے کونسل پچھلے سال سے ورکشاپ کی صورت میں ماہرین کی رائے لے رہی ہے اور اس حوالے سے اس میں بہت حد تک پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ جائزہ میٹنگ کی صدارت ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ کلیم الدین احمد کی ڈکشنری ہمارے لیے تاریخی اور علمی اثاثہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی روح سے چھیڑ چھاڑ ممکن نہیں۔ البتہ تکنیکی دقتوں کو نشان زد کرکے ماہرین کی رائے کی روشنی میں دور کیا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر تمام ماہرین نے ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کی رائے سے اتفاق کیا۔

اس میٹنگ میں پروفیسر اے آر فتیحی، پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر گوبند پرشاد، پروفیسر آر آر گیش، پروفیسر غضنفر، ڈاکٹر حسین ماجد، ڈاکٹر عبد الرشید، ڈاکٹر تنویر حسین، دوست محمد نبی خان، وسیم احمد، محمد صہیب، محمد جاوید احمد کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شہناز اختر، محترمہ مسرت جہاں اور ڈاکٹر شاہد اختر نے محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، بھی شرکت کی۔ پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 مئی 2017

ستیہ وتی کالج کے اردوطلبا سے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کا خطاب

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں ستیہ وتی کالج کے اردو طلبا اور اساتذہ کے ساتھ ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کے آغاز میں کونسل کے تعارف اور سرگرمیوں پر مبنی ایک پاور پوائنٹ پریزنٹیشن دکھایا گیا۔ اس کے بعد کونسل کے ڈائرکٹر نے طلبا اور اساتذہ کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ یہ خوش آئند قدم ہے کہ ستیہ وتی کالج کے طلبا آج یہاں موجود ہیں اور اردو کے اس ادارے میں ہماری کارکردگی دیکھنے آئے ہیں۔

ستیہ وتی کالج کے اساتذہ قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس بارے میں سوچا اور اپنے طلبا کو یہاں لے کر آئے۔

اس پروگرام میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو زبان وادب کی اہمیت پر پر مغز گفتگو کی اور مطالعہ کی عادت ڈالنے پر زور دیا۔ انھوں نے بچوں سے روزانہ کچھ دیر اردو کتابیں پڑھنے کی درخواست کی اور کہا کہ اگر آپ نے مطالعے کی عادت برقرار رکھی تو آپ کی زبان، رہن سہن، سوچ اور زندگی میں انقلابی طور پر تبدیلی آئے گی اور آپ کو زندگی میں کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ستیہ وتی کالج، شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر شیخ عقیل نے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کا تعارف کرایا اور انھیں اردو دنیا کی سب سے زیادہ فعال شخصیت بتایا۔ ڈاکٹر قمر الحسن اور ڈاکٹر ندیم احمد نے بھی اس موقع پر اظہار خیال کیا۔ کونسل کے ڈائرکٹر نے کونسل کی جانب سے شائع کردہ جامع انگریزی اردو لغت کا مکمل سیٹ اور کونسل کی کتابوں کا ایک سیٹ بھی طالب علموں کو تحفتاً پیش کیا۔

اس موقعے پر ستیہ وتی کالج کے اساتذہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، ڈاکٹر قمر الحسن، ڈاکٹر رئیسہ پروین، نسرین رئیس خان، ڈاکٹر سجاد مہدی حسین، پروین کمار، ڈاکٹر نعمان عالم، ڈاکٹر ندیم اور ڈاکٹر شبیر موجود تھے۔ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، ریسرچ آفیسر شاہنواز محمد خرم اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اجمل سعید اور شعیب رضا فاطمی بھی اس پروگرام میں موجود تھے۔ پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 18 اپریل 2017

طب یونانی سے متعلق کتابوں پر باضابطہ کام کرنے کی ضرورت: پروفیسر ارتضیٰ کریم

کونسل کے صدر دفتر میں طب یونانی پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: طب یونانی کو اردو میں مزید فروغ دینے اور اس پر باضابطہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ قومی اردو کونسل نے کہا کہ طب یونانی پر قومی کونسل بہتر کام کرسکتی ہے۔ کونسل کی جانب سے طب یونانی کے فروغ کے لیے کی جانے کے لیے ایک ایجنسی کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ کونسل کی مطبوعات زیادہ سے زیادہ کالجز اور یونیورسٹیز

کے طالب علموں تک آسانی سے پہنچ سکے۔

کے طبی پینل کا مقصد طبی تحقیقات سے اردو دنیا کو متعارف کرانا اور اس کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنا ہے۔ کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں منعقدہ ایک میٹنگ کے دوران کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے یہ باتیں کہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ رواں مالی سال میں قومی اردو کونسل کی زیادہ تعداد میں کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ کونسل کے لیے خوش آئند پہلو ہے۔ اس موقع پر پینل کے صدر پروفیسر ظل الرحمن

جانے والی کوششیں قابل ستائش ہیں۔

میٹنگ کے دوران ایک مختصر رپورٹ بھی پیش کی گئی، جس میں بتایا گیا کہ اس پینل کے تحت طب کی بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں، جس میں منافع الاعضا بھی شامل ہے۔ میٹنگ کے دوران کئی تجاویز سامنے آئیں جن پر فوراً عمل کرنے کی بات کہی گئی اور کچھ تجاویز پر از سر نو غور کرنے کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ اس میٹنگ میں یہ تجویز بھی سامنے آئی کہ کونسل کی مطبوعات کو دور دراز علاقوں تک لے

اس میٹنگ میں پروفیسر حکیم ظل الرحمن، جناب حامد احمد، جناب محمد علی مرزا، ڈاکٹر شبیر احمد، ڈاکٹر نازش، ڈاکٹر فضل اللہ قادری کے علاوہ کونسل پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، محترمہ ذیشان فاطمہ (ریسرچ اسسٹنٹ)، محترمہ شہناز اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 18 مئی 2017

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

دورِ جدید میں اردو کی اہمیت وافادیت

چنئی: شہر چنئی میں تمل ناڈو اردو رابطہ کمیٹی کے جشن سیمین کے موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے دوروزہ سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہماری غلط فہمی ہے کہ اردو ایک پسماندہ زبان ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو آج جدید ٹکنالوجی سے جڑ چکی ہے اور اردو کے تمام اخبارات اسی ٹکنالوجی کے ساتھ شائع ہورہے ہیں۔ انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل کے تحت اردو زبان عربی اور فارسی پڑھانے اور ڈی ٹی پی کے کئی کورسس چل رہے ہیں، ہمیں ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ملک العزیز صاحب نے مزید کہا کہ جب تک ہم اردو رسم الخط لکھنا پڑھنا نہیں سیکھیں گے، اردو زبان کی حفاظت نہیں ہوسکے گی۔ مہمان خصوصی مفسر قرآن حضرت مولانا سید منصور

احمد اسلم ندوی صاحب نے کہا کہ اردو زبان اتنی شیریں اور مکمل زبان ہے کہ اس زبان کی تشکیل کے بعد تین سو سال سے کوئی نئی زبان وجود میں نہیں آئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انبیا بھیجے سب کو اس علاقہ کی مادری زبان میں مبعوث فرمایا۔ مزید انھوں نے کہا کہ قوموں کی شناخت اور پہچان ان کی اپنی مادری زبان سے ہوتی ہے، اگر مادری زبان کو ترک کیا جائے تو وہ قوم تنزلی کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ گذشتہ دہائیوں میں اردو زبان میں ڈھائی سو سے زائد حدیث کی شروحات نیز پچاس سے زائد قرآن کریم کے تراجم لکھے گئے۔ آج ہندوستان کی ساری فلمیں اور سیریلیس کی زبان اردو ہے، اردو رابطہ کی زبان ہے، اردو عوام کی زبان ہے اس لیے اس کا خاتمہ ممکن نہیں۔ کانچی پورم ضلع کے ڈی آئی جی جناب نجم الہدیٰ صاحب نے کہا کہ ویسے اردو زبان کا تعلق اسلامی لٹریچر سے ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ہندو مسلم ایکتا اور بھائی چارے کی زبان ہے، اس لیے اس کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے۔

صدر جلسہ اے محمد اشرف نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو داں طبقہ کو اردو زبان زندہ رکھنے کے لیے ہر گھر میں اردو کا ایک شجر لگانا ہوگا۔ اس موقعے پر شہر چنئی سے نکلنے والا مشہور جریدہ 'ماہنامہ پیام سدرہ' کے ناشر جناب جمیل احمد صدیقی، مینیجنگ ایڈیٹر جناب احمد علی صدیقی اور ایڈیٹر ساجد حسین ندوی کو شہر چنئی میں اردو خدمات انجام دینے پر توصیفی اسناد عطا کی گئیں۔ نیز تمل ناڈو کے شہر وانمباڑی کے مشہور جریدہ 'نشان منزل' کے مدیر جناب پی ایس عبدالباری صاحب کو اردو رابطہ کمیٹی کی جانب سے 'نشان اردو' کا مؤقر ایوارڈ عطا کیا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 اپریل 2017

جنوبی ہند میں اردو نظم-1960 کے بعد

تروپتی: 29 اور 30 مارچ 2017 کو ایس وی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور یو جی سی کے اشتراک سے دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس سیمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد نثار احمد اور کنوینر ڈاکٹر امین اللہ، شعبۂ اردو، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی رہے۔ سیمینار کا افتتاح وائس چانسلر پروفیسر دامودرم نے شمع روشن کر کے کیا۔ ڈاکٹر سید اقبال خسرو قادری نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری، وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی، کرنول مہمان خصوصی تھے۔ پروفیسر سید سجاد حسین یونیورسٹی آف مدراس، چینائی اور پروفیسر ستار ساحر رجسٹرار ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول مہمانانِ اعزازی کی حیثیت سے شریک تھے۔ 'ڈاکٹر محسن جلگانوی-شخصیت اور شاعری' کتاب کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ اجلاس میں پروفیسر قاسم علی خان بحیثیت مہمان خصوصی شریک رہے۔

اس سیمینار میں آندھرا پردیش، تلنگانہ، تمل ناڈو اور کرناٹک و کیرلا سے مقالہ نگاروں نے شرکت کی اور نظم گو شعرا پر اپنے مقالات پیش کیے۔ تقریباً پینتیس 35 مقالات پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر قاضی حبیب احمد (مدراس)، ڈاکٹر محسن جلگانوی (حیدرآباد)، ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم (حیدرآباد)، ڈاکٹر سلمان عابد (حیدرآباد)، ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری، ڈاکٹر فاروق باشا عمری (رائے چوٹی)، ڈاکٹر محمد یاسر (تمل ناڈو)، ڈاکٹر غضنفر اقبال (گلبرگہ)، شکیل احمد شکیل (کڈپہ)، ڈاکٹر عطا اللہ سنجری (کیرالا)، ڈاکٹر غفار صاحب (کیرالا)، ستار فیضی (کڈپہ) ڈاکٹر امتیاز (تروپتی)، ڈاکٹر سعید الدین (تمل ناڈو)، محمود شاہد (کڈپہ)، ڈاکٹر عبدالخالق (حیدرآباد)، ڈاکٹر کلیم اللہ (تمل ناڈو)، منظور دکنی (گلبرگہ) وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔

سیمینار میں محبانِ اردو کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ ڈاکٹر محمد نثار احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد امین اللہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد نثار احمد، شعبۂ اردو، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی، 20 اپریل 2017

اردو اور ہندوستانیت

نجیب آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام مدرسہ جامعہ نور الاسلام للبنات نجیب آباد کی جانب سے اردو اور ہندوستانیت کے عنوان سے منعقدہ قومی سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ اردو ہندوستانیت اور ہندوستانیت اردو ہے۔ ہر ایک صنف ادب میں ہندوستانیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے اردو بچوں کو پڑھانے پر زور دیا گیا۔ کانہا رائیل سیلوٹ میں منعقدہ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی اردو اکادمی اتراکھنڈ کے صدر ڈاکٹر افضل منگلوری نے کہا کہ اردو کو فروغ دینا ہی ہندوستانیت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندوستانی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تہذیب ہے۔ جھلملاتے ہوئے تاروں کی طرح ہے جو ہر آنگن میں اپنی خوشبو بکھیر رہی ہے۔ انھوں نے اردو رسائل پڑھنے کا اپنے اندر ذوق پیدا کرنے اور بچوں کو اردو پڑھانے پر زور دیا۔ انھوں نے صاف طور پر کہا کہ اردو ایک تہذیب کا نام ہے۔ صحافی اسد رضا نے اپنے مختصر خطاب میں کہا کہ حضرت امیر خسرو سے لے کر آج تک اردو میں ہندوستانیت بکھری پڑی ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ بچوں کو اردو کی اعلیٰ تعلیم دلائیں۔ صحافی حقانی القاسمی نے کہا کہ علامہ تاجور نجیب آبادی ارو اور ہندوستانیت کے روشن چراغ تھے۔ اردو کے فروغ میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو نہ اسلامی اور نہ مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ یہ خالص ہندوستانی زبان ہے۔ مہتاب خاں چاند کی نظامت میں منعقدہ سیمینار میں چیئرمین معظم خاں، مسلم فنڈ کے ایم ڈی آئی ایچ ذکی، ڈاکٹر شیخ نگینوی، انجینئر انور سیفی، علینا عطرت، ڈاکٹر آفتاب نعمانی، ڈاکٹر اسلم صدیقی، ڈاکٹر قدسیہ انجم، ڈاکٹر وسیم اقبال، ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی، گلشن جہاں، ثروت عثمانی، محمد انور سید احمد خاں وغیرہ نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔

اس موقعے پر علینہ عطرت کو نظر سجاد ایوارڈ، ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی کو مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر سید احمد خاں کو مولانا اکبر شاہ خاں، ڈاکٹر اسد رضا کو علامہ تاجور نجیب آبادی، انجینئر انور سیفی کو دشینت تیاگی، ڈاکٹر شمیم احمد کو شکیل رحمانی، حقانی القاسمی کو اختر الایمان، مہتاب چاند کو مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 مئی 2017

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

تعلیم معاشرے کی طاقت ہوتی ہے: پرکاش جاوڈیکر

پونے میں ایک سیمینار میں مرکزی وزیر کا خطاب

ممبئی / پنے: مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پرکاش جاوڈیکر نے پونے میں کہا کہ تعلیم ایسی طاقت ہے جو کہ ایک طالب علم کی ہی نہیں بلکہ گھر، معاشرے کی طاقت بنتی ہے اور ملک کی تقدیر بدل دیتی ہے، اس کی طاقت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ایک غریب کا بیٹا مقابلہ جاتی امتحانات میں اول پوزیشن حاصل کرلیتا ہے۔ چاہے وہ رکشہ ڈرائیور کا بیٹا ہو یا کمپاؤنڈر کا۔ وزیر موصوف مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور انجمن اسلام ممبئی کے زیر اہتمام انجمن اسلام دوست محمد پیر محمد کیمپس پونے میں تعلیم و تربیت کے عنوان سے منعقد کیے جانے والے ایک اجلاس سے خطاب کررہے تھے۔ پونے میں انجمن اسلام کے خوبصورت وسیع احاطے میں ہونے والے مذکورہ پروگرام میں مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے اور انھوں نے مزید کہا کہ جنگ آزادی کی جدوجہد کے دوران ہمارے قومی رہنماؤں نے ملک کے طول و عرض میں تعلیمی اداروں کی بنیاد ڈالی تاکہ عوام کو بیدار کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ لوکمانیہ تلک، گوپال گوکھلے، سرسید احمد جیسے رہنماؤں نے تعلیمی ادارے قائم کیے جس نے جدوجہد آزادی کا رخ ہی بدل ڈالا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ معاشرے میں تعلیمی بیداری بڑھائی جائے۔ اس موقعے پر انھوں نے مسلم نوجوانوں کی تعلیمی پسماندگی پر تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ ان کا تناسب دیگر لوگوں سے نو فیصد کم ہے اور نیو انڈیا کے نعرے کے بعد اب ہمارا ایک ہی مقصد اچھی تعلیم اور سب کو تعلیم ہے۔ بس انھیں پر عزم ہوکر قدم آگے بڑھانا ہوگا اور یہی ملک و قوم کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ ڈاکٹر ظہیر قاضی نے کہا کہ مذکورہ پروگرام تعلیم و تربیت کا مقصد امت کے نوجوانوں کو یہ باور کرانا ہے کہ تعلیم سے ہی ترقی ممکن ہے اور اس قسم کے پروگرام منعقد کیے جائیں گے۔ این ایم آئی ایم ایس کے چانسلر امریش پٹیل نے تعلیم کو دیہات تک لے جانے کی وکالت کی۔ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی چانسلر ظفر سریش والا نے بھی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا جبکہ ایس ای پی آئی کے ایس رمن، ایکسیس بینک کے ایکزیکیٹو ڈائرکٹر راجیش ڈھابا اور چھتیس گڑھ وقف بورڈ کے چیئرمین ممبر اور مرکزی وقف کونسل کے ممبر مولانا سلیم اشرفی صاحب بھی مہمان اعزازی کے طور پر موجود تھے۔ ایم سی ای کے چیئرمین پی اے انعامدار اور شہر کے معززین اور انجمن کے عہدیداران بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 مئی 2017

جامعہ عثمانیہ کی صد سالہ تقاریب

حیدر آباد: صدر جمہوریہ پرنب مکھرجی نے زور دیتے ہوئے کہا کہ دانشوروں اور تحقیق کاروں کے لیے یونیورسٹیز ایک بہترین پلیٹ فارم ثابت ہوں گی کیونکہ یہاں سے نئی ایجادات اور نئی ٹکنالوجی کو متعارف کیا جاسکتا ہے۔ صدر جمہوریہ نے کہا کہ صنعتی ترقی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یونیورسٹیز کو ریسرچ کے میدان میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے ملک کے سرکردہ تعلیمی اداروں میں سے ایک عثمانیہ یونیورسٹی کی صدی تقاریب کے آغاز کے موقعے پر خطاب کرتے ہوئے یہ بات کہی۔ سابق ریاست حیدرآباد کے آخری فرمانروا نواب میر عثمان علی خان بہادر 1917 میں ملک کی پہلی اردو یونیورسٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ اس تقریب میں صدر جمہوریہ کے علاوہ گورنر ای ایس ایل نرسمہن، تلنگانہ کے وزیر اعلیٰ کے چندر شیکھر راؤ، نائب وزیر اعلیٰ کڈیم سری ہری، جی ایچ ایم سی کے میئر بی رام موہن، یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رام چندرن اور دوسروں نے شرکت کی۔ افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پرنب مکھرجی نے کہا کہ یونیورسٹیز میں ریسرچ کے کام پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی صد سالہ تقاریب میں شرکت کرتے ہوئے وہ کافی فخر محسوس کررہے ہیں۔ 100 سال قبل آج ہی کے دن ایک وژن کے تحت عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ان 100 برسوں میں دنیا بھر میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ملک و ریاست میں بھی کئی تبدیلیاں دیکھی گئیں۔ صدر جمہوریہ نے بانی جامعہ عثمانیہ میر عثمان علی خاں کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ کافی دوراندیشی کے تحت اس یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ پرنب مکھرجی نے کہا کہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں کافی انقلابی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔ ملک کی یونیورسٹیز کو دنیا بھر کے لیے مثالی بنانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ ان کی یہی آرزو رہی کہ ہندوستان کی یونیورسٹیز دنیا بھر میں سب سے آگے رہیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی یونیورسٹیز نئی ایجادات میں پیچھے چل رہی ہیں۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے طلبہ کو ریسرچ کے کام میں مصروف کرنا چاہیے۔ ریسرچ کے کام میں زیادہ ترقی کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی یونیورسٹیز آئی آئی ٹیز کی طرز پر ہونی چاہئیں۔ آئی آئی ٹیز کی تعلیم حاصل کرنے والے دنیا کی مارکیٹ میں لیڈر بنے ہوئے ہیں۔ دنیا بھر کی ملٹی نیشنل کمپنیز نے آئی آئی ٹی تعلیم یافتہ افراد ہی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ پرنب مکھرجی نے کہا کہ یونیورسٹیز کو ترقی دینے کی ذمے داری حکومت پر ہی عائد نہیں ہوتی۔ حکومت کی جانب سے ہی مکمل فنڈ دیا جانا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے صنعتی طبقے کو بھی آگے آنے کی ضرورت ہے کیونکہ صنعتوں کو بھی ریسرچ اور نئی ٹکنالوجی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے لیے صنعتی طبقہ اور مالیاتی اداروں کو مل کر یونیورسٹیز کو آگے بڑھانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ صنعتوں کی جانب سے یونیورسٹیز کی حوصلہ افزائی کا عمل جاری رہنا چاہیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اپریل 2017

محمد قلی قطب شاہ لکچر

حیدر آباد: نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری نے حیدرآباد دکن کی شاندار تاریخ، عظیم ورثہ اور ثقافت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا اس علاقے کی رواداری، بقائے باہم، شمولیت پسندی اور ثقافتی میل جول اس کی انفرادیت کی علامت ہے اور یہ آج بھی ملک کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نائب صدر جمہوریہ نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پہلا محمد قلی قطب شاہ یادگاری خطبہ بعنوان 'ایک علاقائی ورثہ پیش کہ موجودہ کے اعتبار سے متمول تاریخ کا کرتے ہوئے کہا حیدرآباد صلاحیتوں اکیسویں صدی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنا چکا ہے جسے آگے جاری رکھنا ہوگا۔ انھوں نے حیدرآباد کی تہذیبی و ثقافتی روایات کی اہمیت

پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس ضمن میں پورے ملک کو حیدرآباد کی پیروی کرنے کی ضرورت ہے۔ حامد انصاری نے قلی قطب شاہ کی مذہبی رواداری، ہندو مسلم شہریوں سے یکساں برتاؤ، انسان دوستی، سخاوت، معاف کرنے کی صلاحیت اور علم و ادب کی قدردانی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ قلی قطب شاہ نے اپنی بے پناہ مدبرانہ صلاحیتوں سے کام لے کر شہر حیدرآباد کو ارضی جنت بنا دیا تھا۔ وہ تلسی داس، سورداس اور میرابائی کا ہم عصر تھا۔ اس کی شاعری اس کی شخصیت کا پرتو ہے اور یہ تمام خصوصیات اس کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے 91-1590 میں حیدرآباد بسایا تھا۔ اس موقعے پر تلنگانہ و آندھرا پردیش کے گورنر ای ایس ایل نرسمہن اور تلنگانہ کے نائب وزیر اعلیٰ محمد محمود علی بھی بحیثیت مہمانان اعزازی موجود تھے۔ جلسے کی ابتدا میں اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے معزز مہمانان اور حاضرین کا استقبال کیا اور قلی قطب شاہ کی سیاسی، ادبی اور علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ جلسے کی نظامت میڈیا کنسلٹنٹ میر ایوب علی خان نے بحسن وخوبی انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اپریل 2017

مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور کی افسران کے ساتھ میٹنگ

نئی دھلی: مرکزی وزارت برائے اقلیتی امور کے تحت اقلیتوں کے لیے ہونے والے بنیادی کام بہت جلد زمین پر بھی نظر آنے لگیں گے۔ اقلیتی وزارت کی سرگرمیاں جس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہیں اس سے لگتا ہے کہ اقلیتی طبقے کو اس سے فائدہ بھی حاصل ہوگا۔ مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور مختار عباس نقوی نے متعلقہ افسران کے ساتھ جائزہ میٹنگ کرتے ہوئے رپورٹ کا جائزہ لیا اور کہا کہ جو کام ہوگئے ہیں وہ اب نظر بھی آنے چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہم نے مجاہد آزادی بیگم حضرت محل کے نام سے اقلیتی طبقے کی بچیوں کے لیے جو اسکالرشپ شروع کی تھی وہ اس سال تقریباً 20 لاکھ بچیوں میں تقسیم کردی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا مقصد ہے کہ اقلیتی طبقے کی بچیاں مین اسٹریم میں آئیں

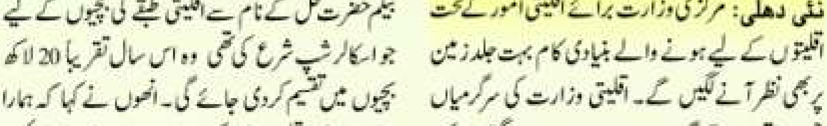

اور زیادہ سے زیادہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں نیز اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکیں مسٹر نقوی نے کہا کہ دوسری خوش خبری یہ ہے کہ ہم اگلے مہینے تقریباً 30 غریب نواز اسکل ڈیولپمنٹ کے تحت سینٹر کھولنے جارہے ہیں جن میں اقلیتوں کی ٹریننگ کا کام کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ابتدائی مرحلہ میں 30 سینٹر تیار ہیں لیکن مستقبل میں ہم اس قسم کے سینٹر سیکڑوں کی تعداد میں کھولیں گے۔

مسٹر نقوی نے کہا کہ تیسری خوش خبری یہ ہے کہ ملٹی سیکٹورل ڈیولپمنٹ پلان (ایم ایس ڈی پی) کے تحت جو اسکول کی عمارتیں تعمیر ہورہی ہیں ان میں سے تقریباً 650 اسکولی عمارتیں بن کر تیار ہوچکی ہیں چنانچہ بہت جلد ان عمارتوں کو تعلیمی سرگرمیوں کے لیے سونپ دیا جائے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اپریل 2017

ہندوستان میں اردو: آج اور کل

نئی دھلی: اردو زبان کے تعلق سے یہ بات جان لینی ضروری ہے کہ 20 ویں صدی کے سورج کے طلوع ہوتے ہی اردو کا ستارہ چمکنے لگا۔ تقریباً 5 اردو چینل 24 گھنٹے خبروں کے منظر عام پر آئے۔ ہندی اور اردو صحافت کے درمیان کی دوری سمٹ گئی۔ اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جاگرن جیسے نامور ہندی اخبار کے گھرانے نے اردو کے انقلاب کو لاکر ہندی، اردو کے درمیان قائم ہوچکے خلا کو پر کیا اور نہ صرف دہلی بلکہ دیگر ریاستوں سے بھی اسے شروع کیا اور لوگوں کی معلومات کا آئینہ بنا کر پیش کیا۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد یونیورسٹی جودھ پور کے وائس چانسلر پروفیسر اختر الواسع نے فاؤنڈیشن فار ایکنو سوشل ٹرانسفارمیشن (فاسٹ) کے زیر اہتمام بہ اشتراک انجمن ترقی اردو (ہند) پانچویں ڈاکٹر اے ایم خسرو میموریل لیکچر بعنوان 'ہندوستان میں اردو: آج اور کل' کے دوران کیا۔ اس خطبے کی صدارت پروفیسر خواجہ محمد شاہد نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر جاوید رحمانی نے انجام دیے۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ یہ کام اردو والوں نے نہیں بلکہ کارپوریٹ گھرانوں نے کیے، اس طریقے سے یہ بات ثابت ہے کہ اردو گھاٹے کا سودہ نہیں ہے۔ اختر الواسع نے اردو کے حوالے سے کہا کہ اردو کو اردو کی جنم بھومی سے سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ بہار میں لوگوں نے جدوجہد کی اور وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا، اردو کے تئیں جن علاقوں کو غرور تھا وہاں اردو کی صورت حال کل بھی خراب تھی اور آج بھی خراب ہے۔ اردو کی بدحالی کے لیے حکومتیں نہیں بلکہ ہم اردو والے ہی ذمے دار ہیں۔ زبانیں اپنے بولنے والوں کی وجہ سے زندہ رہتی ہیں، حکومتوں کی مہربانیوں سے نہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2017

جشن بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام عالمی مشاعرہ کا منظر

جشن بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام عالمی مشاعرہ

نئی دہلی: اردو زبان مغل لشکر سے شروع ہوکر عوام کی زبان بنی۔ میرا یہ ماننا ہے کہ جس زبان کے ذریعے انسان نظم اور نثر دونوں ہی میں اپنا دکھ درد بیان کردے وہ زبان اردو ہے اور ایسی زبان کبھی ختم نہیں ہوسکتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار منی پور کی گورنر ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے بین الاقوامی شہرت یافتہ جشن بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقد عالمی مشاعرہ کے دوران کیا۔ نئی دہلی کے ڈی پی ایس کمپاؤنڈ میں منعقد اس مشاعرہ کی صدارت اردو کے معروف شاعر اور نقاد پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض منصور عثمانی نے انجام دیے۔ اپنے خطاب میں ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے کہا کہ آج وہ دور ہے کہ جس میں خواتین کو بہت آزادی ہے اور مشاعروں میں خواتین کی کثیر تعداد نظر آجاتی ہے ایک دور وہ بھی گزرا ہے کہ جب خواتین کو مشاعروں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مبارکباد کی مستحق ہیں کامنا پرساد کہ جنھوں نے میر کے اس اجڑے دیار کو بہاراں میں تبدیل کردیا ہے۔ اردو کے مشہور و معروف شاعر اور نقاد، پدم شری پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے اپنے خطاب میں اردو زبان کے تعلق سے سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو وہ زبان ہے کہ جس میں محبت کے سوائے کچھ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے ملک کے حالات کا ذکر کیے بنا ہی کہا کہ لوگوں کو اردو پڑھا دو اس کے بعد ملک میں امن و امان خود قائم ہوجائے گا۔ اردو پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے کہا کہ لوگ غلط کہتے ہیں کہ اردو سرکاری زبان رہی ہے بلکہ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اردو اس ملک میں کبھی سرکاری زبان نہیں رہی البتہ یہ آپ کی اور ہماری زبان ضرور رہی ہے عام زبان رہی ہے۔ فلمی دنیا میں اپنی زبان کے ذریعے بہترین اردو داں کا مقام رکھنے والے اداکار شتروگھن سنہا نے کہا کہ اردو زبان کا ملک کی آزادی میں اہم کردار رہا ہے اور بلاشبہ دلوں کو جوڑنے والی کوئی زبان ہے تو اس کا نام اردو ہی ہے۔ جشن بہار ٹرسٹ کی بانی کامنا پرساد نے مشاعرہ کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ یہ ٹرسٹ ملک میں امن و امان اور یکجہتی کی بات کرتا ہے۔ جہاں تک سوال اردو کا ہے تو اس نے ہمیشہ محبت کی بات کی ہے اور ہر طرح کی ناانصافی کے خلاف پرچم حق بلند کیا ہے۔ مشاعرہ میں قومی و بین الاقوامی شعراء نے کلام پیش کیا ان میں باصر کاظمی (یو کے)، جاوید دانش (کنیڈا)، پروفیسر سویامنی (جاپان)، ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ (یو ایس اے)، عزیز نبیل (قطر)، شاہجہاں جعفری (کویت)، ہندوستانی شعرائے کرام میں جاوید اختر (ممبئی)، منصور عثمانی (مراد آباد)، نصرت مہدی (بھوپال)، ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی (میرٹھ)، ڈاکٹر نسیم نکہت (لکھنؤ)، عقیل نعمانی (رامپور)، آلوک شریواستو (دہلی)، حسین حیدری (ممبئی) اور مینو بخشی (دہلی) کے نام قابل ذکر ہیں۔ مشاعرہ میں پارلیمنٹ کی سابق اسپیکر میرا کمار، جموں و کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ، سابق وزیر اتر پردیش سرکار ڈاکٹر معراج الدین، بہار سرکار کے سابق وزیر شکیل الزماں انصاری، ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ کے او ایس ڈی بدر الدین خان، ریختہ کے بانی سنجیو صراف، این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم، آر این آئی کے ڈائرکٹر ایس ایم خان، آصف اعظمی، حسن آرا ٹرسٹ کے ڈاکٹر محسن ولی، کمال امروہوی کے علاوہ علم و ادب سے تعلق رکھنے والی مختلف شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 اپریل 2017

عربی زبان وادب سے متعلق ہفت روزہ تقریبات

نئی دہلی: 16 اپریل بروز اتوار شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، مرکز عبداللہ بن عبدالعزیز برائے فروغ عربی زبان، سعودی کلچرل ہاؤس، نئی دہلی اور کل ہند انجمن اساتذہ و علما عربی زبان کے باہمی اشتراک سے عربی زبان وادب سے متعلق اہم تقریبات کا افتتاح عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے سعودی سفیر ڈاکٹر سعود بن محمد الساطی نے شرکت کی۔ پروگرام کے کنوینر شعبۂ عربی کے استاذ پروفیسر حبیب اللہ خان نے اپنے افتتاحی کلمات میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر، سعودی سفیر، بین الاقوامی مرکز عبداللہ بن عبدالعزیز برائے فروغ عربی زبان کے جنرل سکریٹری اور مختلف عرب سفارت خانوں سے تشریف لائے سفارت کاروں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پروفیسر محمد ایوب ندوی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ عربی زبان کی تدریس جامعہ میں اول دن سے جاری ہے اور آج جامعہ کا شعبہ عربی ملک کے ممتاز ترین شعبوں میں سے ایک ہے اور سعودی عرب سے ہمارا علمی و ادبی تعلق ایک نئی بلندی کو چھو رہا ہے۔ شاہ عبداللہ بین الاقوامی مرکز برائے فروغ عربی زبان کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ صالح الوشمی نے اپنے خطاب میں کہا کہ عربی زبان ایک ایسا رابطہ ہے جو تمام مسلمانوں کو باہم مربوط کردیتا ہے۔ یہ قرآن کریم کی زبان ہے، عربی زبان ایک عظیم تہذیبی و ثقافتی سرمایہ رکھتی ہے۔ کل ہند انجمن اساتذہ و علماء عربی زبان کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہندوستان اور عرب دنیا کے درمیان علمی و ادبی تعلق بہت قدیم ہے، اس کی مظہر وہ کتابیں اور مخطوطات ہیں جو ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں، عربی زبان سے ہندوستان کی محبت کی مثال 47 یونیورسٹیز اور ہزاروں وہ دینی درسگاہیں ہیں جہاں عربی زبان وادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے کہا کہ عربوں کا ہندوستان سے تعلق بہت قدیم ہے اس کے دلائل ہم ان بہت سارے الفاظ میں پاسکتے ہیں جو دونوں زبانوں نے ایک دوسرے سے لیے ہیں۔

جامعہ میں جاری ہفت روزہ عربی زبان تقریبات کے دوسرے دن تعلیمی احاطہ میں ہندوستان اور عرب کے مشترکہ ثقافتی و تہذیبی ورثہ کی نمائش کا انعقاد کیا گیا۔ اس نمائش میں قرآن کریم کے نادر نسخے، عربی زبان وادب کے قیمتی مخطوطات، مختلف ہندوستانی یونیورسٹیز کے اساتذہ اور مشہور ہندوستانی علماء کی مطبوعات، نیز شاہ عبداللہ بین الاقوامی مرکز برائے فروغ عربی زبان، سعودی کلچرل ہاؤس کی لائبریری کی مطبوعات نمائش میں رکھی گئی، شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سعودی عرب سے متعلق پیش کیے گئے پی ایچ ڈی تھیسس بھی موجود تھے، اس نمائش میں خطاطی کے نمونے اور عربی زبان سے متعلق دنیا کے مشہور غیر مسلم مفکرین کے اقوال بھی نمائش میں رکھے گئے۔

بین الاقوامی مرکز شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز برائے فروغ

عربی زبان، شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، سعودی کلچرل ہاؤس، کل ہند انجمن اساتذہ وعلما، عربی زبان کے باہمی اشتراک سے عربی زبان وادب سے متعلق اب تک کی سب سے اہم اور غیر معمولی ہفت روزہ تقریبات سعودی سفیر ڈاکٹر سعود بن محمد الساطی، سعودی کلچرل اتاشی، ڈاکٹر عبداللہ صالح الشتوی اور سعودی جامعات کے اساتذہ اور عرب سفارت کاروں کی موجودگی میں اختتام پذیر ہوگئی۔ بین الاقوامی مرکز شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز برائے فروغ عربی زبان کا یہ قدم انتہائی مبارک رہا۔ پروگرام کے کنوینر نے مرکز عبداللہ برائے فروغ عربی زبان، سعودی کلچرل، ہاؤس، سعودی سفارت خانہ، کل ہند، انجمن اساتذہ وعلما عربی زبان وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ وطلبہ ریسرچ اسکالرس اور کانفرنس کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ سعودی سفیر سعود بن محمد الساطی نے اپنے خطاب میں خادم الحرمین الشریفین کی جانب سے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ اس پروگرام کے دوران عربی زبان کے تقریری مقابلہ میں پورے ملک سے ایک سو دس شریک طلبہ کے درمیان سے بیس طلبہ کو نقد انعامات، یادگاری شیلڈ اور اسناد سے نوازا گیا۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، 17 اپریل و روزنامہ انقلاب 18 اپریل 2017

دھلی

طریقہ تدریس برائے عربی اساتذہ

نئی دھلی: کسی بھی زبان کو سکھانے والا سب سے کامیاب معلم وہ ہے جو عصری ضرورتوں اور کلاس کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اپنے تجربات پیش کرے۔ زبان سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ اہل زبان اس کو کس طرح استعمال کرتے ہیں، مسلسل تجربات، اور مسلسل پڑھنے اور سننے سے یہ متعین ہوجاتا ہے کہ اہل زبان اس لفظ کو کس معنی میں اور کس کیفیت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ورکشاپ کے ڈائرکٹر اور آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان استاذ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ پہلے زبان سیکھنی ہوگی، پھر اس کے اسالیب کو سمجھنا ہوگا۔ عربی زبان وادب کو محض فن، تاریخ کے ایک ورق یا کتاب کے ایک سبق کے طور پر نہ پڑھایا جائے بلکہ اس کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے سکھایا اور پڑھایا جائے۔ اختتامی تقریب کے مہمان خصوصی سعودی کلچرل اتاشی کے ذمہ دار ڈاکٹر حمد بن مفرح بن عویض الشعیبی نے اپنے خطاب میں کہا کہ عربی زبان وادب دنیا کی سب سے افضل زبان ہے، یہ قرآن، حدیث، فکر اسلامی اور جنت کی زبان ہے، عالم عربی کے وسیع رقبہ کے مابین یہ زبان نقطۂ اتصال کا کام دیتی ہے۔ آج عالمی سطح پر اس زبان کی اہمیت تسلیم کی جارہی ہے، حکومتی سطح پر اس کی تعلیم کا انتظام کیا جارہا ہے، یہ ورک شاپ بھی اسی کوشش کا حصہ تھی۔ اختتامی تقریب کی نظامت سمینار کے کنوینر وصدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی پروفیسر ولی اختر نے کی اور کلمات تشکر شعبہ کے استاذ ڈاکٹر نعیم الحسن اثری نے ادا کیے۔ اس موقعے پر ورکشاپ کے شرکا کو ورکشاپ کے ٹرینر شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی ریاض میں لسانیات کے پروفیسر ڈاکٹر مطیر بن حسین المالکی نے اسناد سے نوازا۔ اس سات روزہ ورکشاپ میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ وریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 17 اپریل 2017

سرسید اور قومی یکجہتی

نئی دھلی: ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں محبت، رواداری اور قومی یکجہتی کی راہ میں سنجیدہ اور مثبت پہل کی اشد ضرورت ہے۔ ہندوستان کثرت میں وحدت کا علم بردار رہا ہے اور بھائی چارگی، مساوات اور عدم تشدد اس کی اصل روح ہے۔ اس کی روح سے جدا کرنے کی کوئی بھی کوشش یہاں کے پرامن ماحول کے لیے گھاتک ثابت ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار معروف گاندھیائی فلاسفر اور مورخ وی کے برنیوال نے سرسید احمد خاں کے دو سو سالہ جشن کو معنون سمپوزیم بعنوان 'سرسید اور قومی یکجہتی' میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ سمپوزیم کا اہتمام معروف سماجی وثقافتی تنظیم آئیڈیا کمیونی کیشنز نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے اشتراک سے کیا تھا۔ سمپوزیم کی صدارت یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈائرکٹر پرفیسر عبدالرحیم قدوائی نے کی۔ سابق مرکزی وزیر عارف محمد خاں، ڈائرکٹر جنرل آر این آئی ایس ایم خاں، ڈی ڈی اسٹاف ایسوسی ایشن کے صدر پرم یادو، اردو اکیڈمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر راحت ابرار نے مہمان خصوصی اور انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر فاروق اور سماجی کارکن کلیم الحفیظ نے مہمانان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ تعارفی کلمات آئیڈیا کمیونی کیشنز کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے اور کلمات تشکر انجمن کے جنرل سکریٹری اطہر فاروقی نے ادا کیے۔ اس موقعے پر جہاں ایک طرف وی کے برنیوال کے تحریر کردہ ہندی رسالہ 'سرسید، مسلم نوجاگرن کی مشعل' اور ڈاکٹر راحت ابرار کی کتاب 'سرسید اور ان کے معاصرین کا اجرا عمل میں آیا، وہیں آئیڈیا کمیونی کیشنز کے ورکنگ چیئرمین پروفیسر فاروق کے ہاتھوں سرسید مشن، تعلیم اور رواداری کے میدانوں میں نمایاں خدمات کے لیے وی کے برنیوال، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، ڈاکٹر راحت ابرار، سینئر علیگ و شاعر ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ (امریکہ) اور شاعر عزیز نبیل (قطر)، سرسید مشن فار انڈیا، فاطمہ اکیڈمی اور خدائی خدمت گار تنظیم کی خدمت میں لوح اعزاز وسپاس پیش کی گئیں۔ اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے کہا کہ سرسید کو اس سے بہتر خراج عقیدت بھلا اور کیا ہوگا کہ علیگ برادری سرسید کے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر کے لیے سرگرم عمل ہوجائے۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 17 اپریل 2017

فارسی زبان سرٹیفکیٹ کورس کا آغاز

نئی دھلی: ہندوستان اور ایران کے رشتے ایک یا دو سال نہیں بلکہ ہزاروں سال پرانے ہیں جس کی سب سے

اہم دلیل فارسی زبان کا 800 سال تک سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے ہندوستانی ثقافتی شعبہ میں فارسی زبان کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ ان خیالات کا اظہار خانہ فرہنگ اسلامی جمہوری ایران نئی دہلی کے رائزن ڈاکٹر علی دہگائی نے خانہ فرہنگ میں فارسی زبان کے سرٹیفکیٹ کورس کے لیے شروع کیے جانے والے نئے سیشن کی افتتاحی تقریب کے دوران کیا۔ فارسی سرٹیفکیٹ کورس کے نئے سیشن کا آغاز اور فارسی سرٹیفکیٹ کی تقسیم کے موقعے پر انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں کے لیے دیگر زبانوں کے مقابل فارسی سیکھنا زیادہ آسان ہے کیونکہ آپ لوگ جو زبان بولتے ہیں اس میں بہت کچھ فارسی کا ہی ہے۔ اتنا ہی نہیں تاریخ ہند کا مطالعہ بھی بنا فارسی زبان کے جانے نامکمل ہے۔ افتتاحی تقریب کی نظامت فارسی زبان کی کلاس کے کوآرڈینیٹر سید علی ظہیر نقوی نے کی جبکہ ڈاکٹر علی دہگائی کی تقریر کا ترجمہ مہدی باقر نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اپریل 2017

اتر پردیش:

داغ دہلوی اور رامپور

رامپور: ریاستی عہد کے معروف و مقبول تاریخی کتب خانے رامپور رضا لائبریری میں نئے ڈائرکٹر پروفیسر سید حسن عباس کی تعیناتی کے بعد علمی اور ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری ہے جس کے تحت لائبریری کے رنگ محل کی عمارت 'خیابان رضا' کے آڈیٹوریم میں داغ دہلوی اور رامپور کے عنوان کے تحت الٰہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر علی احمد فاطمی کے توسیعی خطبہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس علمی اجلاس کی صدارت معروف ادیب و محقق ڈاکٹر شمس بدایونی نے فرمائی۔ توسیعی خطبہ کے انعقاد کی ضرورت کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے استقبالیہ خطاب میں لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر سید حسن عباس نے رامپور سے نواب مرزا داغ دہلوی کے گہرے تعلق کا ذکر کیا اور بتایا کہ استاد داغ دہلوی 24 برس سے زیادہ عرصہ رامپور میں مقیم رہے۔ اپنے توسیعی خطبے میں پروفیسر علی احمد فاطمی نے استاد داغ کو انفرادی رنگ و آہنگ کا بانکا جیالا بتاتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں رامپور کے دوران قیام نکھار آیا اور رچاؤ پیدا ہوا۔ ڈاکٹر شمس بدایونی نے اپنے صدارتی خطاب کے دوران داغ دہلوی کے بارے میں مختلف حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ وہ رامپور کے لہجہ اور طرز اظہار سے متاثر تھے۔ تقریب کے آخر میں لائبریرین ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 مئی 2017

پروفیسر زاہدہ زیدی یادگاری خطبہ

ادبی دنیا میں اردو کا کردار

لکھنؤ: اودھ ویلفیئر فاؤنڈیشن کی جانب سے یوپی اردو اکادمی کے اشتراک سے ایک سیمینار بعنوان 'ادبی دنیا میں اردو کا کردار' کے تحت جے شنکر سبھا گار قیصر باغ میں اہتمام کیا گیا۔ جلسے کی صدارت شفیق مرزا منیجر اسلامیہ کالج نے کی۔ جبکہ نظامت ڈاکٹر مسیح الدین خاں مسیح نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق وزیر انیس منصوری شریک ہوئے جبکہ مہمانان اعزازی میں وسیم رائینی، قدرت اللہ شامل ہوئے۔ صحافی غفران نسیم، مولانا عبدالکریم، ڈاکٹر روما نے اپنا پر مغز مقالہ پیش کیا۔ اس سیمینار میں دو شخصیات روزنامہ انقلاب سے جیلانی خان علیگ، سماجی خدمات کے لیے ارجن پنڈت کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ کنوینر شفقت سلطانہ و کوآرڈینیٹر صبیحہ سلطانہ نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ پھولوں کے گلدستے سے مہمانوں کا خیر مقدم ڈاکٹر رضیہ پروین، الیاس منصوری، ڈاکٹر شو بھا ترپاٹھی، محمد خالد وغیرہ نے کیا۔ ناظم جلسہ ڈاکٹر مسیح الدین خان نے کہا کہ یہ سوسائٹی قابل مبارکباد ہے جس نے اتنے اہم موضوع پر سیمینار کا انعقاد کیا اور اردو کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ صبیحہ سلطانہ نے سیمینار کے اغراض و مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہمیں ماضی کے علوم، تاریخ واقعات اخلاقیات سیاسی مذہبی سماجی پہلوؤں سے واقفیت ہوتی ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 30 اپریل 2017

پروفیسر زاہدہ زیدی یادگاری خطبہ

علی گڑھ: ممتاز فلم اداکار اور تھیٹر آرٹسٹ پدم بھوشن نصیرالدین شاہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں یونیورسٹی کے کلچرل ایجوکیشنل سینٹر کے زیر اہتمام منعقدہ پروفیسر زاہدہ زیدی یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ فلم اداکاری میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ پروفیسر زاہدہ زیدی کی رہنمائی کی بدولت ہی ممکن ہوسکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر زیدی شعبہ انگریزی کی سب سے شائستہ استاد تھیں اور انھوں نے ہی مسٹر شاہ کو اولیور گولڈ اسمتھ، یوگنی آئنیسکو، ایڈورڈ آلوی، سیموئل بیکیٹ اور اینٹون چیخوف جیسے عظیم قلم کاروں کے ناٹکوں سے متعارف کرایا۔ پروفیسر زاہدہ کی حوصلہ افزائی کے سبب اے ایم یو سے بی اے کرنے کے بعد میں نے نیشنل اسکول آف ڈرامہ جوائن کیا۔ مسٹر شاہ نے کہا کہ ایک وقت میں فلمیں جذبات کے اظہار کا سب سے طاقتور وسیلہ بنیں جبکہ اس سے قبل تھیٹر سماجی مسائل کی عکاسی کا مضبوط وسیلہ رہ چکا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ایک بار پھر تھیٹر کو فلموں پر سبقت حاصل ہو رہی ہے کیونکہ اس میں سماجی مسائل کی عکاسی اور لوگوں کے درمیان ان مسائل کے تئیں بیداری کا عمل بہتر طور سے انجام پاتا ہے۔ مسٹر شاہ نے کہا کہ پروفیسر زاہدہ زیدی کی شخصیت مسحور کن تھی اور وہ ان سے بے حد متاثر تھے۔ اپنے صدارتی خطبے میں وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ (ریٹائرڈ) نے کہا کہ مسٹر نصیرالدین شاہ نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ ان کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کی بنیاد پر ہی ممکن ہوسکی ہے۔ جنرل شاہ نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مثالی ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور جلد ہی اسے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اول مقام حاصل ہوگا۔ اس موقعے پر پروفیسر سیمین حسن نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔ نظامت کے فرائض ایجوکیشن سینٹر کے کوآرڈینیٹر پروفیسر ایف ایس شیرانی نے ادا کیے۔ ڈاکٹر عارف ایچ رضوی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 مئی 2017

جرمنی میں اردو کی صورت حال

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے پریم چند سیمینار ہال میں شعبۂ اردو کے دو سابق طالب علموں کی تحقیقی و تنقیدی کتابوں، چاندنی عباسی کی کتاب 'ڈاکٹر ودیا ساگر آنند: حیات و خدمات' اور پشپیندر کمار نم کے مضامین کا مجموعہ 'زاویۂ نظر' کا اجرا عمل میں آیا۔ جس میں مہمان خصوصی کے بطور جرمنی سے تشریف لائے اردو کے اہم اسکالر محترم عارف نقوی شریک ہوئے اور صدارت

'عربی، فارسی اور اردو ادب میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کی خدمات' پر منعقدہ سمینار کا منظر

کے فرائض صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔ اس موقعے پر عارف نقوی کی کتاب 'راہِ الفت میں گامزن' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ جلسے میں بطور مہمانان ذی وقار یونیورسٹی کے کارگزار رجسٹرار ڈاکٹر دنیش کمار، سابق وزیر حکومت اتر پردیش ڈاکٹر معراج الدین احمد اور عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی کے منیجر محترم اظہار ندیم نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر الکا وششٹھ نے ادا کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی محترم عارف نقوی نے 'جرمنی میں اردو کی صورت حال' پر ایک لیکچر پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ جرمن میں مقبول ترین زبان سنسکرت تھی۔ ٹیگور کے جانے کے بعد بنگالی زبان کا چلن ہوا۔ 1961 میں میرے جرمنی جانے کے بعد لوگ اردو سے متعارف ہونے لگے۔ کئی انسٹی ٹیوٹ میں اردو زبان میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندو پاک سے اردو کے ادیب و شاعر آنے جانے لگے، ادبی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ مختلف ورکشاپ اور کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں اور انھی چیزوں کے ذریعے جرمنی باشندوں نے اردو زبان و ادب کی اہمیت کو بخوبی سمجھنا شروع کر دیا اور اردو ادب کے تراجم کا فروغ ہونے لگا۔ اس وقت جرمن میں اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے متعدد ادبی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ''شعبۂ اردو کا مشن میرٹھ کو ادب کی مین اسٹریم میں لانا ہے۔ اسی مشن کی ایک کڑی آج کا یہ جلسہ ہے۔''

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 اپریل 2017

عربی، فارسی اور اردو ادب میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کی خدمات

رامپور: رامپور رضا لائبریری میں عربی فارسی اور اردو ادب میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کی خدمات کے عنوان پر ایک روزہ سمینار منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، بانی ابن سینا اکادمی علی گڑھ نے کی۔ اپنے افتتاحی خطبے میں پروفیسر سید حسن عباس نے کہا کہ رضا لائبریری پر پروفیسر نثار احمد فاروقی کے بے پناہ احسانات ہیں۔ وہ تقریباً دس برسوں تک لائبریری بورڈ کے ممبر بھی رہے۔ اس موقعے پر پروفیسر آزرمی دخت صفوی ڈائرکٹر مرکز تحقیقات فارسی علی گڑھ نے اپنے خطاب میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کے ان گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی جس کے بارے میں عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پروفیسر نثار احمد فاروقی کا سلسلہ نسب بابا فرید گنج شکر سے ملتا تھا اور یہ اسی روحانی کیفیت کا نتیجہ تھا کہ نثار صاحب نے تصوف میں جو کام کیا ہے وہ ان کی خداداد صلاحیتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر نثار احمد فاروقی کی تمام ڈگریاں حالانکہ عربی میں ہیں لیکن ان کا دل ہمیشہ فارسی میں رہتا تھا۔ بچپن سے ہی ان کو فارسی سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ انھوں نے روضۂ اولیا اور مقاصد عارفین دو اہم کتابیں لکھی ہیں۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر سید ظل الرحمٰن نے کہا کہ پروفیسر نثار احمد فاروقی پر ایک روزہ سمینار منعقد کر کے لائبریری نے جو کارہائے نمایاں انجام دیا وہ قابل تحسین ہے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 17 اپریل 2017

افسانے کے فن پر مذاکرہ

الہ آباد: عہد حاضر کے ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی میں اپنا تازہ و منفرد افسانہ 'ریلا' پیش کیا۔ گذشتہ دنوں ان کا افسانہ 'لینڈرا' الہ آباد یونیورسٹی کے ادبی حلقہ میں موضوع بحث رہا اور تب سے اس حلقے کی خواہش تھی کہ وہ اس منفرد افسانہ نگار کے روبرو ہو سکے۔ شعبہ عربی و فارسی نے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی الہ آباد آمد پر ایک افسانوی نشست کا اہتمام کیا اور یونیورسٹی کی ادب نواز شخصیات نے اس میں شرکت کی۔ واضح ہو کہ موصوف کے افسانوی مجموعے افق کی مسکراہٹ، لینڈرا، دکھ ٹکلوا، عیدگاہ سے واپسی، اور افسانچوں کا مجموعہ کولاژ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں جن کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی ہے۔ اس موقعے پر صدر شعبہ نے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے افسانوں پر مصر کی الیکزینڈریہ یونیورسٹی کی ڈاکٹر زینب صدیق نے تحقیقی مقالہ لکھا ہے اور لینڈرا کی کہانیوں کا عربی ترجمہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر صالحہ رشید نے اسلم صاحب کی کہانی لینڈرا کا فارسی ترجمہ کیا ہے۔ یہ مرد کے استحصال کی کہانی ہے۔ آپ کی کہانیاں ہندی میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے تازہ افسانے 'ریلا' کی مخصوص لب ولہجے میں قرأت کی۔ افسانہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے انھوں نے مزید کہا کہ حاشیائی کرداروں کو منظر عام پر لانا آج کے تخلیق کاروں کا اہم فریضہ ہے۔'' اس موقعے پر عربی و فارسی افسانہ نگاری کی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ اس پر مغز ادبی نشست کا اختتام ڈاکٹر فیروز اختر کے شکریے کے کلمات کے ساتھ ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 اپریل 2017

اے ایم یو میں استقبالیہ جلسہ

علی گڑھ: برلن سے تشریف لائے معروف ادیب و صحافی عارف نقوی کے اعزاز میں ریسرچ اسکالر ایسوسی ایشن شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام استقبالیہ جلسہ منعقد کیا گیا، پروفیسر صغیر افراہیم نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے مہمان خصوصی عارف نقوی کی علمی، ادبی

سرگرمیوں سے معززین کو واقف کرایا اور کہا کہ موصوف گذشتہ پچاس سالوں سے دیار غیر (جرمنی) میں اردو کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے پروفیسر عارف نقوی نے کہا کہ آج مجھے مسلم یونیورسٹی میں استقبالیہ کی شکل میں لوگوں سے ملنے کا موقع دیا گیا جس کے لیے ہمیشہ ممنون ومشکور رہوں گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے جس کی خوشبو سے سارا جہاں معطر ہے۔ ایسی زبان کبھی مر نہیں سکتی، انھوں نے کہا کہ جو لوگ اردو کے ختم ہونے کی بات کرتے ہیں دراصل وہ اردو دشمن ہیں۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مظفر حسین سید نے مہمان خصوصی عارف نقوی پر خصوصی خاکہ پیش کیا

جس میں ان کی تعلیمی ادبی اور سماجی خدمات کو نہایت وقیع انداز میں پیش کیا۔ان کی لکھنؤ سے برلن تک کی ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کیا۔ جلسہ کی نظامت کے فرائض قمرالہدیٰ فریدی نے انجام دیے۔ صدر جلسہ پروفیسر سید محمد ہاشم نے عارف نقوی کو ترقی پسند تحریک کا عملی نمونہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے عوامی مفاد کے لیے ادبی سرگرمیوں کو وقف کردیا یہی وجہ ہے کہ ان کا حلقہ دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 اپریل 2017

اردو زبان کا مستقبل اور ہمارا کردار

موانہ: اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے اہم کردار اور ذمے داری ہمیں ہی نبھانی ہوگی تبھی اس کا حق اور کھویا ہوا مقام حاصل ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار علامہ ڈاکٹر اقبال اردو لائبریری موانہ کے زیر اہتمام منعقد 'اردو زبان کا مستقبل اور ہمارا کردار' کے عنوان سے منعقد سیمنار میں بطور مہمان خصوصی شیخ ندیم اختر نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ایک لشکری زبان ہے اور اس نے ہر طبقے کی زبان کو گلے لگایا ہے اور ہندوستان کی ہی زبان ہے جس کو میر امن دہلوی، سرسید احمد، شبلی نعمانی جیسی ادبی اور عظیم شخصیتوں نے اپنے خون پسینے سے سینچا ہے اور میر تقی میر، غالب، داغ دہلوی جیسے عظیم شعرا نے عام لوگوں کے دلوں میں اردو کی محبت پیدا کی ہے۔ اس موقعے پر موانہ خورد کے لیکچرر مرزا منہاج الدین نے بتایا کہ آج کئی شعبوں میں اردو روزگار سے بھی جڑ گئی ہے۔ صحافت، اردو اساتذہ، کمپیوٹر جاب اور میڈیکل کورسز کے علاوہ دیگر ٹرانسلیٹرز وغیرہ کی نوکریوں میں بھی اردو زبان کی مانگ ہے۔ مفتی جاوید نے کہا کہ صرف مدارس میں ہی آج اردو دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے کچھ ٹھوس قدم اٹھانے ہوں گی۔ ان کے علاوہ مولانا نبیل احمد، مولانا سلیم ندوی وغیرہ نے سیمنار کو خطاب کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر جمیل شاد نے ادا کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 مئی 2017

مدارس کی اہمیت اردو ادب کے تناظر میں

کانپور: بھابیہ ریسٹورنٹ پریڈ میں ایک سیمنار بعنوان 'مدارس کی اہمیت اردو ادب کے تناظر میں' کا انعقاد 16 اپریل کو عمل میں آیا جس کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید صدیقی نے کہا کہ اردو زبان و ادب کو زندہ رکھنے میں مدارس کا اہم رول رہا ہے، پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ اردو زبان میں وہ صلاحیت ہے کہ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا تحفظ کر سکے ملک وقوم کی خدمت میں مدرسوں کا کردار بہت اہم رہا ہے، ڈاکٹر سیما صغیر نے بنیادی تعلیم اور مدرسوں کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس موقعے پر پروفیسر صغیر افراہیم کی کتاب 'اردو ناول (تعریف، تاریخ اور تجزیہ)'، ڈاکٹر مولانا محمد اسلم جامعی کی کتاب 'اردو ادب کی ترقی میں علماء ہند کا حصہ' اور پروفیسر صغیر افراہیم کے افسانوں کا مجموعہ کڑی دھوپ کا سفر جو ڈاکٹر سیما صغیر نے مرتب کیا ہے، کا اجرا عمل میں آیا۔

سیمنار میں ڈاکٹر مولانا محمد اسلم جامعی نے اپنا مقالہ 'مدارس کی اہمیت اردو ادب کے تناظر میں' پیش کیا ساتھ ہی خان احمد فاروق و ڈاکٹر رخسانہ نے بھی اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر ابوالحسنات حقی نے کہا کہ آج دور بدل رہا ہے اور اردو زبان و ادب نے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ خود کو عصری تعلیم سے ہم آہنگ کیا ہے ڈاکٹر محمد ارشد نے کہا کہ پروفیسر صغیر افراہیم تقریباً ایک درجن کتب کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین افسانہ نگار بھی ہیں۔ علاوہ ازیں پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر اسلم جامعی کی تحقیقی کتاب کا اجرا بھی عمل میں آیا انھوں نے کہا کہ مسلسل سات برسوں کی تلاش وجستجو کے نتیجے کے طور پر یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اپریل 2017

علی جواد زیدی فن اور شخصیت

سنبھل: ایم جی ایم (پی جی) کالج میں شعبہ اردو کے زیر اہتمام 'علی جواد زیدی فن اور شخصیت' کے موضوع پر ایک قومی سیمنار کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے خطاب میں علی جواد زیدی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا

کہ علی جواد زیدی نے اردو ادب میں جو مقام حاصل کیا وہ ان کی اپنی محنت اور لگن کا نتیجہ تھا۔ اپنے کلیدی خطبے میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے بھی علی جواد زیدی کی ادبی خدمات کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کو ان کے طریقہ کار سے فیض حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ کالج پرنسپل ڈاکٹر عابد حسین نے کہا کہ علی جواد زیدی مشہور مجاہد آزادی تھے اور انھوں نے 60 سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی نے اپنے خیالات میں علی جواد زیدی کی ادبی خدمات کو نئی نسل کے لیے سبق آموز بتاتے ہوئے اپیل کی کہ محنت اور لگن کو اپنانے کی موجودہ دور میں بہت ضرورت ہے۔ سیمنار میں ڈاکٹر فرقان سنبھلی، ڈاکٹر شیخ نگینوی، عزہ معین، گلشن جہاں وغیرہ نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ سیمنار میں پروفیسر صغیر افراہیم کو عندلیب شادانی راشٹریہ ایوارڈ 2017 برائے تحقیق وتنقید، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کو مصور سبزواری ایوارڈ اور وضاحت حسان رضوی کو علی الترتیب اردو فکشن تنقید اور اردو صحافت میں خصوصی خدمات کے لیے ایوارڈ دیے گئے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ہما فاطمہ اور ڈاکٹر رضا الرحمٰن نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 4 مئی 2017

ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری

علی گڑھ: انجمن مصنفین علی گڑھ کے زیر اہتمام غالب اسٹڈی سینٹر ابن سینا اکادمی اور فرح میموریل پبلک اسکول کے اشتراک سے ابن سینا اکادمی ہال سول لائن علی گڑھ میں بعنوان 'ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری' ایک روزہ سیمنار کا انعقاد عمل میں آیا جس میں طلبا نے اپنے مقالات پیش کیے۔ پروگرام کی صدارت پدم شری حکیم سید ظل الرحمٰن نے کی۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر صغیر افراہیم اور ڈاکٹر سرور ساجد شامل ہوئے۔ پروگرام کے کنوینر عبدالمنان صمدی نے تمام مہمانان کا استقبال کیا۔ کلیدی خطبہ پروفیسر مولا بخش نے پیش کیا، انھوں نے اپنے خطبے کے دوران ترقی پسند تحریک کے اردو شاعری پر پڑنے والے مثبت اور منفی اثرات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ''ترقی پسند تحریک کی وجہ سے ہندوستان میں اردو شاعری گلی کوچوں تک پہنچی اور اس کو بہت فروغ حاصل ہوا۔'' ان کے علاوہ مہمانان خصوصی پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر سرور ساجد وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جن طلباء نے مقالات پیش کیے ان کے نام اس طرح ہیں، محمد ناظم، ادیبہ صدیقی، خورشید عالم، نزہت فاطمہ، فیروز ہارونی، شگفتہ پروین، حسینہ خانم، شفا مریم، عائشہ شاہین، روبیلا ثاقب، غلام سرور اور نزاکت حسین۔ آخر میں پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، پروفیسر مولا بخش، معروف شاعر جمنا پرشاد راہی اور انجینئر خالد فریدی کے ہاتھوں مقالہ نگاران کو اسناد تقسیم کی گئیں۔ اختتام پر سید بصیر الحسن وفا نقوی نے اساتذہ اور شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 مئی 2017

بہار

مومن لائبریری کے زیر اہتمام مشاعرہ

بھاگلپور: 8 اپریل بروز سنیچر مومن لائبریری چمپانگر بھاگلپور کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرہ علمی و ادبی سرزمین چمپانگر کے طالب انصاری کے مکان کے نزدیک وسیع و عریض میدان میں عالی مرتبت عالم و ذی وقار ادیب و شاعر اسجد ناظری نظر کی صدارت میں اور اس ملک کے مشہور و معروف ناظم خالق ادیب (آسنسول) مغربی بنگال کی نظامت میں پورے آب و تاب کے ساتھ انجام پزیر ہوا۔ اس موقع پر افتتاحی خطبہ میں مومن لائبریری کے صدر اسجد ناظری نظر نے کہا کہ مومن لائبریری چمپانگر 1935 سے عوام و خواص کے درمیان علمی و ادبی سرگرمی میں کارہائے نمایاں انجام دے رہا ہے۔ مومن لائبریری آزادی سے قبل کی لائبریری ہے۔ یہاں مذہبی، دینی، تاریخی، ادبی پس منظر کی نایاب و نادر کتابیں دستیاب ہیں۔ مومن لائبریری کو تقریباً 82 سال ہو گئے۔ روایت کے مطابق مشاعرے کا آغاز شبیر وارثی کی نعت پاک سے کیا گیا۔ اس عظیم الشان مشاعرہ میں پرویز قاسمی آسنسول، توفیق ساغر اڑیسہ، تنویر اختر مئوناتھ بھنجن، ڈاکٹر ذاکر حسین ذاکر بتیا، عظیم بالیشوری اڑیسہ، قیصر امام قیصر گریڈیہہ، پرویز کوثر مئو، سوشیل ساحل گڈا، ارون گوپال نرکٹیا گنج، شرر راستی کولکاتا، منظر قاسمی کھگڑیا، خطیب حیدر ارریہ کے علاوہ مقامی شعرا مظہر مجاہدی، ضیا نعمانی، شبیر جعفری، ڈاکٹر نعیم الدین، اسجد ناظری نظر، کاظم اشرفی و دیگر نے اپنے اپنے کلام پیش کیے۔ سامعین نے شاعروں کی شاعری پر خوب داد دی اور رات بھر لطف اندوز ہوتے رہے۔ سامعین کی بھیڑ ثابت کر رہی تھی کہ مشاعرہ تاریخ ساز رہا اور کامیابی کی عبارت لکھتے ہوئے بحسن خوبی اختتام پزیر ہوا۔

پریس ریلیز: قمر امان، غنی چک، بھاگلپور، 11 اپریل 2017

تلنگانہ

فون میں اردو گھر گھر میں اردو

نظام آباد: انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں اردو رسم الخط کو ٹیکنالوجی سے جوڑنے اور اسمارٹ فون اور کمپیوٹر استعمال کرنے والی اردو نسل کو اردو کے استعمال کی جانب راغب کرنے کی غرض سے شعبہ اردو گری راج کالج نظام آباد کی جانب سے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کے زیر نگرانی اپنی نوعیت کے فروغ اردو کے ایک اہم

پروگرام 'فون میں اردو گھر گھر میں اردو' کو نظام آباد تلنگانہ اسٹیٹ سے شروع کیا گیا۔ اردو کے فروغ کے لیے عملی کام کرنے والوں میں ایک محبِ اردو ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اردو گری راج کالج نظام آباد ہیں جو سوشل میڈیا فیس بک پر اپنے گروپس بزم اردو شمع فروزاں، اردو دائی نامہ اور یو جی سی نیٹ کے ذریعے اردو کو فیس بک پر پیش کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے کالج میں بھی اردو کے فروغ کے لیے اختراعی پروگرام کرتے رہتے ہیں جیسے اسکائپ کے ذریعے آن لائن انٹرنیشنل اور نیشنل لیکچرز کا اہتمام، اردو بلاگ کے ذریعے اپنے پیغام کو عام کرنا، کالج میں تعلیمی بورڈ کا قیام جس میں روزانہ ایک لفظ سیکھیے چار زبانوں میں کامیابی سے منعقد کرنے کے بعد اس سال عالمی یوم مادری زبان کے موقعے پر انھوں نے فروغ اردو کا اختراعی پروگرام 'فون میں اردو گھر گھر میں اردو' شروع کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کی خاص بات یہ ہے کہ وہ ٹیکنالوجی کو دستیاب ذرائع کے ساتھ فروغ تعلیم اور فروغ اردو کے لیے استعمال کرتے ہیں انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے پاس جیو کی شکل میں مفت انٹرنیٹ ہے اور عوام کے پاس بھی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اردو بولنے والے بہت بڑے نوجوان طبقے کے ہاتھوں میں اسمارٹ فون ہیں اگر تھوڑی جستجو کی جائے تو واٹس اپ اور فیس بک پر رومن انگریزی میں اردو لکھنے والا یہ طبقہ اردو رسم الخط میں سوشیل میڈیا پر لکھ سکتا ہے چنانچہ انھوں نے کالج کے طلبا کی ٹیم تیار کی۔ انھیں اپنے پروگرام 'فون میں اردو گھر گھر میں اردو' کے لوگو کی جرسیاں پہنائیں اور کالج اسکول اور چوراہوں پر شخصی ملاقاتوں کے ذریعے لوگوں کے اسمارٹ فون میں اردو رسم الخط شامل کیا اس کے لیے وہ گوگل پلے اسٹور میں مفت دستیاب اپلی کیشن 'سوفٹ کی' کی بورڈ کو شامل کرتے ہیں جس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے انگریزی کے ساتھ مزید دو زبانیں اردو، عربی، ہندی، تلگو کوئی بھی تین زبانیں ساتھ ساتھ وقت واحد میں کی بورڈ میں رکھی جاتی ہیں اور اس کی بورڈ کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی یادداشت میں ٹائپ شدہ الفاظ محفوظ رہ جاتے ہیں ایک مرتبہ اردو لکھ دیا جائے اور اگلی بار ار لکھتے ہی اردو دکھاتا ہے اس طرح دکھائے جانے والے الفاظ کو منتخب کرتے جائیں تو تیزی سے اردو لکھا جا سکتا ہے جسے واٹس اپ فیس بک اور ایم ایس ورڈ کے کسی بھی پروگرام میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ گری راج کالج شعبہ اردو کی جانب سے اردو رسم الخط کو عام کرنے کی مہم کو جب فیس بک اور واٹس اپ پر ڈالا گیا تو قومی اور بین الاقوامی سطح پر مقبولیت ملی اور ڈاکٹر اسلم فاروقی سے مشاورت کرنے کے بعد مہاراشٹرا بہار کشمیر اور اسلام آباد، سعودی عرب، امریکہ اور دیگر ممالک سے لوگوں نے اس مہم کو چلانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی، اسسٹنٹ پروفیسر و صدر، شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج (اے)، نظام آباد، تلنگانہ

مہاراشٹر:

ادارۂ ادب اسلامی ہند مہاراشٹر کی تیرھویں سالانہ کانفرنس

ممبئی: قیصر الجعفری فاؤنڈیشن، اردو ادب عالیہ، ایوان اردو پنویل، اردو والے اور اردو لٹریری فورم کے اشتراک سے ادارۂ ادب اسلامی ہند مہاراشٹر کی سالانہ ادبی کانفرنس کا انعقاد ممبئی کے ادبی گہوارے، ممبرا میں مورخہ 15 اپریل 2017 کو ہوا۔ سینٹ میری کالج ممبرا کے وسیع و عریض ہال میں نثری سیشن معروف ادیب و صحافی عالی جناب ڈاکٹر سلیم خان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ دہلی سے تشریف لائے ادارۂ ادب اسلامی ہند کے نائب صدر و شاعر و محقق ڈاکٹر تابش مہدی اور جناب انتظار نعیم مہمان خصوصی رہے۔ تبصرہ بعنوان 'تذکرۂ سکونِ دل' جناب متین اچل پوری سکریٹری ادارہ ادب اسلامی ہند مہاراشٹر نے پیش فرمایا۔ پھر ایک نہایت دلچسپ عنوان 'ورقی ادب

اردو اخبارات اور رسالوں کے ڈیجیٹائزیشن

و برقی ادب' پر اہم مذاکرہ ڈاکٹر اسداللہ خان (ماہر تعلیم) کی صدارت میں ہوا جس میں جناب اسلم مرزا، جناب ظہیر انصاری (مدیر تحریر نو) جناب امتیاز خلیل (صحافی) جناب فاروق سید، پروفیسر عظیم الدین (اورنگ آباد) اور جناب ڈاکٹر سلیم خان صاحب نے حصہ لیا۔ پھر جناب حسنین عاقب کی کتاب 'خامہ سجدہ ریز' کا اجرا جناب انتظار نعیم کے ہاتھوں ہوا تبصرہ محسن ساحل نے کیا۔ بعد ازاں حسب سابق اعزازات کی تقسیم ہوئی۔ پہلے نثری سیشن کے آخر میں جناب ڈاکٹر سلیم خان کے صدارتی کلمات اُن کی فکر کی روشنی اور زبان کی خوشبو سے اس درجہ آراستہ تھے کہ سامعین عش عش کر اٹھے۔ اس سیشن کی کنویز شپ کے فرائض جناب متین اچلپوری نے بحسن و خوبی انجام دیے۔

وقفے کے بعد دوسرے نثری سیشن کی کنویز شپ جناب جاوید ندیم نے سنبھالی۔ ڈاکٹر تابش مہدی صدر رہے۔ ابتدا میں جناب متین اچلپوری کے شعری مجموعے 'تجلی زار' اور این سی پی یو ایل نئی دہلی کی شائع شدہ موصوف کی کتاب 'ماحول نامہ' کا اجرا جناب ڈاکٹر تابش مہدی اور جناب انتظار نعیم کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ آخر میں ڈاکٹر تابش مہدی کے صدارتی خطبہ کے کلمات نے ایک خوشگوار کیفیت پیدا کر دی۔

رپورٹ: سکریٹری، ادارۂ ادب اسلامی ہند حلقہ مہاراشٹر، 21 اپریل 2017

اردو اخبارات اور رسالوں کے ڈیجیٹائزیشن

ممبئی: انجمن اسلام کریمی لائبریری کے زیر اہتمام 21 اپریل کو ایک اہم علمی و ادبی، تقریب کا انعقاد عمل میں آیا جس کے دوران بالخصوص 19ویں صدی کے اردو اخبارات کی تفصیل پیش کی گئی اور یہ خوش خبری سنائی گئی کہ 150 سے زائد ان قدیم اردو اخبارات اور رسالوں کے 5 ہزار شماروں کو ڈیجیٹائز کرنے کا جو عمل شروع کیا گیا تھا اس کی تکمیل کر لی گئی ہے اور ان قیمتی صفحات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا گیا ہے۔ یہ کریمی لائبریری کے ذریعے انجام دیا جانے والا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ دوران تقریب ڈیجیٹائز کردہ کچھ صفحات کا ڈسپلے بھی کیا گیا۔ چونکہ 21 اپریل علامہ اقبال کا یوم وفات تھا، اس مناسبت سے مقررین نے علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر ظہیر قاضی کو کرنی تھی لیکن ان کے اصرار پر یہ ذمے داری اقرا ایجوکیشن سوسائٹی کے روح رواں عبدالکریم سالار نے انجام دی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں انجمن اسلام کریمی لائبریری کے ذریعے کیے گئے اس اہم کام کی اشاعت کی اور کہا کہ ''یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ تاریخی واقعہ ہے۔ اُس زمانے میں اردو اخبارات کا اپنا منفرد انداز اور معیار تھا۔'' انجمن اسلام کے نائب صدر ڈاکٹر شیخ عبداللہ نے اس موقعے پر کہا کہ ''قوموں کی شناخت ان کی تہذیب اور زبان و ادب سے ہوتی ہے اور جو قومیں بیدار مغز اور زندہ کہلاتی ہیں وہ اپنے مسائل خود حل کرتی ہیں لیکن تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی تہذیب و زبان کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں، ہمیں اس سے باہر آنے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 24 اپریل 2017

اعزاز و اکرام:

محمد خلیل سائنس ایوارڈ

نئی دھلی: بدیع الدین خاں کو ان کی اردو سائنسی خدمات کے لیے سی این آئی آر کے نیسکر انسٹی ٹیوٹ کے

ڈائرکٹر منوج کمار پٹیریا اور پروفیسر زاہد حسین زیدی، سابق چانسلر نے محمد خلیل سائنس ایوارڈ سے نوازا۔ یہ ایوارڈ توصیفی سند، شال اور انعامی رقم پر مشتمل ہے۔ تقریب کے دوران وگیان پریشد پریاگ کے سکریٹری دویدی جی نے کہا کہ کاؤنسل اپنے قیام 102 سال پوری کر چکی ہے۔ یہاں کاؤنسل کے کئی ایوارڈ میں یہ ایوارڈ ہندی اور اردو دونوں سائنس کے لیے گذشتہ پانچ سال سے دیا جا رہا ہے۔ سابق مدیر محمد خلیل نے بدیع الدین خاں کی سائنسی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا اور رسالہ کے بانی نگراں پروفیسر اے رحمٰن نے تفصیل پیش کیا۔ تقریب کے اختتام پر غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے سائنس پریشد کا اور اس کے مہا منتری پروفیسر شیو گوپال مسٹر اور دیگر ماہرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 اپریل 2017

روبینہ شبنم پنجاب اردو اکادمی کی سکریٹری

مالیرکوٹلہ: پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے ریجنل سینٹر نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز ان اردو، فارسی اور عربی لینگویجز مالیرکوٹلہ کی ہیڈ ڈاکٹر روبینہ شبنم پنجاب اردو اکادمی کی سکریٹری کے طور پر اپنا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ پنجاب سرکار کے احکامات کے مطابق ڈاکٹر روبینہ شبنم کو سرکاری کالج مالیرکوٹلہ کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر منظور حسن کی جگہ پر اردو اکادمی کا ایڈیشنل سکریٹری نامزد کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر روبینہ شبنم اردو عربی اور فارسی زبانوں کی نامور ادیبہ ہیں جنھوں نے سال 2002 میں پروین شاکر کے شاعری کارناموں کے عنوان پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ ایک بہت مقبول و معروف شاعرہ بھی ہیں جن کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

روزنامہ 'ہند سماچار' پنجاب، 29 اپریل 2017

'عرفان وادراک' پر ایوارڈ

ادے پور: 29 مارچ 2017 کو راجستھان اردو اکادمی جے پور کی جانب سے منعقدہ سالانہ جلسے میں مختلف ادبی انعامات تقسیم کیے گئے، جس کے تحت 2015 میں مطبوعہ کتب پر دیے گئے انعامات میں ڈاکٹر رئیس احمد، استاد شعبۂ اردو موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، اودے پور کی تصنیف 'عرفان وادراک' کو اوّل انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ بطور انعام ڈاکٹر رئیس احمد کو منعقدہ جلسے کے مہمان ذی وقار پروفیسر خالد محمود، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے ہاتھوں دس ہزار روپے پر مشتمل چیک مع توصیف نامہ پیش کیا گیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر رئیس احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، یو سی ایس ایس ایچ، ایم۔ ایل۔ ایس۔ یو، ادے پور، 30 مارچ 2017

حاجی انصار احمد کو 'محسن زبان و ادب' ایوارڈ

بھساول: افق شیکشنک و بھوائڈشیہ سنستھا چوپڑا کے زیر اہتمام آل انڈیا مشاعرہ اور یک روزہ سمینار منعقد کیا

گیا۔ مشاعرہ کی صدارت ڈاکٹر مہتاب عالم نے فرمائی۔

مشاعرہ سے قبل اردو ادب کی خدمات انجام دینے والے حضرات کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر مہتاب عالم، انجم بارہ بنکوی، ڈاکٹر کریم سالار، ڈاکر قریشی و انیس محشری صاحبان کے ہاتھوں تزئین ادب کے اعزازی مدیر حاجی انصار احمد چیئرمین الحرا اردو اسکول بھساول کو 'برائے محسن زبان و ادب' محشر مصطفی آبادی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 24 اپریل 2017

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی امتیاز شبلی ایوارڈ سے سرفراز

اعظم گڑھ: اردو کے ممتاز اہل قلم، محقق، ناقد اور ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اعزازی فیلو دارالمصنفین شبلی اکادمی کو ان کی گراں قدر ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے شعبہ اردو شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ نے امتیاز شبلی ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے۔ انھیں یہ اعزاز 13 اپریل 2017 کو ایک انتہائی پروقار تقریب میں ایس پی اعظم گڑھ شکیل احمد خاں کے ہاتھوں سے دیا گیا، اس تقریب کے کنوینر ڈاکٹر شباب الدین صدر شعبۂ اردو شبلی کالج تھے۔ اس تقریب میں بڑی تعداد میں اعظم گڑھ کے ادبا، شعراء، اہل قلم، مصنفین اور ممتاز اشخاص نے شرکت کی۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی اب تک 3 درجن علمی، ادبی اور تحقیقی کتابیں شائع ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کا خاص موضوع شبلیات ہے۔ علامہ شبلی سے متعلق اب تک ان کی گیارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جس میں آثار شبلی، کتابیات شبلی، مکتوبات شبلی، شبلی اور جہان شبلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس وقت بھی وہ شبلی سے متعلق کئی تحقیقی منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔

روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی، 25 اپریل 2017

ڈاکٹر عبدالباری کو بیسٹ ٹیچر ایوارڈ

پونہ: شہر پونہ مہاراشٹر کا مشہور تعلیمی ادارہ قادریہ ایجوکیشن سوسائٹی جنیز پونے کے زیر اہتمام انجمن کالج گراونڈ میں 11 اپریل 2017 بروز سنیچر ایک عظیم الشان کل ہند مشاعرہ و تقسیم ایوارڈ تقریب کا کامیاب انعقاد عمل میں لایا گیا۔ اس تقریب میں اردو کے نامور ادیب و نقاد ڈاکٹر عبدالباری اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، عربی و فارسی اور پی جی سینٹر انجمن خیرالاسلام پونا کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کیمپ پونے کی علمی و ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے حاجی رؤف خاں صدر قادریہ ایجوکیشن سوسائٹی جنیز پونے ڈاکٹر عبدالباری کو بیسٹ ٹیچر (اردو پروفیسر) ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر عبدالباری اردو دنیا کی معروف ادبی شخصیت ہیں جو کئی سالوں سے صلہ اور تمنا کی پروہ کئے بغیر اردو علم و ادب کی خاموش خدمات میں مصروف ہیں انہیں بیسٹ ٹیچر (اردو پروفیسر) ایوارڈ ملنے پر ڈاکٹر رفیق سر، ڈاکٹر آفتاب انور شیخ، پروفیسر معین الدین خان، جناب رفیق جعفر کے علاوہ اردو دوست حضرات نے دلی مبارکباد دی ہے۔

رپورٹ: خان محمد محسن محمد رفیع، پونہ کالج پونے، 19 اپریل 2017

معروف ناول نگار پروفیسر نوشابہ صدیقی کا استقبالیہ

علی گڑھ: پاکستان سے تشریف لائیں پروفیسر نوشابہ صدیقی (معروف ناول نگار، افسانہ نگار، انشائیہ نگار اور خاکہ نگار) کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس نمبر 1 میں بزم نوید سخن علی گڑھ کی جانب سے استقبال کیا گیا۔ بزم کے جنرل سکریٹری سید بصیرالحسن وفا نقوی نے ان کی ادبی خدمات اور اردو ادب کے حوالے سے ان سے مخصوص گفتگو کی۔ پروفیسر نوشابہ صدیقی نے بتایا کہ میرا آبائی وطن غازی پور ہندوستان ہے۔ میں شہر غازی پور میں پیدا ہوئی جہاں میرے دادا کے ساتھ سرسید کی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ وہ سرسید سے بڑے متاثر تھے وہیں اس زمانے میں سائنٹفک سوسائٹی کا منصوبہ بنایا گیا میں بہت چھوٹی تھی میرے والد علی گڑھ آ گئے۔ انھوں نے یہیں تعلیم حاصل کی اور یہیں ملازم بھی ہوئے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ میرے والد کا کم عمری میں انتقال ہو گیا۔ میں دو سال کی تھی جب مجھ سے علی گڑھ چھوٹ گیا اور میں پھر غازی پور چلی گئی اور جب میں 4 سال کی ہوئی تو ہجرت کا دکھ اٹھانا پڑا اور پاکستان پہنچ گئی۔ وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی اور کراچی کے ایک کالج میں پڑھانے لگی، میں نے تقریباً چالیس سال ٹیچنگ کی اس زمانے سے ہی میں چاہتی تھی کہ اپنے آبائی وطن غازی پور اور خاص طور سے علی گڑھ دیکھوں، لیکن گھر اور ملازمت کی ذمے داریوں کی وجہ سے ہندوستان نہ آسکی۔ پہلی بار 21 مئی 2014 کو علی گڑھ آئی اور اپنے والد کی قبر دیکھی۔ انھوں نے مزید بتایا کہ میں نے 10 سال کی عمر سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا میری پہلی کہانی اُس دور کے مشہور اخبارات 'جنگ' اور 'اخبار جہاں' میں شائع ہوئی تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، اس کے بعد میرا ایک ناول منظر عام پر آیا جس پر مجنوں گورکھپوری نے دیباچہ لکھا۔ اب میری تقریباً 12 کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور تین زیر طبع ہیں۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ عہد میں صغیر افراہیم تنقید کے حوالے سے بڑا نام ہیں۔ آخر میں نوشابہ صدیقی نے اردو ادب کے قارئین اور طلبا کو پیغام دیا کہ اردو زبان کو کبھی فراموش نہ کریں خاص طور سے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اردو زبان و ادب سے واقفیت ضرور حاصل کریں چاہے اس کا سبجیکٹ کوئی ہو کیونکہ اردو مختلف تہذیبوں اور تمدن کی مظہر ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 مئی 2017

اجرا

پروفیسر صغیر افراہیم کا تنقیدی شعور

علی گڑھ: تحقیقی مقالہ 'پروفیسر صغیر افراہیم کا تنقیدی شعور' اور سہ ماہی تحریک ادب (خصوصی نمبر) کی پروقار تقریب اجرا حرف زار لٹریری سوسائٹی، دیار ادب انڈیا، علامہ قیصر اکادمی علی گڑھ، بزم نوید سخن علی گڑھ، گلشن ادب علی گڑھ کے زیر اہتمام بہ اشتراک غالب اسٹڈی سینٹر، ابن سینا اکادمی دودھ پور، علی گڑھ میں 13 اپریل کو انعقاد کیا گیا تھا۔ رسم اجرا بدست جناب عارف نقوی صاحب صدر اردو انجمن برلن (جرمنی) انجام دی گئی۔ اجرا کی صدارت جناب ظفر حسین سید صاحب، مہمان خصوصی پروفیسر صغیر افراہیم صاحب، مہمان اعزازی ڈاکٹر وکرم سنگھ، پرووائس چانسلر سید احمد علی، پروفیسر سید محمد ہاشم، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر مولا بخش، پروفیسر شکیل صمدانی موجود تھے۔ تحقیقی مقالہ 'پروفیسر صغیر افراہیم کا تنقیدی شعور' کے رسم اجرا کی تقریب کو خطاب کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر سید احمد علی نے کہا کہ یہ بہت مسرت کی بات ہے کہ کسی ادیب کی زندگی میں اس پر تحقیق ہو کر کتابی شکل میں سامنے آجائے، انھوں نے کہا کہ صغیر افراہیم ایک اچھے استاد کے ساتھ اچھے نقاد اور افسانہ نگار بھی ہیں، ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جانا ایک صحت مند علامت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ اسے پرائمری سطح سے تعلیم کا لازمی حصہ بنا کر نئی نسل کو اردو زبان سے جوڑ دیا جائے۔ اردو انجمن برلن (جرمنی) کے صدر اور مہمان

’تہذیب الاخلاق‘ کے خصوصی نمبر کا اجرا

خصوصی عارف نقوی نے کہا کہ اردو کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔ اردو کا مستقبل بھی روشن ہے لیکن نئی نسل کو اردو سے واقف کرانے کے لیے جدید طریقوں کو اپنانا ہوگا۔ مہمان ذی وقار ڈاکٹر وکرم سنگھ نے صغیر افراہیم کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہایت ہی فعال اور متحرک انسان ہیں وہ ہمہ وقت اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ صدر جلسہ معروف ادیب مظفر حسین سید نے کہا کہ صغیر افراہیم کی خدمات کے اعتراف کے لیے جن ادبی تنظیموں نے یہ عظیم الشان محفل سجائی ہے وہ قابل مبارکباد ہیں۔

روزنامہ ’میرا وطن‘ دہلی، 26 اپریل 2017

’تہذیب الاخلاق‘ کے خصوصی نمبر کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) نے سرسید دو صد سالہ تقریبات کے تحت ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے سرسید کو معنون خصوصی نمبر ’جشن سرسید 2017‘ کی جلد اوّل کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ تہذیب الاخلاق کا مذکورہ نمبر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے مزید دو نمبر نکالے جانے چاہئیں جن کے لیے انتظامیہ بھرپور تعاون پیش کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے دوسری جلد ان خواتین کے تعلق سے ترتیب دی جانی چاہیے جو علی گڑھ میں درس وتدریس سے وابستہ رہیں اور انھوں نے عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کی جبکہ تیسری جلد ان غیر مسلم اساتذہ کو معنون ہونا چاہیے جنھوں نے سرسید مشن کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ سرسید دوصد سالہ تقریبات کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر اے آر قدوائی، پروفیسر شافع قدوائی نے تہذیب الاخلاق کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم بیگ کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 13 اپریل 2017

نئی نسل اور میرے مضامین

پٹنہ: معلم کی قدر بادشاہ سے زیادہ ہوتی ہے جو ملک اور معاشرے کی رہنمائی کرتا ہے۔ اچھے استاد اپنے شاگردوں کو سچائی کی راہ دکھا کر سچا انسان بناتے ہیں تاکہ سچائی کی راہ پر چلتے ہوئے وہ ایک بہتر اور مثبت سماج کی تشکیل کر سکے۔ معلم نئی نسل کے شعور اور ذہن کو پختہ اور بالیدہ کرتا ہے۔ آج کے دور میں اچھے استاد کی بہت کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ عبدالغفور وزیر اقلیتی فلاح نے یہ باتیں اتوار کو معروف معلم ڈاکٹر اختر حسین کی کتاب ’نئی نسل اور میرے مضامین‘ کی رسم اجرا کی تقریب میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ معلم کا درجہ سماج میں سب سے اعلیٰ ہوتا ہے اور وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر اختر حسین آفتاب جن افکار و خیالات کو نئی نسل تک پہنچانا چاہتے ہیں وہ سب کچھ اس کتاب میں قلم بند ہے۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر اختر حسین آفتاب نے کہا کہ آج ملک میں فرقہ پرستی، بھید بھاؤ اور بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے ہندو مسلم ایکتا بھی نشانے پر ہے، ہماری ذمے داری ہے کہ ہم سیکولر قدروں کے استحکام کے لیے کام کریں۔ اردو مشاورتی کمیٹی کے صدر نشیں اور معروف افسانہ نگار شفیع مشہدی نے ان کی مذکورہ کتاب کے حوالے سے کئی اہم نکات پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ آفتاب حسین اعلیٰ قدروں کے امین ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت جاذب نظر ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے کہا کہ ڈاکٹر آفتاب نے فکری سطح پر نئی نسل کی قیادت کی۔ ان کا تخاطب نئی نسل سے ہے۔ ان کے افکار و خیالات اس کتاب میں اتنے جاذب انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ اس پر عمل کیا جائے تو دنیا کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ ہمارے ملک اور معاشرے کو اس کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے ذریعے اپنے علم اور فکر کو نئی نسل تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ تقریب کی صدارت شفیع مشہدی نے کی جبکہ نظامت کی ذمے داری قیصر نبی قیصر نے سنبھال رکھی تھی۔ تقریب میں عظیم آباد کی بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 24 اپریل 2017

تتلی کے پر

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کی طرف سے کنونشن سینٹر کے کمیٹی روم میں ناول ’تتلی کے پر‘ کے رسم اجرا کی تقریب عمل میں آئی جس کا اردو ترجمہ مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کے استاد ڈاکٹر محمد قطب الدین نے کیا ہے۔ اس تقریب کی صدارت جے این یو وائس چانسلر پروفیسر جگدیش کمار نے کی۔ جبکہ مصری سفیر حاتم تاج الدین مہمان خصوصی اور جے این یو ریکٹر پروفیسر چنتامانی مہاپاترا نے مہمان اعزازی کے طور پر شرکت کی۔ مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کے صدر پروفیسر رضوان الرحمٰن نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ ناول کے بارے میں تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کے سابق صدر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے کہا کہ ’تتلی کے پر‘ ناول مشہور عربی انقلابی ناول ’اجنحة الفراشة‘ کا اردو ترجمہ ہے جسے مصر کے مشہور ناول نگار، صحافی، عرب یونین رائٹر کے سابق صدر اور ماہر نجیب محفوظ محمد سلماوی نے لکھا ہے۔ یہ ناول مصر کے 25 جنوری انقلاب سے پہلے لکھا ہے اور اس ناول نے انقلاب کی پیشین گوئی کرتے ہوئے کچھ ایسے کیریکٹر اور پلاٹ تیار کیا جو کہ تقریباً بعینہ وقوع پذیر ہوا۔ تاریخ اور انقلابی ناول کا انگلش اور فرانسیسی جیسی کئی عالمی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اردو ترجمہ ’تتلی کے پر‘ ایک سلیس اور شستہ ترجمہ ہے جس میں مترجم نے اصلی نص کی روح کو باقی رکھا ہے۔

مہمان خصوصی مصری سفیر حاتم تاج الدین نے کہا کہ مصر اور ہندوستان کے درمیان قدیم زمانہ سے علمی، ثقافتی، تجارتی اور سیاسی تعلقات مضبوط رہے ہیں۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے جے این یو وائس چانسلر پروفیسر جگدیش کمار نے کہا کہ تتلی جدوجہد اور محنت کی علامت ہے، اس سے ہمیں کوشش اور لگن کا سبق ملتا ہے۔ ناول کے مترجم مرکز کے استاد ڈاکٹر محمد قطب الدین نے ترجمہ کے محرکات اور درپیش مشاکل پر مختصر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے اخیر میں اسکول آف لینگویج کے سابق ڈین اور مرکز کے سابق صدر پروفیسر اسلم اصلاحی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 19 اپریل 2017

فارسی، عربی مخطوطات کے کیٹلاگ کا اجرا

نئی دھلی: بوسنیا کے ایک اعلیٰ وفد جن کا تعلق یونیورسٹی، لائبریری اور دیگر تعلیمی شعبہ جات سے تھا، رازم چوپیچ مسئول امور خارجی و سابق سفیر بوسنیا در عربستان اور ڈاکٹر مہدی خواجہ پیری، ڈائرکٹر مرکز نور میکروفلم کی قیادت میں شیخ الجامعہ پروفیسر طلعت احمد سے ملاقات کی۔ وفد میں موجود لوگوں نے مختلف امور بالخصوص یونیورسٹیز اور لائبریریز کے متعلق پروفیسر طلعت احمد سے تبادلۂ خیال کیا۔ پروفیسر طلعت احمد نے وفد سے تعلیمی سلسلے میں ہر طرح کی ہماری کی یقین دہانی کرائی۔ رازم چوپیچ نے گفتگو کے دوران کہا کہ بوسنیا کے مختلف کتب خانوں میں فارسی کے

تقریباً 7000 نسخے موجود ہیں۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں فارسی اور عربک کیٹلاگ کی کتابی اور سی ڈی کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ پروگرام کا آغاز یاسر عباس غازی نے تلاوت کلام پاک سے کیا جبکہ نظامت عمیمہ فاروقی نے کی۔

صدارت یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر جمال عابدی نے کی۔ آخر میں پروفیسر عراق رضا زیدی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے لیے یہ امر باعث افتخار ہے کہ بوسنیا لائبریری اور دیگر تعلیمی مراکز کے اعلیٰ سطحی وفد نے جامعہ کا دورہ کیا۔ اس موقعے پر ہم ان کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اپریل 2017

منزلیں دور کہاں

جودھپور: فن اور ادب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہمارے بدن اور ذہن میں بھٹکنے کی قوت کتنی ہے۔ وہاں پہنچنا نہیں چلنا اہم ہوتا ہے۔ شاعری علم نہیں علم کا عطر ہوتی ہے اور وہ اخلاق اقدار نہیں بلکہ جمالیاتی اقدار سے بنتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور نقاد شین کاف نظام نے بزرگ شاعر اے ڈی راہی کے شعری مجموعے 'منزلیں دور کہاں' کی رسم رونمائی کے موقعے پر صدارتی تقریر میں کیا۔ سروکار اور بزم اردو، جودھپور کے زیراہتمام منعقد اس جلسے میں نظام نے کہا کہ راہی صاحب کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ وہ چیزوں کو کتابوں سے نہیں دیکھتے انھوں نے زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور شاعری میں تجربے کیے۔ ان کی شاعری میں آہ اور واہ دونوں ملتے ہیں۔ مہمان شاعر اور افسانہ نگار حبیب کیفی نے کہا کہ راہی صاحب قومی یکجہتی کی علامت ہیں۔ ہندی کوی رما کانت شرما نے کہا کہ ان کی شاعری میں دل اور دماغ کا خوبصورت توازن ملتا ہے۔ رونمائی تقریب میں ہندی، اردو اور راجستھانی زبان کے ادیب، شعراء اور معزز افراد موجود تھے۔ شین میم حنیف نے شکریہ ادا کیا اور محمد افضل جودھپوری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پریس ریلیز ڈاکٹر نثار راہی، سکریٹری بزم اردو، جودھپور، 8 اپریل 2017

نقش معنی

پونا: رؤف صادق نے علمی و ادبی کام غیرعلمی ماحول میں رہ کر انجام دیے۔ انھوں نے جو بھی لکھا صدق دل سے تحریر کیا ہے۔ اس خیال کا اظہار ممتاز دانشور صحافی اور نقاد جناب شمیم طارق ممبئی نے معروف مصور، شاعر اور نثر نگار جناب رؤف صادق کی تازہ ترین کتاب 'نقش معنی' کا رسم اجرا انجام دینے کے بعد کیا۔ تقریب رسم اجرا 28 اپریل 2017 کو شعبۂ اردو عابدہ انعامدار آرٹس، سائنس اور کامرس کالج پونا کے زیراہتمام منعقد کی گئی تھی۔ جناب شمیم طارق نے کہا کہ رؤف صادق کی کتاب 'نقش معنی' کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔

مشہور فکشن رائٹر جناب نورالحسنین اورنگ آباد نے نقش معنی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جدیدیت جدید رجحان، تجرید اور علامت نگاری کو سمجھنے کے لیے رؤف صادق کے مضامین معاون ثابت ہوتے ہیں۔ نورالحسنین نے کہا کہ غزل اور مصوری اور کتھک، رقص اور ٹھمری دو گراں قدر مضامین ہیں۔ ان مضامین کا انداز تحریر منفرد ہے۔ انھوں نے کہا کہ رؤف صادق کا وطن بیڑ مہاراشٹرا ہے۔ وہ ایک عرصے سے ممبئی میں مقیم ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 مئی 2017

وفیات:

شاعرہ فرزانہ ناز کا انتقال

اسلام آباد: پاکستان قومی کتاب میلے کی اختتامی تقریب میں گر کر زخمی ہونے والی شاعرہ فرزانہ ناز اسلام آباد کے نجی اسپتال میں وفات پا گئیں۔ اطلاع کے مطابق فرزانہ ناز پاک چائنا فرینڈ شپ ہال میں کتاب میلے کی اختتامی تقریب میں موجود تھیں جہاں وہ اسٹیج سے 12 فٹ کی اونچائی سے نیچے گر گئیں، اس کے نتیجے میں ان کے سر اور ریڑھ کی ہڈی پر شدید چوٹیں آئیں جس کے بعد انھیں شفا انٹرنیشنل اسپتال منتقل کیا گیا جہاں وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ فرزانہ ناز کا گذشتہ سال ہی پہلا شعری مجموعہ 'ہجرت مجھ سے لپٹ گئی ہے' شائع ہوا تھا جسے کافی پسند بھی کیا گیا تھا۔ مرحومہ کے پسماندگان میں 6 سالہ بیٹی اور 4 سال کا بیٹا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اپریل 2017

پروفیسر افضال احمد

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معروف استاد پروفیسر افضال احمد کا 4 مئی 2017 کو حرکت قلب بند

ہونے سے علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ وہ 78 سال کے تھے۔ وہ یونانی میڈیسن فیکلٹی کے ڈین، اجمل خاں طبیہ کالج کے پرنسپل کے عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ شعبۂ حفظان صحت کے بانی سربراہ بھی رہے۔ اس کے علاوہ موصوف متعدد سماجی اور تعلیمی تنظیموں سے بھی وابستہ تھے اور سماجی تنظیم مقبول سوشل ہیلتھ اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کے بانی و ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی کو چھوڑا ہے۔ ان کے انتقال پر علیگ برادری نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ ان کی تدفین مسلم یونیورسٹی کے منٹو۔ ای قبرستان میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 مئی 2017

خراج عقیدت:

ڈاکٹر ذاکر حسین کو خراج عقیدت

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے عظیم محسن، مشہور ماہر تعلیم، سابق صدر جمہوریہ و سابق شیخ الجامعہ کی 48 ویں برسی پر انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی

خدمات کو یاد کیا۔ اس موقعے پر سلمان خورشید نے کہا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی تعلیمی معنویت ہر دور میں ہماری اور ملک کی رہنمائی کرے گی اور قوم کے تئیں ان کی یہ قربانی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین سیکولرزم اور جمہوریت کے عظیم ستون تھے۔ ان کے افکار کی معنویت ہمیشہ رہے گی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے محض جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ہی ایک نئی جہت نہیں دی، بلکہ ہندوستان میں بھی تعلیمی نظریات کو فروغ دینے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ سلمان خورشید نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کا تعلیم اور انسانیت کا نظریہ تھا جسے اس وقت بھی فروغ دینے کی ضرورت ہے، اس سے نہ صرف ملک کی فضا بدلے گی، بلکہ ہندوستان میں سب کے لیے تعلیم کی مہم کو مہمیز ملے گی۔ قبل ازیں ان کے مزار پر قرآن خوانی اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کی گئی اور سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے مزار پر گلہائے عقیدت پیش کیا گیا۔ اس تقریب کے اہم شرکا میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی نواسیاں انجم شیرازی اور نیلوفر کے علاوہ ناظم دینیات پروفیسر اقتدار احمد خان، شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر عبدالحلیم، ڈاکٹر محمد ارشد، اے جے کے ایم سی آر سی آر سی کے قائم مقام ڈائرکٹر ڈاکٹر جی آر سید شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مئی 2017

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

آئینہ جہاں: کلیاتِ قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)

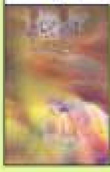

تحقیق وترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

آئینہ جہاں: کلیاتِ قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم: مضامین)

تحقیق وترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)

مصنف: احرار حسین
صفحات: 121
قیمت: -/32 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد چہارم)

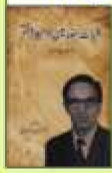

مرتب: ڈاکٹر سرورالہدیٰ
صفحات: 305
قیمت: 160 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد پنجم)

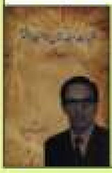

مرتب: ڈاکٹر سرورالہدیٰ
صفحات: 204
قیمت: 115 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد ششم)

مرتب: ڈاکٹر سرورالہدیٰ
صفحات: 216
قیمت: -/115 روپے

اسرار کشف صوفیہ (1068ھ مطابق 1658)

مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
وحواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت: -/335 روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

انتخابِ سخن (جلد اوّل) سلسلۂ شاہ حاتم

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: -/175 روپے

داستان گو آیا ہے

مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجرالدین
صفحات: 16
قیمت: 25 روپے

ہماری نظم

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجرالدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجرالدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

زمین

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجرالدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

اذان

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجرالدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

طوطا کہانی

مصنف: محسن خان
مصور: فجرالدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

انصاف

مصنف: محسن خان
مصور: فجرالدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

ایک دکھ بھری کہانی

مصنف: اقبال برکی
مصور: فجرالدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

مکھانے کی کھیر

مصنف: ذکیہ مشہدی
مصور: فجرالدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, June-2017, Vol.19, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/05/2017
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025